سہ ماہی

تاریخ

۴۱

ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

مجلسِ ادارت

پاکستان: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر روبینہ سہگل، جناب اشفاق سلیم مرزا،
پروفیسر ساجدہ وندل، پروفیسر پرویز وندل

بیرون پاکستان: پروفیسر ہربنس مکھیا (ہندوستان)، ڈاکٹر گیانندرا پانڈے (امریکہ)،
پروفیسر امتیاز احمد (ہندوستان)، ڈاکٹر حسن نواز گردیزی (کینیڈا)،
ڈاکٹر خضر انصاری (برطانیہ)، ڈاکٹر سارا انصاری (برطانیہ)،
ڈاکٹر کامران اصدر علی (امریکہ)، ڈاکٹر طاہرہ خان (امریکہ)

معاونین

انور شاہین، نوین جی۔حیدر، ڈاکٹر ہما غفار، غافر شہزاد

تھاپ پبلی کیشنز، لاہور

جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک ۱، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: ۰۴۲۔۳۶۶۶۵۹۹۷
ای۔میل: mubarakali21@yahoo.com
قیمت فی شمارہ غیر مجلد: ۳۲۰ روپے
قیمت فی شمارہ مجلد: ۴۰۰ روپے
سرِ ورق: نین تارا
اہتمام: سانجھ، لاہور۔۳۷۳۵۵۳۲۳۔۰۴۲
پرنٹرز: شرکت پریس، لاہور
تاریخِ اشاعت: اکتوبر ۲۰۱۰ء

THAAP PUBLICATIONS
43-G, Gulberg III, Lahore
Tel: 042-35880822, Fax: 042-35725739
E-mail: thappublications@gmail.com

فہرست

کچھ اس شمارے کے بارے میں	ادارہ	۵
غزل	ڈاکٹر فاطمہ حسن	۶
کانفرنس: تاریخ اور عورت: تعارفی کلمات	ڈاکٹر مبارک علی	۷
وہ کہاں ہے؟ عورتوں کی تاریخ میں نمائندگی	رخسانہ علی	۹
قرونِ وسطیٰ کی صنفی تاریخ کی تلاش	پروفیسر عرفان حبیب	۱۷
گلبدن بیگم۔ بحیثیت مؤرّخ	ڈاکٹر مبارک علی	۳۴
۱۸۵۷ء میں خواتین کا کردار	ڈاکٹر انصار زاہد خان	۳۹
اردو ادب کی تواریخ اور خواتین قلم کار	ڈاکٹر فاطمہ حسن	۴۳
اردو کی اولین نسوانی خودنوشت 'بیتی کہانی'	صائمہ حیات	۵۷
تاریخ میں عورت کا مقام۔ ایک سائنسی تناظر	ڈاکٹر طارق سہیل	۶۳
حقوقِ نسواں کی عالمی تحریک: ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد	۷۹
فاطمہ مرنیسی بطور ایک نسائی مؤرّخ	انور شاہین	۹۰
پاکستانی عورت، ایک بدلتے ہوئے سماج میں	حمزہ علوی	۱۲۲
سرمایہ دار عسکریت پسندی اور خواتین کا ردِعمل اور مزاحمت: ایک ہمعصر تاریخی تجزیہ	ڈاکٹر عذرا طلعت سعید	۱۴۶
فضائی میزبانی کی تاریخ	ثروت رضوی	۱۵۵
اینجیلا ڈے وِس کی آپ بیتی	ترجمہ: سیّد سبطِ حسن	۱۶۸

تاریخ سے مکالمہ

امرتا پریتم | انٹرویو: زمان خان | ۱۹۰

تحقیق کے نئے اُفق (تبصرۂ کتب)

عورت: زندگی کا زنداں، تصنیف: زاہدہ حنا | تبصرہ: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد | ۱۹۶

عزت کے نام پر، تصنیف: طاہرہ ایس۔ خان | تبصرہ: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد | ۲۰۱

تاریخ کے بنیادی ماخذ

پری خانہ، مصنف: واجد علی شاہ اختر، | مترجم: تحسین سروری | ۲۰۵

کچھ اس خصوصی شمارے کے بارے میں

'تاریخ' کے موجودہ شمارے کو 'تاریخ اور عورت' کے موضوع سے مختص کیا جارہا ہے۔ اس شمارے میں وہ مضامین یکجا کردیئے گئے ہیں جو ۶ مارچ ۲۰۱۰ء کو کراچی میں منعقد ہونے والی کانفرنس جو اسی عنوان سے منعقد کی گئی، میں پڑھے گئے۔ یہ کانفرنس سہ ماہی 'تاریخ' (لاہور) اور جناح میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج (کراچی) کے باہمی اشتراک سے منعقد کی گئی۔ اس سے پہلے بھی یہ دونوں ادارے برصغیر میں مارشل لاز کی تاریخ کے حوالے سے ایک کانفرنس منعقد کرچکے ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں موضوع کی مناسبت سے چند ایسے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جو مذکورہ کانفرنس میں نہیں پڑھے گئے، مگر جن کی تاریخی اہمیت ہے اور جو تاریخ اور خواتین کے موضوع پر پڑھنے والوں کے لیے کارآمد ہوسکتے ہیں۔

اس شمارے میں کتابوں پر تبصرے، انٹرویو اور 'تاریخ کے بنیادی ماخذ' کے شعبوں میں بھی ان چیزوں کو جگہ دی گئی ہے جو اس خصوصی شمارے کے موضوع سے مطابقت رکھتی ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات اور اس شمارے میں شامل دیگر تحریروں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنّفین کے اپنے خیالات ہیں اور ادارہ 'تاریخ' اور جناح میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج (کراچی) کا ان کے ساتھ اتفاق یا اختلاف ضروری نہیں۔

(ادارہ)

''تاریخ اور عورت'' کی خصوصی اشاعت کے لئے

☆ڈاکٹر فاطمہ حسن

غزل

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو مری دانش مرے افکار میں دیکھیں

ملبوس بدن دیکھے ہیں رنگین قبا میں
اب پیرہنِ ذات کو اظہار میں دیکھیں

سو رنگ مضامین ہیں جب لکھنے پہ آؤں
گلدستۂ معنی مرے اشعار میں دیکھیں

پوری نہ ادھوری ہوں نہ کمتر نہ برتر
انسان ہوں انسان کے معیار میں دیکھیں

رکھے ہیں قدم میں نے بھی تاروں کی زمیں پر
پیچھے ہوں کہاں آپ سے رفتار میں دیکھیں

منسوب ہیں انسان سے جتنے بھی فضائل
اپنے ہی نہیں میرے بھی اطوار میں دیکھیں

کب چاہا کہ سامانِ تجارت ہمیں سمجھیں
لائے تھے ہمیں آپ ہی بازار میں دیکھیں

اس قادرِ مطلق نے بنایا ہے ہمیں بھی
تعمیر کی خوبی اُسی معمار میں دیکھیں

کانفرنس: تاریخ اور عورت: تعارفی کلمات

ڈاکٹر مبارک علی

خواتین وحضرات،

یہ ۱۹۹۹ء کی بات ہے کہ ہم نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر مجلّہ 'تاریخ' کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کے بارے میں لوگوں میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کیا جائے اور 'تاریخ' کا مضمون جس تیزی سے بدل رہا ہے اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم اب تک 'تاریخ' کے ۳۹ شمارے شائع کر چکے ہیں۔

شائع ہونے والے مضامین کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ خاص طور سے ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر جو تحقیق ہو رہی ہے، اس کو سامنے لایا جائے۔ ان مضامین اور مقالات میں اوریجنل تحقیقی مضامین بھی ہیں اور ترجمے کیے ہوئے بھی۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے 'تاریخ کانفرنس' کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ ان کے ذریعے تاریخ کے بارے میں مزید دلچسپی پیدا کی جائے۔ اب تک ہم نے جن موضوعات پر کانفرنسیں کی ہیں، ان میں 'تاریخِ پنجاب'، 'تاریخِ لاہور'، 'تاریخ سکھ اور پنجاب'، 'سندھ کی تاریخ'، 'کولونیل ازم'، 'نیشنل ازم'، 'تاریخ نویسی'، 'تاریخِ اکبر'، '۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی' اور 'پاکستان میں مارشل لاء کی تاریخ' شامل ہیں۔ ان میں سے سندھ کی تاریخ پر، حیدرآباد میں کانفرنس کا انعقاد کیا۔ کولونیل ازم پر لاہور اور کراچی میں کانفرنسیں کیں۔ تاریخ نویسی پر، لاہور، کراچی اور گجرات میں کانفرنسیں ہوئیں۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء پر کانفرنسیں لاہور، کراچی اور گجرات میں منعقد ہوئیں۔ 'پاکستان میں مارشل لاء کی تاریخ' پر کانفرنسیں لاہور اور کراچی دونوں جگہوں پر کی گئیں۔

---

* ۶ مارچ ۲۰۱۰ء کو کراچی میں منعقدہ کانفرنس بعنوان 'تاریخ اور عورت' کا خطبۂ استقبالیہ

'عورت اور تاریخ' گیارہویں کانفرنس ہے، جس کا انعقاد کراچی میں ہو رہا ہے، اگر ممکن ہوا تو ہم لاہور میں بھی اسے کریں گے۔ 'عورت اور تاریخ' کا موضوع ہم نے اس لیے منتخب کیا کہ ہماری تاریخ نویسی میں عورتیں اب تک پوری طرح سے ابھر کر نہیں آئی ہیں۔ موجودہ دور میں تاریخ کے دو اہم پہلو ابھر کر آئے ہیں، ان میں سے ایک ماحولیات کی تاریخ ہے اور دوسری عورتوں کی تاریخ ہے۔ تاریخ نویسی پر مردانہ تسلط کی وجہ سے عورتوں کے کردار اور تاریخ میں ان کی شمولیت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ موجودہ زمانے میں جمہوری روایات و اقدار نے جہاں سماج کے دوسرے عناصر کو اہمیت دی، وہیں عورتوں کے بارے میں نظریات بدلنا شروع ہوئے۔ اب تک عورتوں کو تاریخ کے حاشیہ پر لکھا جاتا تھا، مگر نئی تحقیق میں آثارِ قدیمہ اور دستاویزات کی مدد سے اب عورتوں کی جو تاریخ تشکیل دی گئی ہے اس میں ان کا حصہ کسی بھی طرح مردوں سے کم نہیں ہے۔

مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ گورڈن چائلڈ کے مطابق دنیا کی تہذیب میں زراعت کے آغاز اور ترقی میں عورتوں کا حصہ ہے۔ اسی طرح کپڑا بننے، برتن بنانے، مویشیوں کی دیکھ بھال اور کھانے پکانے کے فن میں عورت کا اہم کردار رہا ہے۔

موجودہ تاریخ نویسی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس نے طاقت کے تصور کو بدل دیا ہے۔ پہلے تاریخ سیاسی طاقت اور اقتدار کے ماتحت تھی، مگر اب اس کا مرکز سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں ہیں۔ جب ان کا ذکر ہو تو اس میں عورتوں کا ذکر سب سے زیادہ آتا ہے۔

اس لیے ہماری کوشش ہے کہ عورت کو جو تاریخ سے غائب کر کے اسے خاموش کر دیا گیا تھا، اب اسے تاریخ میں واپس لایا جائے اور اس کے کردار کو اجاگر کیا جائے، تاکہ موجودہ دور میں عورتیں اس تاریخی عمل کی روشنی میں اپنی جدوجہد کر سکیں۔

'مارشل لاز کی تاریخ' پر ہونے والی کانفرنس کی طرح موجودہ کانفرنس بھی ادارۂ 'تاریخ' اور جناح میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج (کراچی) کی مشترکہ کاوش ہے۔ چنانچہ اس موقع پر میں ڈاکٹر طارق سہیل کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو اپنے ادارے میں معمول کی پیشہ ورانہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ تاریخ اور دیگر سماجی علوم کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سب مقالہ نگاروں اور آپ سب خواتین و حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی موجودگی ہی اس کانفرنس کی کامیابی کا سبب قرار پائے گی۔

وہ کہاں ہے؟ عورتوں کی تاریخ میں نمائندگی

رخسانہ علی

ترجمہ: ڈاکٹر ہما غفار

چند مہینے پہلے میڈیا نے ایک نوجوان عورت کی خبر نشر کی جسے گاؤں کے مرد کھلے عام کوڑے مار رہے تھے۔ یہ پرنٹ میڈیا اور ٹی۔وی کے نیوز چینل پر جاری صرف ایک خبر نہ تھی اس واقعے کی وڈیو کو تواتر سے میڈیا پر دکھایا جاتا رہا اور پوری دنیا نے نہ سہی پوری قوم اسے نے ضرور دیکھا۔ اگرچہ ہم ایسے واقعات کے بارے میں سن چکے ہیں اور سنتے بھی رہتے ہیں لیکن اپنے سامنے ایسا ہوتے ہوئے دیکھنا انتہائی تکلیف دہ عمل تھا جو ذہن سے محو ہونا مشکل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی جب کہ میں اس وڈیو کا حوالہ دے رہی ہوں تو بہت سے ذہنوں میں اس واقعے کی وڈیو کلپ دوبارہ چلنا شروع ہوگئی ہوگی۔ وہ ایک بہت خوفناک اور ناگوار تجربہ تھا۔ ہم میں سے بہت سوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ اس دفعہ انصاف ضرور ہوگا کیونکہ اس جرم کا جیتا جاگتا ثبوت موجود ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن کیا ایسا ہوا؟ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک دو دن بعد ہی اس نوجوان عورت اور اس کے خاندان والوں کی طرف سے اس واقعے کی تردید آ گئی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور وہ وڈیو جھوٹی تھی۔ جس وقت یہ بیان نشر کیا جارہا تھا اسی کے ساتھ واقعے کی وڈیو کلپ بھی چلائی جارہی تھی۔ یہ کیا تھا؟ جرم کے ایک ناقابلِ تردید ثبوت کو رد کیا جارہا تھا اور اسے تاریخ سے مٹایا جارہا تھا۔ اس نوجوان عورت اور اس جیسی کئی عورتوں کا، لکھی جاچکی اور لکھی جانے والی تاریخ میں اندراج نہ ہوسکے گا۔ ان کا اور دیگر عورتوں کا وجود آنے والی نسلوں کے لیے موجود نہ ہوگا۔ یوں یہ بہیمانہ جرم جاری ہے اور جاری رہے گا۔ یقیناً یہاں مختاراں مائی اور اس جیسی چند جرأت مند عورتیں موجود ہیں

جو چاہتی ہیں کہ انہیں سنا جائے، ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو محفوظ کیا جائے اور اس کی دستاویزی شہادت مرتب کی جائے۔ وہ خطرات لینے پر تیار ہیں تاکہ ان کی طرح تکالیف سہنے والی عورتوں کی نہ صرف مدد کرسکیں بلکہ مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے میں ان کی ہمت بندھا سکیں۔ اسی طرح ہی ہمارے معاشرے اور نظام کے ناخوشگوار اور ناپسندیدہ پہلوؤں کا تاریخ میں اندراج ہوسکے گا اور یوں ان سے نبٹا جاسکے گا۔ لیکن ایسی انفرادی شخصیات بہت کم اور اِکّا دُکّا ہی ہیں۔ عام طور سے مختاراں مائی کے ساتھ پیش آنے والے جرم کی طرح کے جرائم کا شکار عورتیں یا وڈیو کلپ میں دکھائی گئی عورت کی طرح 'انصاف' کی منتظر عورتیں ان نتائج کے خوف سے آگے نہیں بڑھتیں جو نہ صرف انہیں بلکہ ان کے خاندان والوں کو بھی برداشت کرنا پڑیں گے۔ یوں وہ تاریخ میں گم ہوجاتی ہیں۔ کیوں؟

اس کیوں کا جواب نول السّداوی نے بیروت کی ایک کانفرنس میں پڑھے گئے مقالے میں دیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ وہ لکھتی ہے 'تاریخ کبھی بھی ایک غیر جانبدار سائنس، ایک معروضی سائنس جو مکمل سچائی کو ظاہر کرسکے نہ تھی اور نہ ہوسکتی ہے۔ اکثریت کی زندگیوں اور جدوجہد سے متعلق بہت سے حقیقی شواہد، معاشرے کی مخصوص قوتوں کے مقاصد پورا کرنے کے لیے برسوں سے دفن ہوچکے ہیں، مٹائے جاچکے ہیں، مسخ کردیئے گئے ہیں یا ان کی غلط تعبیر کی گئی ہے۔' یہ کوئی انوکھی اور مبہم بات نہیں ہے کیونکہ جب مؤرّخ تاریخ لکھتا ہے تو وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اور مخصوص مقاصد اور مفادات کو پورا کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ لہٰذا، عمومی طور سے تاریخ معاشرے کی نمایاں قوتوں اور طبقات کے نقطۂ نظر اور مفادات کا اظہار کرتی نظر آتی ہے، اس میں عہد بہ عہد تبدیل ہونے کا میلان پایا جاتا ہے اور جب بھی کوئی نئی سیاسی قوت منظرنامے پر آتی ہے تاریخ اسی حوالے سے دوبارہ لکھی جاتی ہے باوجود یہ کہ ایک چیز ہمیشہ جامد رہتی ہے اور وہ ہے تاریخ کا سیاسی یا سفارتی یا عسکری ہونا، جس میں صرف مرد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں عورتوں کے لیے بہت کم جگہ پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب 'تاریخ اور عورت' میں واضح طور پر کہتے ہیں کہ بہت زمانے سے یہ تسلیم کیا جاچکا ہے کہ یہ صرف مرد ہی ہیں جو تاریخ تشکیل دیتے ہیں اور اگر ماضی میں کوئی عظیم اور اعلیٰ مرتبت مرد نہیں تو کوئی تاریخ بھی نہیں ہوگی۔ تاریخ نگاری میں حال ہی میں نئے رجحانات قائم ہوئے ہیں اور نئے تناظر میں تاریخ نگاری کو اختیار کیا گیا ہے، اور نسبتاً اب

بھی بہت کم کام کسی اور قسم کی تاریخ پر ہوا ہے۔

جیسا کہ عورتوں کی تاریخ کی پیشرو گرڈا لیرز (Gerda Lerres) کہتی ہے: 'عورتوں کی تاریخ نگاری سے متعلق جو قابلِ توجہ حقیقت ہے وہ ہے موٴرخین کی اس موضوع کی جانب عمومی عدم توجہی۔ لیکن جب تک موٴرخین روایتی نقطۂ نظر رکھیں گے جس میں کہ طاقت کی ترسیل اور عمل پذیری ہی ان کی دلچسپ کے لیے کافی ہوگی اس وقت تک عورتیں ناگزیر حیثیت سے عدم توجہ کا شکار رہیں گی۔ یہ غالباً انسانوں کا سب سے بڑا گروہ ہے جو ایک زمانے سے طاقت کے ڈھانچے سے باہر رہا ہے اور یوں تاریخ سے بھی۔'

تاریخ میں عورتوں کو نظرانداز کیے جانے سے، اس حقیقت کو جاننے کے بعد اچنبھہ نہیں ہوتا کہ ابھی تک اسکالرز، زیادہ تر مردوں نے دنیا کا مطالعہ مردوں کے نقطۂ نظر سے کیا ہے اور عورتوں کو اکثر اسی حوالے یعنی مردوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت بحیثیت انسان ظہور پذیر نہیں ہوئی بلکہ اسے جو مقام ملا وہ بحیثیت ایک شے، علامت، کسی اور سے تعلق اور دوسروں کے لیے مسائل کے حل ہونے کی حیثیت سے ملا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں یکے بعد دیگرے عورتوں کی حیثیت کے حوالے سے کئی مثالیں دیتے ہیں۔ یہاں میں اضافہ کرنا چاہوں گی کہ عورتیں اب بھی مردوں کی ملکیت کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ہماری بات کے سیاق میں اس سے مراد ہے کہ وہ ایک ملکیت کے طور پر اس وقت استعمال ہوتی ہیں، جب مرد کو کسی سے معاملہ کرنے یا سودا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ وٹہ سٹہ کی رسم، بہنوں اور بیٹیوں کا قرآن شریف کے ساتھ شادی کے ذریعے جائیداد اور دولت پر اپنا قبضہ رکھنا، خود یا خاندان کے کسی مرد کے کیے گئے قتل کی تلافی کے لیے اس کے عوض بہن یا بیٹی کو مقتول کے کسی رشتے دار کو شادی کے رشتے میں دینا، اس سے قطع نظر کہ عمروں میں کیا موافقت ہے اور لڑکی کی اس ضمن میں کیا مرضی ہے، گھر کی کوئی عورت اگر خدا کی جانب سے دیئے گئے حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنی پسند سے شادی کرے تو اپنے غصے کو کاروکاری کے ذریعے ٹھنڈا کرنا، اپنے شہوانی جذبات کو طوائفوں کے پاس جا کر پورا کرنا اور اپنی تسکین کے فوری بعد ان عورتوں کو بھول جانا یا رد کر دینا۔ کیونکہ، جیسا کہ فرانسیسی ادیب سیمون دی بووا اپنی کتاب دوسری جنس (Le Deuxieme Sex) میں زور دے کر کہتی ہے کہ عورتوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے، وہ ہمیشہ سے 'The Other'

ہیں اور مرکزی موضوع بحث نہیں ۔ یہ اور دیگر ظالمانہ رویے صرف دنیا کے اس حصے سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ مغرب اور ترقی یافتہ کہلائی جانے والی اقوام میں بھی یہی رویہ پایا جاتا ہے اگرچہ کسی اور بھیس میں۔ ہم سب مشرقِ بعید میں بچوں کی جسم فروشی کی وسیع مارکیٹ کے بارے میں جانتے ہیں جو کہ مغربی خریداروں کی بنا پر ہی پھل پھول رہی ہے۔

مذہب کے ضمن میں بھی معاملہ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مذاہب میں عورتوں کو جہاں دیوی، کنواری ماں، قابلِ تقدیس، رحم دلی اور محبت کی علامت کے درجات دیئے گئے ہیں وہیں اس کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اسے کسبی، جادوگرنی، لبھانے وورغلانے والی، دھوکہ باز، آزار پہنچانے والی اور ذہنی افراط کی علامت قرار دیتے ہوئے ذلیل ورسوا کیا گیا ہے۔ لیکن ہمیشہ عورت کی شخصیت کے مؤخر الذکر پہلو کو اوّل الذکر پہلو کے مقابلے میں تقویت دی جاتی ہے۔ کوئی بھی دنیا کے اہم مذاہب کی روایات میں سے ایسی مثالیں ڈھونڈ سکتا ہے جس میں عورتوں کو دوسرے درجے کے شہری کے طور پر برتا گیا ہے مثلاً یہودیوں کی ابتدائی روایات میں عورت کو شیطان سمجھا جاتا ہے اور اس آدمی کو قابلِ رحم جس کی زیادہ بیٹیاں ہوں۔

اس منظرنامے میں یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں کہ عورت تاریخ میں مقام نہیں رکھتی۔ اگرچہ کوئی اس کا یہ برجستہ جواب دے سکتا ہے کہ تاریخ میں عورتیں موجود ہیں اور اس ضمن میں قلوپطرہ، کیتھرین اعظم، رضیہ سلطان، جھانسی کی رانی، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کی شہزادی پھولن دیوی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یقیناً ایسی خواتین کے بارے میں تاریخ لکھی گئی ہے اور اس تاریخ نویسی کو لرنر (Lerner) ممتاز خواتین کی تاریخ کہتی ہے۔ ممتاز خواتین کی تاریخ استثنائی تاریخ ہے یعنی معمول سے ہٹ کر ان خواتین کی تاریخ جنہوں نے وہ کام انجام دیئے جو صرف مردوں کے دائرۂ کار سمجھے جاتے تھے، یعنی مردوں کے ساتھ ربط ضبط کو لین دین رکھنا اور ان کی رہنمائی کرنا، جو کہ یقیناً بحیثیت عورت ان کے لیے غیر فطری تھا۔ غالباً ان خواتین کو تاریخ میں اسی وجہ سے محفوظ کیا گیا کہ انہوں نے وہ کچھ کیا جو مرد کرتے ہیں۔ لیکن ممتاز خواتین کی یہ تاریخ ہمیں خواتین کی ان سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتاتی جن سے زیادہ تر خواتین متعلق تھیں، اور نہ ہی ہمیں خواتین کی سرگرمیوں کی معاشرے میں کلی طور پر وقعت واہمیت کے بارے میں آگاہی دیتی ہے۔ یہ عورتوں کی اکثریت کے تجربات اور تاریخ کو بیان نہیں کرتی۔ جبکہ مختلف طبقات کی عورتوں کے

مختلف تاریخی تجربات ہوتے ہیں جنہیں تاریخ میں توجہ دینی چاہیے۔

پھر یہ کہ ایسی خواتین بھی ہیں جو کہ متذکرہ بالا خواتین کی طرح طاقتور نہیں تھیں لیکن پھر بھی وہ تاریخ میں نظر آتی ہیں مثلاً ممتاز محل، گلبدن بیگم۔ بادشاہ ہمایوں کی بہن، زیب النساء، بادشاہ اورنگزیب کی بیٹی، اگرچہ گلبدن بیگم ایک لکھنے والی اور غالباً اوّلین مؤرّخین میں تھی۔ اس نے اپنے مرد رشتے داروں کی زندگی اور عہد سے متعلق اپنی یادداشتوں کو مرتب کیا۔ زیب النساء بیگم اپنی انفرادی حیثیت میں اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھی۔ باوجود یہ کہ یہ سب بشمول ممتاز محل، شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن کیا اکثریتی حلقے میں کوئی اور شاعرہ نہ تھی، مجمع میں کوئی تاریخ داں نہیں تھی؟ ان کی تاریخ کہاں ہے؟

معاشرے نے عورتوں کی حیثیت کے بارے میں متناقض معیارات تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی معاشرے میں مخصوص حیثیت کے حوالے سے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمیشہ سے جو منطق رہی ہے وہ ہے گروہ کی بقا کے لیے ماں کی حیثیت سے اس کا لازمی کردار، اور یہ کہ گھر معاشرے میں مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تب بھی، تاحال مائیں، خاتونِ خانہ اور گھر کی آرائش کرنے والی پوری تاریخ میں اس قابل ادراک انعام سے محروم رہی ہیں جسے ہمارا معاشرہ اعلیٰ درجہ دیتا ہے۔ اپنی ذاتی آمدنی۔ نہ ہی روایت، قانون اور نہ ہی ٹیکنالوجی میں ہونے والی تبدیلیاں' تعلیم اور سیاست نے اس مقدس روایت کو چھیڑا ہے۔

ابتداً جب عوتیں کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو وہ ایک طرح سے ان کے گھریلو اور روایتی کردار کی توسیع تھی۔ درس و تدریس یعنی بچوں کی دیکھ بھال، نرس کا کام یعنی بیماروں اور بوڑھوں کی دیکھ بھال وہی ذمّے داریاں جو وہ اپنے گھروں میں کرتی تھیں۔ یہ تمام پیشہ مختلف ایجنسیوں کی کوششوں کے باوجود ابھی تک صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں اور انہیں سماجی اور معاشی اعتبار سے کسی بھی 'مردوں سے متعلق' ملازمت یا پیشے کی برابری کا درجہ حاصل نہیں ہوسکا۔ لرنر (Lerner) تو یہاں تک کہتی ہے کہ جب بھی عورتیں بڑی تعداد میں کسی بھی پیشے سے وابستہ ہوئیں اس پیشے کو ہی کمتر حیثیت کا حامل سمجھا جانے لگا اور ساتھ ہی کم تنخواہ کا۔ اس ضمن میں وہ دو پیشوں درس و تدریس اور نرسنگ کی مثال دیتی ہے۔ اس ضمن میں ہم اپنے تناظر میں مذکورہ پیشوں کو شامل کریں گے۔ فیکٹری کے کام، گھریلو صنعت، گھریلو خدمت گار۔ لرنر ساتھ ہی یہ اضافہ کرتی

ہے کہ یہ تفریق صرف غیر ہنر مند محنت کشی تک محدود نہیں بلکہ یہ تفریق انٹیلکچول اور تخلیقی کام میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے تخلیقی میدان میں عورت جس شعبے میں نمایاں مقام رکھتی ہے وہ شاعری اور مختصر کہانی نویسی ہے۔ یہ وہ شعبے ہیں جنہیں پیسے اور قدر و منزلت دونوں اعتبار سے کمتر صلہ خدمت ملتا ہے۔

عورتیں معاشرے اور فرد کو کئی طریقوں سے تقویت پہنچاتی ہیں لیکن ان کا حقیقی کام اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مارگریٹ شنگر (Margaret Sanger) جسے صرف خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کے بانی کے طور پر دیکھا جاتا ہے، نہ کہ لرنر کے الفاظ میں 'ایک عورت جس نے صدیوں پرانے اس طریقۂ کار کو انقلابی دعوت مبارزت دی جس کے ذریعے اجسام اور زندگیاں انسانی بنائے گئے قوانین کے زیر اثر اور تحت تھیں۔ مزدور تحریک میں عورتوں کے کردار کو صرف اس طرح بیان کیا کہ 'وہ بھی وہاں تھیں' جبکہ انہوں نے صرف وہاں موجود ہونے سے زیادہ کردار ادا کیا۔ اسپتالوں میں صرف نرسیں کہلائی جانے والی، وہ ہی ہیں جو کہ تقریباً ۲۴ گھنٹے مریضوں کے ساتھ ہوتی ہیں، اور ان کا کام مریضوں کو دوائیں دینے اور ان کے اعضائے رئیسہ کو جانچنے سے کہیں زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر وہ مرتے ہوئے مریضوں یا غمزدہ والدین کے لیے قوت کا منارہ ہوتی ہیں۔ کیا ہم نے کبھی انہیں اپنی تاریخ کا حصہ سمجھا؟ حال ہی میں، میں نے سنا کہ انگلینڈ میں جنگِ عظیم دوئم میں بچ جانے والی خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کا مطالبہ کیا کہ ان کی جانب دھیان دیا جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اور جو کہ بڑی حد تک درست ہے کہ جنگ کے دوران وہی تھیں جنہوں نے اپنے ملک کو چلائے رکھا۔ اپنے روزمرہ کے کاموں کے ساتھ اضافی طور پر انہوں نے مردوں کی ذمّے داریوں کو بھی سنبھالا۔ جس وقت کہ مرد میدانِ جنگ میں مصروف تھے تو عورتوں نے ملک کے اندر کام کیا اور اسے مستحکم رکھا۔ انہوں نے کھیتی باڑی کی، فیکٹریوں میں مشینیں چلا کر پیداواری عمل کو جاری رکھا اور ساتھ ہی اپنے گھر اور خاندان کی دیکھ بھال بھی کی لیکن جونہی بتدریج مختلف محاذوں پر جنگ ختم ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو ہمیشہ کی طرح یہ میدانِ جنگ سے واپس آنے والے فوجی ہی تھے جن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا، عزت و تکریم کی گئی اور اعزازات سے نوازا گیا۔ جبکہ حقیقی سپاہی اور حقیقی جنگجو عورتیں تھیں جن کی گھر کے اندر اور گھر کے باہر سخت محنت نے اس بات کو ممکن بنایا کہ سپاہیوں کے میدانِ جنگ سے

واپسی پر ملک اور گھر موجود تھا۔ پھر کیوں وہ تاریخ کا حصہ نہیں ہیں؟ اور وہ کیوں اپنے آپ کو شناخت کیے جانے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

جیسا کہ حقوقِ نسواں کی حامی میری بیرڈ (Mary Beard) کہتی ہیں 'جو بات اہمیت کی حامل ہے وہ یہ نہیں ہے کہ عورتیں جبر کا شکار حلقے سے تعلق رکھتی ہیں، بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے پوری تاریخ میں معاشرے کے اندر مستقل اور متاثر کن حصہ ڈالا ہے۔ لیکن یہ وہ حصے داری ہے، جو کہ اس نظامِ اقدار پر پوری نہیں اترتی جو مؤرخین (عموماً مرد) کے لیے عام طور سے قابلِ قبول ہے اور جس کی بنیاد پر مؤرخین یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ کون تاریخ کے لیے اہمیت کا حامل ہے اور کون نہیں۔ 'تاریخ میں حصے داری' عورتوں کی حقیقی تاریخ مرتب کرنے میں ایک اہم مرحلہ ہے، لیکن اسے ان کی شرائط پر مردوں کی تشکیل کردہ دنیا میں ان کی اپنی کارروائیوں کے طور پر ہونا چاہیے۔ یہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کام کے حدود یہیں تک محدود نہیں کہ وہ عورتوں سے مردوں کے بیان کردہ معاشرے کے مطابق ربط رکھے اور انسے اسی درجہ بندی اور نظامِ اقدار میں جوڑے جو کہ مردوں کے نزدیک اہمیت ناپنے کا پیمانہ ہے۔

تو پھر کوئی کیسے فیصلہ کرسکتا ہے کہ آیا عورتوں کی حصے داری اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ تاریخ کا حصہ بنیں؟ کیا عورتیں اس وقت ہی قابلِ توجہ ہیں جب ان کی کامیابیاں ان معیارات پر بعینہٖ پوری اتریں جو کہ مردوں کے لیے بنائے گئے کامیابی کے معیارات ہیں؟ یقیناً نہیں۔ اسی وجہ سے انہیں اب تک تاریخ کی کتابوں سے باہر رکھا گیا ہے۔ کیا عورتیں قابلِ توجہ ہیں بحیثیت ابتدائی حقوقِ نسواں کی حامل؟ غالباً نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتیں مردوں سے مختلف ہیں اور معاشرہ و تاریخ میں ان کا کردار مردوں سے مختلف ہے۔ مختلف لیکن برابر کی اہمیت کا حامل۔ ظاہر ہے کہ پھر ان کی کامیابیوں کو بھی ایک مختلف پیمانے سے ناپا جائے۔ ایسے پیمانے کا بنانا اور اس کی وضاحت اس وقت تک مشکل ہے جب تک ہم اس خلاء کو نہ پُر کرسکیں جو تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات اور اس میں عورتوں کی حقیقی حصے داری کے بارے میں ہے۔ اس کام کی تکمیل ابھی تک باقی ہے۔

آج کل کثرت سے عورتوں کی تاریخ پر کام کیا جا رہا ہے، وہاں تاریخ کو اسی طور پر محفوظ کیا جا رہا ہے جیسا کہ عورتوں نے تجربہ کیا نہ کہ وہ جو مرد سمجھتے ہیں کہ عورتوں نے تجربہ کیا ہوگا یا ان کے

نزدیک عورتوں کو ایسا محسوس ہونا چاہیے تھا۔ جب معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں تو ایسے مؤرّخ تاریخ کی مختلف زمانی تقسیم کے بے محل ہونے کی حقیقت کو بھی جان پاتے ہیں۔ کیونکہ یہ زیادہ تر سیاسی اور عسکری تاریخیں تھیں اور بحیثیت عورت وہ اس میں سے کسی کا حصہ نہ تھی، ان کی زمانی تقسیم ان کے لیے (عورتیں) کوئی معنی نہیں رکھتی تاہم، سیاسی اور عسکری ادوار کے دوران جو فیصلے کیے گئے ان سے عورتیں انفرادی اور گروہی حیثیت سے متاثر ہوئیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو اپنی تاریخ کا حصہ بنائیں۔ ایک ملک یا ریاست کا عورتیں بحیثیت شہری حصہ ہوتی ہیں اور اکثر مردوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی تعداد میں اور اتنی بڑی تعداد کو تاریخ سے نکال دینا تاریخ کا استہزا ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کی تاریخ سیاسی کے مقابلے میں سماجی تاریخ لکھنے سے شروع کریں تو بہت سے ایسے معاملات جن کا یہاں ذکر آیا برت لیے جائیں گے۔ السد وای کے الفاظ میں 'تاریخ کے دوبارہ مطالعے کی کوشش اور تاریخی تحریکوں کو معاشی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی عناصر کے باہمی تعامل کے طور پر دیکھنا، جس میں گروہوں کے مختلف عناصر اور طبقات ایک دوسرے کے ساتھ جدوجہد میں مشغول ہیں اور وہ ہی تبدیلی کی حرکیاتی قوت ہیں۔' چیزوں کو ان انداز سے دیکھنے کو اختیار کرنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

اگرچہ اور بہت کچھ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میں اپنی گفتگو کو یہ کہتے ہوئے سمیٹوں گی کہ عورتوں نے ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں جو کردار ادا کیے وہ اب تبدیل ہو رہے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے طریقۂ کار اور نمایاں وصفِ مطالعہ اور نئی توجیہہ کے منتظر ہیں۔ کوئی امید رکھ سکتا ہے ایک وسیع فریم ورک اور باریک مرکزہ کی۔ پرانی درجہ بندی کو رد کرنا اور معلوم ماٰخذ سے نامعلوم معنی کی تلاش کی سعی و بلیغ کرنا۔ یہ ایک کوشش ہے جس میں پیشے کی اعلیٰ صلاحیتوں کو سہارا دینا چاہیے۔ صرف عورتوں کی صلاحیتوں کو نہیں۔

قرونِ وسطیٰ کی صنفی تاریخ کی تلاش *

پروفیسر عرفان حبیب۔ علی گڑھ

ترجمہ: انور شاہین

صنفی تاریخ کا تعلق محض عورتوں سے ہی نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر اس سماج سے بھی ہے جس میں وہ رہتی ہیں۔ اس کہانی کا آغاز ایسے ہی کیا جا سکتا ہے جیسے کہ دی بووا نے اپنی کتاب The Second Sex میں کیا تھا[1] یعنی کہ مختلف نسلوں یا انواع (species) کی حیاتیاتی تاریخ اور اس کے اندر صنفی تفریق کے وظائف کو بیان کر کے، تاہم عورتوں نے زمانہ ماقبل تاریخ میں نوع انسانی کی مادی ترقی میں جو کردار ادا کیا ہے اس پر تو قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ نامور ماہرِ آثاریات، گورڈن چائلڈ نے یہ تجویز کیا تھا کہ عورتیں ہی زراعت کی اصلی بانی تھیں اور انہوں نے جدید حجری دور کے انقلاب سے منسلک بیشتر ایجادات بھی کی تھیں[2] لیکن جہاں سے تحریر شدہ تاریخ کا آغاز ہوتا ہے جو کہ طبقاتی استحصال یا چھوٹے غالب طبقوں کے قدر زائد کے مالک بن جانے سے ظہور پذیر ہونے والے تمدن سے شروع ہونے والا عہد ہے، تو عورتیں معاشرتی پیمانے پر کم سے کمتر درجوں کی طرف دھکیل دی گئیں۔

اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ عورتیں جس قدر محنت کرتی تھیں، اس کا تناسب مردوں کی محنت سے کم ہوتا چلا گیا۔ کوئی بھی ان کاموں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ جن میں عورتیں گھر یا گھرانے میں مصروف رہتی تھیں۔ جیسے کھانا پکانا، بچوں کی پرورش اور ہر اعتبار سے مردوں کی اعانت کرنا۔

---

* انگریزی سے ترجمہ کردہ اس مضمون کے ساتھ چند تصاویر بھی تھیں جن کا مضمون میں حوالہ موجود ہے مگر بہت پرانی ہونے کی وجہ سے ان تصاویر کی فلمیں نہیں بنائی جا سکیں اور ان کا موجودہ ترجمے کے ساتھ شامل کرنا باوجود کوشش کے ممکن نہ ہو سکا، جس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

دہقان کی بیوی کا کام یہ تھا کہ وہ روٹی اور دہی کھیتوں میں کام کرنے والے شوہر کے پاس لے کر جائے یہ عہدِ مغلیہ کے ہندوستان میں بھی اتنا ہی مروج تھا جتنا کہ آج ہے۔[۳] اسی طرح اس کو دریا، تالاب یا کنوئیں سے پانی لانا پڑتا تھا جس کے لیے وہ اپنے سر پر پانی کے برتن کا توازن قائم رکھتی تھی اور اس کو ہاتھ کی چکی سے گھر میں غلہ بھی پیسنا پڑتا تھا۔[۴] لیکن یہ عورتوں کے کام کا محض ایک حصہ تھا۔ غریب عورتوں کو یا تو ایندھن کی لکڑی، پتے اور گوبر بھی جمع کرنا ہوتا تھا۔ انہیں اوپر کے طبقوں کے گھرانے میں کام کرنا پڑتا تھا یا کھیتوں میں مشقت کرنا ہوتی تھی، جن کے شواہد ہمیں دوسری صدی عیسوی سے ملنے لگے ہیں۔[۵]

روایتی صنفی تقسیم محنت قائم ہو جانے سے کئی اور قسم کے مشکل کام بھی عورتوں کو دے دیئے گئے۔ مثلاً اکثر تمدن ایسے تھے کہ جن میں کاتنے کا کام صرف عورتوں ہی کے ذمّے تھا۔ چرخہ استعمال میں آنے سے قبل دستی گولے کو چکر دینا انگلیوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا تھا۲۔ ۱۳۰۱ میں امیر خسرو نے 'سوئی اور دستی تسکلے' کو عورتوں کے 'نیزے اور تیر'[۶] قرار دیا۔ چرخے نے عورتوں کا کام کسی حد تک آسان کر دیا اور اس سے کاتنے کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا تذکرہ سب پہلے عصامی (۱۳۵۰) میں کرتے ہوئے کہتا ہے 'عورتیں تعقلی اعتبار سے ناقص ہونے کے باعث صرف اسی آلے سے کام کرنے کے لیے موزوں ہیں۔'[۷] ہندوستان میں چرخے کے اوّلین شواہد (۱۵۰۰۔عیسوی) میں عورتیں ہی دھندلے سے چرخے کے ساتھ نظر آتی ہیں (تصویر نمبر۱)[۷] کاتنا ہی نہیں، بلکہ کپاس کو کھیتوں سے لاکر اس کے بیج (بنولہ) کو روئی سے الگ کرنے کا کام بھی عورتوں ہی کا کام تھا۔ چھٹی صدی (تصویر نمبر۲) کی اجنتا کی فریسکو میں عورتیں اس کام کے ساتھ ساتھ کپاس کی تیاری کے دیگر کئی مراحل میں مشغول نظر آتی ہیں۔[۸] دراصل عورتوں کا کام کپڑا سازی کی صنعت میں جولاہے (عموماً مرد) کی کھڈی بنانے اور تانا بانا لگانے میں مدد کے ساتھ ساتھ کپڑا رنگنا، چھپائی کرنا اور کشیدہ کاری کرنا بھی تھا۔ چنانچہ ماقبل نوآبادیاتی دور کے ہندوستان میں یہاں کی عظیم کپڑا سازی کی صنعت کا محنت و مشقت کا تقریباً سارا بار عورتوں کے سر پر ہی تھا۔

عورتوں کی محنت گھریلو صنعت تک محدود نہ تھی۔ ہندوستان دنیا کے ان معدودے چند ممالک میں سے تھا جہاں تعمیرات کے لیے ضروری سخت مشقت کا بہت بڑا حصہ عورتوں کے ذمّے تھا۔

کے مطابق عورت کی فطرت میں ہے کہ وہ مرد کو لبھائے اور ان کو بے راہ رو کر دے۔ ان کی تخلیق کے وقت 'ناپاک، خواہشات، غصہ، بددیانتی اور بدمزاجی' ان کو عطا کر دی گئی تھی۔ (نہم، ۱۷)، ان کے سارے اچھے اوصاف محض ان کے شوہر کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں (نہم، ۲۲۔۲۳)، عورت کی باطنی طور پر ناقص فطرت اس کو مرد کا محکوم مطلق بنانے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ 'خاندان کے مردوں کو عورتوں کو لازماً دستِ نگر رکھنا چاہیے'، (نہم، ۲، مزید حوالہ دیا گیا ہے پنجم: ۱۴۷۔۱۴۸ میں)۔

قرآن کی چند آیات بھی عورتوں کو محکوم اور حقیر جنس کی حیثیت میں رکھنے کے لیے روایتی طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ بہت واضح طور پر محض مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن پاک (البقرہ: ۲۲۳) میں کہا گیا ہے۔ 'تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، ان میں تم جاؤ جاہے جس طرح تمہاری مرضی ہو۔' اور پھر (البقرہ: ۲۲۸) میں یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ 'مردان (عورتوں) سے درجے میں بلند ہیں۔' ان ہی مقدس تحریروں کے الفاظ کو بنیاد بناتے ہوئے صوفی عالم دین شیخ احمد سرہندی (متوفی: ۱۶۲۴) نے خداتعالیٰ کی طرف سے مردوں پر خصوصی عنایات کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے مردوں کو چار عورتوں سے شادی کرنے، حسبِ منشا تعداد میں لونڈیاں رکھنے اور طلاق کے ہتھکنڈے کو استعمال کرتے ہوئے بیویوں کو بدلنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ عورتوں کی ساری زینت باری تعالیٰ کی جانب سے محض مردوں کے لطف اندوز ہونے کی غرض سے عطا کی گئی ہے۔[۱۵] یہ الوہی شخص یہ بھی کہتا ہے کہ چونکہ عورتوں کی فطرت اتنی مکار ہے اس لیے ہر حرام کاری (adultery) میں عورت ہی کو بڑا مجرم گردانا چاہیے اور یہ کہ اس کی 'رضامندی' کے بغیر یہ عمل ناممکن ہوتا ہے۔[۱۶]

سیکولر دنیا نے بھی اسی طرح کے جذبے کا مظاہرہ کیا۔ شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵۔۲۷) سے منسوب اخلاقی مواعظ کا نسخہ مندرجہ ذیل ہدایات پر مبنی ہے 'بیٹیوں کی موت پر آزردہ نہ ہو۔ عورتوں کی نصیحت پر عمل نہ کرو۔ ان کی دلجوئی نہ کرو ان کے فریب اور چالبازی سے کبھی غافل نہ ہو۔'[۱۷]

اس بات کو انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر عورتیں کمزور اور جاہل گردانی گئیں تو یہ فطرت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ مردوں کا اپنا استبداد تھا۔ مثلاً عورتوں کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ علم و ادب میں کوئی مناسب اضافہ کر سکتی ہیں اگر ان کو ناخواندہ رکھ کر تعلیم کی

سولہویں صدی کی مغل عہد کی منی ایچر تصویریں عورتوں کو پتھر توڑتے، چونا چھانتے اور اپنے سر پر گارا اٹھا کر عمارت کے مقام تک لے جاتے ہوئے دکھاتی ہیں، جیسا کہ آج کل بھی وہ کرتی ہیں (تصویر نمبر ۳، ۴)[۹] ماقبل سامراجی عہد کے ہندوستان میں اس طرح عورتوں کو بے شمار کام سرانجام دینے کے ثبوت پیش کرنے کا کام بہت دور جا سکتا ہے، لیکن خوش قسمتی سے ہمارے لیے شیریں موسوی نے اپنی تحقیق 'مغل انڈیا میں کام اور صنف' میں بڑے پیمانے پر ایسے شواہد جمع کر دیئے ہیں۔[۱۰]

بدقسمتی سے ہمارے پاس عورتوں کے معاوضے کے اعتبار سے اعداد و شمار بہت کم ہیں یا تو ان کا کام واقعی بغیر معاوضے کے ہوتا تھا، جیسا کہ گھر پر ہونے والا کام گھر سے باہر ہونے والے کام کا بھی بہت ہی کم معاوضہ ملتا تھا۔ عورتوں کی محنت کی قدر عمومی طور پر ہی کم ہوتی ہے اس کا پتہ اس حقیقت سے چلتا ہے کہ علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء-۱۳۱۶ء) کے عہد میں قیمتوں کے ضابطوں کے مطابق 'کارکن مرد غلاموں' کی قیمت دس سے پندرہ ٹنکا تک اور کارکن عورت غلاموں کی قیمت صرف پانچ سے بارہ ٹنکا تک تھی۔[۱۱]

یوں ہم عورتوں پر جبر سے متعلق اہم نکات کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ ذاتوں کا نظام نچلی ذاتوں کی محنت کو سستا بنانے کے باعث حکمران طبقوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہا تھا، کیونکہ ان کے لیے اشیا و خدمات کی لاگت کم ہو جاتی تھی۔[۱۲] ایسا ہی کردار عورتوں کے کم معاوضے نے بھی ادا کیا۔ جس طرح اس عمل سے طبقاتی غلبے کے ڈھانچے کو برقرار رکھنے میں مدد ملتی تھی، اسی طرح سے صنفی جبر اور طبقاتی استحصال کے منطقے ایک دوسرے پر منطبق ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے تھے۔

جس طرح مذہب ــــ 'عوام الناس کی افیون' کی مدد سے طبقاتی تقسیم کو منصفانہ قرار دینے کی ضرورت ہوتی تھی اسی طرح سے عورتوں پر جبر کی بھی یہی صورت تھی۔ صرف اسی طرح ہر مرد، خواہ وہ سماجی نظام مراتب میں کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، 'اپنی' عورتوں کے مقابلے میں برتر محسوس کر سکتا تھا اور عورتوں کو بھی یوں اپنا مرتبہ خدا کی مرضی سے طے شدہ تسلیم کرایا جا سکتا تھا۔

عورتوں کی کمتری اس طرح ہندومت اور اسلام دونوں کے تحت مرتب سماج کے تصور میں جاگزیں تھی۔ مثال کے طور پر، عورتوں کے کردار پر ہمیشہ شک کیا جاتا تھا۔ منو (دوئم، ۱۴-۲۱۳)

ہر سہولت سے دور رکھا جائے۔ ۱۸۹۱ء میں جب ہندوستان کی شرح خواندگی انتہائی پست تھی، تو اس میں مزید کمی اس وجہ سے بھی ہو رہی تھی کہ مردم شماری کے نتائج کے مطابق ہر تیئس خواندہ 'مردوں' کے مقابلے میں ایک 'عورت' خواندہ تھی۔

جب عورتوں کی کمتری کا یہ تصور مردوں کی مہارت کا ثمر تھا تو جونہی کوئی عورت اپنے اوپر عائد کی گئی پابندیاں توڑنے کا موقع پالیتی تھی تو سچ سامنے آجاتا تھا، چنانچہ خواندہ اور تعلیم یافتہ عورتیں بھی موجود تھیں۔ دسویں گیارہویں صدی کے کھجراہو کے مجسمے کو یاد کریں جس میں ایک عورت لکھ رہی تھی۔ [۱۸] مفتاح الفضلا، سولہویں صدی میں مرتب شدہ فارسی لغات کی تصاویر (جو مالوہ میں ۶۹-۱۴۶۸ میں مرتب کی گئی)، میں سے ایک میں ایک لڑکی دوسرے بچوں کے ساتھ تختی پر لکھ رہی ہے اور ان کی نگرانی ایک اسکول کا استاد کر رہا ہے۔ [۱۹] شہنشاہ ہمایوں (۵۶-۱۵۳۰) کی بہن مغل شہزادی گلبدن بیگم اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہیں کہ ان کے خاوند خضر خواجہ خاں ناخواندہ تھے اس لیے وہ شہزادی کا لکھا ہوا کوئی خط نہیں پڑھ سکتے تھے۔ [۲۰] ایسی تعلیم یافتہ عورتیں گرچہ خال خال تھیں، لیکن ایک کمتر جنس کا تصور جو کہ ان کے لیے وضع کیا گیا تھا، وہ اس پر پوری نہیں اتر سکتی تھیں۔

یہی کچھ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہوا کہ جہاں کچھ عورتیں انفرادی طور پر شہرت حاصل کرسکیں۔ اس کی مثال کے طور پر دو اہم سیاسی خواتین اور مؤرخین کی ان کے بارے میں ستائش پیش کی جاسکتی ہے۔ جیامتی کشمیر میں نامعلوم خاندان کی ایک لڑکی تھی، جسے ایک رقاصہ نے گود لے لیا۔ وہ ایک شہزادے اُچّالا اور پھر 'دولت کی حرص میں' ایک گورنر آنندا کی داشتہ بنی۔ گورنر کی وفات کے بعد وہ پھر اچّالا کے پاس چلی گئی وہ 'ہر قسم کی شرم وحیا سے عاری' تھی۔ پھر وہ اس کی اہم ترین ملکہ بنی رہی جب تک کہ اس نے ۱۱۰۱ء تک بطور بادشاہ حکومت کی۔ [۲۱] ظاہر ہے کلہن کو، جو کہ پانچ صدیوں بعد (۵۰-۱۱۴۹ء) میں یہ تحریر لکھ رہا تھا، اس مجبور عورت سے کوئی ہمدردی نہ تھی جس کو مردوں کی دنیا میں دھکیل دیا گیا تھا اور اس کو اپنی راہ میں آئے مواقع سے فائدہ اٹھانا تھا، جس سے مصنف اس امر پر حیران ہوتا ہے کہ جیامتی کیونکر ایک مہربان حاکم کے فرائض کی بجا آوری میں اتنی کامیاب ہوسکی۔

'جیامتی نے بادشاہ کی بے پناہ محبت کے طفیل، آدھے تخت پر قبضہ کرنے

کی نایاب (مراعات) حاصل کرلی تھی اور اس نے ایک ملکہ کے وقار کو بالکل بھی پامال نہ کیا گرچہ وہ معمولی حسب ونسب والی تھی، پھر بھی اس نے اپنی مہربانی، دل کش اطوار، آزادروی، نیک لوگوں کے لیے احترام اور عقلمندی، ساتھ ہی ساتھ دیگر اعلیٰ صفات کے باعث خود کو ممتاز کرلیا تھا، وہ بے سہارا اور مصیبت زدگان کی بہت زیادہ دستگیری کرتی تھی۔' [۲۲]

تقریباً پانچ سو سال بعد نور جہاں آئی۔ گرچہ اپنے شوہر شہنشاہ جہانگیر کی وفات (۱۶۲۷ء) اور شاہجہاں کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی، جبکہ وہ سیاسی طور پر جلاوطن تھی اور اس کی تعریف کرنا کسی بھی درباری کے لیے سودمند نہیں ہوسکتا تھا، اس عہد کے درباری مؤرّخ معتمد خاں نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

'بادشاہ معظم (جہانگیر) نے بارہا کہا 'میں نے حکومت نور جہاں کو سونپ دی ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے ایک سیر شراب اور آدھا سیر گوشت کے۔ میں بیگم کے کردار کی عظمت اور اچھائی کے بارے میں کیا کیا لکھوں۔ ہر کوئی مجبور جو مشکل میں ہو اور اس کے پاس سوال لے کر جائے، وہ اس کا مسئلہ حل کردیتی تھیں اور اس کا مقصد پورا ہو جاتا تھا، جو کوئی اس کے پاس پناہ کی درخواست لے کر جاتا، ظلم وتعدی سے بچ جاتا تھا...... اس کے کردار کی نیکی (اس کے اندر چھپی) بدی پر غالب آجاتی تھی۔ دراصل اس میں کوئی بدی نہیں تھی۔' [۲۳]

اس طرح کے بیانات جو چند عورتوں کے بارے میں دیئے گئے یہ واضح کرتے ہیں کہ عورتوں کے بارے میں پھیلے تعصب کے جال کو پار کر کے حقیقت باہر آسکتی تھی اور اگر عورتوں کی باطنی صلاحیتوں کی حقیقت اس حقیقت سے مختلف تھی، جو بے شمار جکڑ بندیوں کے اندر بھی اپنا اظہار کر رہی تھی، تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیشہ مردوں کے عورتوں کے بارے میں رویّے (اور عورتوں کے اپنی ذات کے بارے میں شعور) کو بدلنے کے امکانات ماقبل جدید معاشروں میں موجود تھے۔ بلاشبہ مختلف ثقافتی روایات، خانہ بدوش اور قیام پذیر اور قدیم یا شہری معاشروں کے درمیان اس امکان میں شدت اور اختلاف پایا جاتا تھا۔

مثلاً اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عورتوں کی گوشہ نشینی سے بڑھتی ہوئی اپنی وابستگی کے باوجود، شریعت میں عورت کے لیے قانونی (legal) اور عدالتی ضابطوں (juridical) کے اعتبار سے تصورات دھرم شاستر کے مقابلے میں جدا تھے۔ شریعت عورت کے لیے ایک 'ولی' یا مرد سرپرست مقرر کرتی ہے، جس کے اختیار کی خاص وسعت ہوتی ہے، لیکن دراصل شریعت عورت کو ایک قانونی شخص تسلیم ہی نہیں کرتی، جس کو وراثت کا اپنا حق حاصل ہو، گوکہ یہ حق اس کے بھائی کے حصے سے نصف مقرر کیا گیا ہے یا جسے حق مہر شوہر سے لینے کا حق یا ایک معاہدے کے ذریعے شادی کی شرائط سے بہرہ مند ہونے کا حق حاصل ہو۔[۲۴]

اسلامی قوانین کے ان عناصر نے عورتوں کے جائیداد کی ملکیت کے حق کو آزادانہ تسلیم کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ ہمیں سترہویں صدی کے ہندوستان میں ایسی خواتین ملتی ہیں جو زمینی حقوق (زمینداری، ست راہی) کی مالک تھیں، جو جزواً وراثت اور جزواً حق مہر سے حاصل کیے گئے تھے۔[۲۵] ہندو عورتیں بھی زمیندار بن کر سامنے آئیں۔ ایک معاملے میں تو ایک عورت کو لگتا ہے اپنے بھائی سے جائیداد وراثتاً ملی تھی ایک دوسرے معاملے میں دو بیٹے جو زمینداری کا ایک حصہ بیچ رہے تھے، اپنی ماں کا نام استعمال کر رہے تھے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے یہ زمین اپنی ماں سے وراثتاً حاصل کی تھی۔ یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے کہ مسلم قانون کے مقامی رواج پر اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ گرچہ اس کا امکان کم ہی ہے، لیکن اسے مکمل طور پر خارج قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مغل حکومت سے مالی امداد کے حاصل کنندگان میں مسلم عورتوں کی ایک اہم تعداد بھی شامل تھی۔[۲۷] ۱۶۹۰ء میں اورنگزیب کے حکم سے انہیں ریونیو کی امداد وراثت میں بھی ملنے لگی تھی۔[۲۸]

ایک خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اکبر اور اس کے ہم عصروں میں سولہویں صدی کے نصف آخر میں عورتوں کے بارے میں ایک نیا رجحان ظاہر ہونے لگا تھا جو کہ بظاہر شریعت کی روایات سے ماخوذ نہ تھا اور درحقیقت جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے کہ اس سے بالکل متضاد تھا۔ ہمیں یہ رجحان مثال کے طور پر ستی کی تنقید میں ملتا ہے۔ اکبر ستی کے حوالے سے مسلمانوں کی تند تنقید سے دور جاتا ہے۔ مثلاً امیر خسرو کے اشعار یہ بتاتے ہیں کہ ستی ہندو عورت کی اپنے شوہر کے لیے محبت کا اظہار ہے، تاہم یہ تصور اکبر کے مطابق بنیادی اخلاقی طور پر ایک خطا ہے۔

'ہندوستان میں ایک قدیم رواج یہ ہے کہ اپنے شوہر کی موت کے بعد

بیوی، خواہ اس سے کتنا ہی برا سلوک کیوں نہ کیا جاتا رہا ہو، اپنے آپ کو آگ میں گرا لیتی ہے اور بہت بہادری سے اپنی قیمتی جان کی قربانی دے دیتی ہے، اور اس کو اپنے خاوند کی نجات کا ذریعہ مانتی ہے۔ آدمیوں کے برتاؤ کا یہ پہلو عجیب ہے کہ وہ اس طرح عورتوں کی مدد سے اپنی نجات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'[۳۰]

اس حقیقت کا کہ بیویوں سے ان کے شوہر بدسلوکی کرتے ہیں، تقابل کلھن کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ جس سے مطابق ستی اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے عورتیں اپنے آپ کو خاوند کی بدسلوکی سے چھڑا لیتی ہیں۔[۳۱]

ستی کی ممانعت کے لیے اکبر کا حکم ۱۵۸۳ء میں یا اس سے قبل آیا جب اس نے ایک راجپوت افسر کی موت کے بعد اس پر عملدرآمد کو یقینی بنایا۔[۳۲]

اس کے اثرات حیرت انگیز حد تک بہت دیرپا ثابت ہوئے، کیونکہ سترہویں صدی کے دوران مغل حکام بظاہر بہت خلوص سے اس رسم کو روکنے کی کوشش، شکار بننے والی عورتوں پر جبر کو روکنے اور اس رسم سے نفرت دلانے کے ذریعے کرتے رہے۔ اس امر کی شہادت ہم عصر یورپی شاہدین سے ملتی ہے جو عمومی طور پر مغل حکام کے لیے کسی قسم کی ہمدردی رکھنے کا مزاج نہیں رکھتے تھے۔[۳۳] درحقیقت ۱۶۹۰ء کی دہائی کے شروع میں اوونگٹن کا یہ خیال تھا کہ 'اب یہ رسم ہندوستانی عورتوں کے جلنے کی عنقا ہو گئی ہے سوائے اس کے کہ کوئی راجپوت راجہ کی بیویاں ہوں جنہیں گورنروں کو قیمتی تحائف اور بارسوخ ذرائع سے درخواست کے ذریعے اس کی اجازت ملی ہو۔'[۳۴] چنانچہ یہ بیان بھی مغلوں کی کارکردگی کے حوالے سے کچھ ستائش زیادہ ہی کرتا ہے پھر بھی ستی کی تعداد کم کرنے کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ کامیابی تو ہوئی ہی ہوگی۔

عورتوں سے متعلق اکبر کی تشویش وراثت کے معاملات تک جا پہنچی جہاں اس نے یہ محسوس کیا کہ مسلم قوانین کے اندر بھی جو ان کا حق ہے اس کو وہ حاصل نہیں کر پا رہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کمزور ہونے کے باعث عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں 'زیادہ حصہ' دینا چاہیے، جبکہ یہ حصہ تو منصفانہ بھی نہیں ہے کہ جب صرف ایک ہی بیٹی ہو، کیونکہ تب دوسرے مرد رشتہ دار وراثت میں حصہ لینے آ جاتے ہیں۔[۳۵] اسی طرح کی تشویش نے اس کو محض ایک ہی شادی کا حکم دینے پر تیار کیا۔ گرچہ

بدایونی یہاں تک کہتا ہے کہ یک زوجگی نافذ کرنے کے لیے حکم نامہ بھی جاری کردیا گیا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر نے اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار بہت شد و مد کے ساتھ کیا تھا۔ گو کہ شاہی خاندان کو اس حکم سے کمال ہوشیاری سے استثنا دے دیا گیا تھا۔[۳۶] بظاہر اس حکم پر کوئی عمل درآمد بعد ازاں نظر نہیں آتا۔ اکبر اس لیے بھی پریشان تھا کہ نوعمر لڑکیوں کی شادی نہ کردی جائے کیونکہ اس سے ان کی صحت کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس پریشانی کا اظہار اس کے اس حکم سے ہوا کہ بلوغت کی عمر (۱۲ سے ۱۴ سال تک طے شدہ) سے قبل لڑکیوں کی شادی کو واقعتاً منع کر دیا گیا تھا۔

اس حکم کا اطلاق ہندوؤں کی شادی پر بھی ہوتا تھا جس کا پتہ اس حقیقت سے چلتا ہے کہ اکبر نے ایک چھوٹی بچی کی شادی کیے جانے کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے خاص طور پر کہا کہ ایک ایسے قانون کے تحت جس میں عورت دوبارہ شادی نہیں کرسکتی، عورت کا اپنے خاوند سے عمر میں بہت کم ہونا انتہائی غیر منصفانہ ہے۔

اس بات کا پتہ چلانا کہ اکبر کے جذبات اور ممانعت کا کوئی دیرپا اثر ہوا، مشکل ہے، تاہم اس سے اخلاقی اعتبار سے اہم پیشرفت کی نمائندگی ضرور ہوتی ہے اور یہ ایک منفرد رجحان کے پیشرو بھی ہو سکتے تھے۔

مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی جو اکبر کے ارشادات اور احکامات کا تمسخر اڑاتا ہے، مسلم قانون کے تحت خاوند کے لیے طلاق دینے کے باسہولت طریقے پر عجیب تحفظات کا اظہار کرتا ہے اس کے کم عمر ہم عصر شیخ احمد سرہندی کے برخلاف جو طلاق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مردوں کے لیے بہترین نعمت قرار دیتا ہے تاکہ وہ بیویوں کو تبدیل کر سکیں، بدایونی یوں تبصرہ کرتا ہے:

> 'چونکہ طلاق اجازت دی گئی چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، طلاق کی جانب جانا ہی مردانگی کے عین خلاف ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ کیا شاندار رواج ہے کہ انہوں نے اس کو ترک کر دیا ہے اور وہ اس کو بدترین فعل ہی قرار دیتے ہیں چنانچہ اگر ان کو کوئی 'طلاق دینے والا' کہتا ہے تو وہ اپنی سادگی کے باعث اسی کو مارنے پر تل جاتے ہیں۔'[۳۸]

شادی کی شرائط کے حوالے سے بھی مسلم شادیوں میں کچھ ایسی معیاری شرائط مروّج ہو چکی

تھیں جن سے بیوی کو دوسری شادی، کنیزوں کے رکھنے یا علیحدگی کے خلاف تحفظ حاصل ہو جاتا تھا۔ ۹۶-۱۶۹۴ء کی ایک مغل تحریر میں ایک مثالی معاہدۂ ازدواج ملتا ہے جس میں مندرجہ ذیل شرائط دی گئی ہیں: (۱) اگر خاوند دوسری شادی کرے گا تو موجودہ بیوی آزاد ہوگی (کہ وہ نکاح کی تنسیخ کر دے)۔ (۲) خاوند کنیز نہیں رکھے گا، اگر وہ ایسا کرے تو بیوی یا تو اس کو آزاد کرسکتی ہے یا اس کو فروخت کرسکتی ہے اور اس رقم کو اپنے حق مہر کے طور پر پاس رکھ سکتی ہے۔ (۳) خاوند کسی قانونی وجہ کے بغیر بیوی کو زدوکوب نہیں کرسکتا، اگر وہ ایسا کرے تو یہ وجہ بیوی کے لیے تنسیخ نکاح کا مطالبہ کرنے کے لیے کافی ہوگی، اور (۴) بیوی اس صورت میں تنسیخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے اگر شوہر تین سال تک بیوی کو نان نفقہ مہیا کیے بغیر غائب رہے۔[۳۹]

معاہدہ ازدواج میں اسی طرح کی اور شرائط ہمارے سامنے آتی ہیں جب ۱۶۵۰ء میں سورت میں جمع کی گئی دستاویزات کا مجموعہ بنا۔ اس میں یہ چاروں شرائط واضح طور پر ملتی ہیں، چنانچہ اس عہد میں تمام نچلے اور متوسط طبقے میں دوسری شادی اور لونڈی رکھنے سے احتراز سے متعلق شرائط عملی طور پر مروّج ہو چکی تھیں۔ مہر کی رقم کی مقدار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہی طبقات اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ بیوی کی کم سے کم زندہ رہنے کی ضروریات پوری ہوسکیں جیسا کہ ایک تانبے کا ٹانکا روزانہ، یا سالانہ دوعدد ساڑھیاں کافی ہونا بھی ان کے مقام کا اظہار کرتا ہے۔

تاہم اس مرحلے پر اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صنفی تاریخ کو کھنگالتے وقت ہم ایک ایسے موضوع پر کام کرتے ہیں جس کے بارے میں ابھی تک بہت کم علم ہے جو علم ہے وہ اتنا منتشر ہے اور خود عورتیں بھی اس ضمن میں براہِ راست بہت کم اضافہ کر رہی ہیں۔ تاہم شاید اک یا دو موٹے موٹے نتاج اخذ کیے جاسکتے ہیں عورتوں پر جبر کا ضابطہ بالکل سختی سے نافذ نہیں تھا۔ کہیں کہیں ہمدردی، عدم برابری کے شعور، حتیٰ کہ ممکنہ اصلاح کی بھی کوششیں ہمیں اب نظر آتی ہیں۔ لیکن ہماری ثقافتی روایات میں ٹھوس بدلیلیوں کو جنم دینے کی اہلیت ہمیشہ محدود رہی ہے۔ اس لیے دوسرے حلقے، بنام جدید یورپ سے آنے والے نظریات کے نفوذ کی اہمیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ وہاں ایک انتہائی اہم تبدیلی رونما ہو چکی تھی کہ خود عورتیں اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے لگی تھیں، یہ ایک واضح امتیازی عنصر تھا۔[۴۱] کسی حد تک عورتوں کی آزادی ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کا جزولاینفک بھی تھا۔ ۱۷۹۰ء میں وراثت میں برابری کا قانون پاس ہوا، ۱۷۹۲ء میں طلاق کے حق

کے ساتھ بیوی کے لیے خاصے تحفظات کا قانون آیا ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۴ء میں دونوں اصناف کے بچوں کے لیے لازمی پرائمری تعلیم کے وعدے کیے گئے، تاہم ان کو انقلاب کے ردِعمل کے آنے والے سالوں میں کسی حد تک تبدیل کر دیا گیا۔ پھر بھی یہ سب کامیابیاں انسانیت کے لیے بہت ہی بنیادی اہمیت کی حامل تھیں۔ اسی سرچشمے سے بنگال کی نشاۃ ثانیہ میں عورتوں اور ان کے حقوق کے لیے تفکرات کی لہریں پھوٹیں اور انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے مہمیز لی ان سے جو جدوجہد شروع ہوئی وہ ہنوز جاری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیمون دی بووا، The Second Sex، انگریزی ترجمہ، لندن ۱۹۵۳ء،

۲۔ وی گورڈن چائلڈ، What Happend in History، ہارمنڈزورتھ، ۱۹۴۲ء، ص ص ۵۲-۵۳، 'صنف اور زراعت' سے متعلق حالیہ بحث جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کی ہے، اس کا خلاصہ دیکھنے کے لیے، دیکھیے پیٹر بوگو کی The Origin of Human Society، آکسفورڈ، ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۹۸-۲۰۱، بدقسمتی سے بوگو کی، گورڈن چائلڈ کے انکشافی نوعیت کے مفروضات کے بارے میں کوئی آگاہی نہیں رکھتا تھا۔

۳۔ بحوالہ شیخ فرید بھکری کے ہاں ایک کہانی، ذخیرۃ الخوانین (تکمیل ۱۶۵۰)، مدیر معین الحق، کراچی، ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۴ء، دوئم، ص ص ۶-۳۲۵

۴۔ عورتوں کے پانی بھر کر لانے کے بارے میں اکبر کا ایک دلآویز مشاہدہ ابوالفضل نے 'آئینِ اکبری' میں پیش کیا ہے۔ مدیر ایچ۔ بوچ مین، کتابیاتی اشاریہ، کلکتہ، ۱۸۶۷-۷۷ء، دوئم ص ۲۲۷۔ مزید دیکھیے: جان کروک، ۳ جلدیں، لندن، ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۵ء، دوئم، ص ۱۱۸، 'ہندوستانی عورتیں اپنے شوہروں کے کھانے کو سجاتی ہیں، لسی پانی لاتی ہیں اور اپنے ہاتھ سے چکی میں غلہ پیستی ہیں، اس وقت وہ گانا گاتی ہیں، باتیں کرتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں۔'

۵۔ ونسایانا مالنگا، کام سوترا، ۵،۵،۵ اور ۶، میں عورتوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس وقت دیکھی جا سکتی ہیں 'جب وہ بیگار (وِست کرم) کر رہی ہوتی ہیں، گودام میں داخل ہوتی ہیں،

سامان کو اندر لاتی ہیں یا باہر لے کر جاتی ہیں، جب [آجر کے] گھر کی مرمت [صفائی] کرتی ہیں، جب کھیتوں میں کام کرتی ہیں (کشتر کرم)، جب کپاس اور درختوں کی چھال لیتی ہیں اور [اس کے بدلے میں] سوت نہ لے کر آتی ہیں.....' (ترجمہ کے لیے ممنون ہوں علی گڑھ کے پروفیسر ایس۔ آر شرما کا)۔

۶۔ امیر خسرو، 'ہشت بہشت'، مدیر ایم۔ سلیمان اشرف، علی گڑھ، ۱۹۱۸ء/ ۱۳۳۶، ص ۲۸

۷۔ عصامی، فتوح السلاطین، مدیر اے۔ ایس۔ اوشا، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۴

۷۔ محمود شادی آبادی، 'مفتاح الفضلا'، برٹش لائبریری، ایم۔ ایس۔ او۔ آر، ۳۲۹۹f، ۹۴، زیادہ تر دستکاریوں کی اصطلاحات پر مبنی لغات، ۴۹۔۱۴۶۸ عیسوی میں تالیف کی گئی اور اسکو ماقبل مغلیہ دور کے مالوہ اسکول کے انداز میں مزین کیا گیا تھا۔

۸۔ بحوالہ: ڈی شلنگلاف، 'ہندوستان میں کپاس کے مینوفیکچررز'، جرنل آف اکنامک اینڈ سوشل ہسٹری آف دی اورینٹ، جلد ۱۷، ۱۹۷۴ء، ص ص ۹۰۔۸۹ اور عشرت عالم، 'اجنتا اور مغل تصویروں میں پیش کردہ ٹیکسٹائل کے اوزار'، انوردھارے، اور ایس۔ کے۔ باغچی، ٹیکنالوجی اِن اینشنٹ اینڈ میڈیویل انڈیا' دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۰ اور تصویر ۲۹

۹۔ وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم کے 'اکبر نامہ' کے مسودے میں دی گئی تصاویر کی اشاعت کو دیکھیں جوگتی سین، پینٹنگز فرام دی اکبر نامہ، کلکتہ، ۱۹۸۴ء، تصاویر ۳۳ اور ۶۱

۱۰۔ شیریں موسوی، 'ماقبل سامراج انڈیا میں کام اور صنف'، *Socio-economic Consequences of Sex-ratios in Historical Perspectives*, (1500-1900)، میلان ۱۹۹۴ء، ص ص ۱۱۶۔۱۰۵

۱۱۔ ضیا برنی، تاریخ فیروز شاہی، مدیر: سیّد احمد خاں، ڈبلیو نساؤ لیز، اور کبیر الدین، کتابیاتی اشاریہ، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۳۱۴

۱۲۔ اس دلیل کے لیے دیکھیے مضمون 'ہندوستانی تاریخ میں ذات'، عرفان حبیب، *Essay's in Indian History: Towards a Marxist Perception*، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ص ۷۹۔۱۶۱

۱۳۔ بحوالہ کارل مارکس کے معروف پیراگراف سے جو ان کے تعارف میں لکھا گیا۔

Contribution to the Critique of Hegel's Philosophy Right(1844)، 'مذہب تو محکوم مخلوق کی آہ ہے...... یہ غریبوں کی افیون ہے'، مارکس اور ایف۔اینگلز' *On Religion*'، انگریزی ترجمہ، ماسکو، ۱۹۵۷ء، ص ۴۲

۱۴۔ میں نے جی بوہلر کا ترجمہ' *The Laws of Manu*'، آکسفورڈ، ۱۸۸۶ء، استعمال کیا ہے۔ باب اور اشعار کا نمبر اس کے اندر سارے حوالہ جات کو تلاش کرنے کے لیے موزوں ہوتا ہے۔

۱۵۔ شیخ احمد سرہندی، مکتوباتِ امامِ ربانی، جلد اوّل، مکتوب نمبر ۱۹۲، (نول کشور ایڈیشن، تاریخ ندارد، لکھنؤ اوّل، ص ص ۹۱۔۱۹۰)

۱۶۔ اسی وجہ سے شیخ احمد کہتے ہیں کہ قرآن نے جرم کی مذمت کرتے ہوئے زانیہ کو پہلے اور زانی کو بعد میں رکھا ہے دیکھیے ایضاً، جلد سوئم، مکتوب نمبر ۴۱، (نول کشور ایڈیشن، ص ۷۰)، یہ شاندار دریافت انہوں نے اپنے ایک خط میں ایک پاک باز عورت کے نام بھیجی (جس کا نام اس خط میں درج نہیں کیا گیا)۔

۱۷۔ 'پند نامۂ جہانگیری' بطور خواجہ نعمت اللہ الحراوی کی کتاب کا ضمیمہ 'تاریخ خان جہانی'، دوئم، ڈھاکہ، ۱۹۶۲ء، ص ۷۰۳۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس طرح کے بیانات یا جذبات خود جہانگیر کی اپنی یادداشتوں میں نہیں پائے جاتے۔

۱۸۔ اب یہ انڈین میوزیم کلکتہ میں موجود ہے اور اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہتا ہے۔ دیکھیں مثال کے طور پر اے۔ایل بشام، '*The Wonder that was India*'، نیویارک، ۱۹۵۹ء، تصویر بالمقابل ص ۲۰۰

۱۹۔ محمد شادی آبادی، 'مفتاح الفضلا'، تکمیل ۶۹۔۱۴۶۸ء، برٹش لائبریری کے مسودات نمبر ۳۲۹۹، f۲۷۸b

۲۰۔ گلبدن، 'ہمایوں نامہ'، مدیر: اینیٹ ایس۔بیوریج، لندن، ۱۹۰۲ء، ص ۸۰، اسی جلد میں اے۔ایس۔بیوریج کا ترجمہ '*History of Humayun*' کا شامل ہے جس میں اس کے مطابق پیراگراف ص ۱۸۲ پر موجود ہے۔

۲۱۔ کلہن، 'راجہ ترنگینی'، ترجمہ: ایم۔اے۔اسٹین، لندن، ۱۹۰۰ء، اوّل، ص ۳۸۱

۲۲۔ ایضاً، دوئم، ص ۸

۲۳۔ معتمد خاں، 'جہانگیر نامہ' (اقبال نامۂ جہانگیری۔ جلد سوئم) نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۸ء، ص ۵۶، وہ مزید کہتا ہے کہ نور جہاں نے تقریباً پانچ سو یتیم اور مفلس لڑکیوں کی شادی کروائی اور ان کا جہیز اپنے پاس سے دیا۔

۲۴۔ اسلامی قانون اور رواج میں عورتوں کے حقوق کا ایک اچھا خلاصہ دیکھیے۔ ریوبن لیوی، '*The Social Structure of Islam*' کیمبرج، ۱۹۵۷ء، ص ص ۳۴۔۹۱

۲۵۔ عرفان حبیب، '*Agrarian System of Mughal India*' اشاعت دوئم، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۲، n

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۱، اور ص ص ۱۹۲۔۱۹۹، n

۲۷۔ ایضاً، ص ص ۳۔۳۵۲ اور ص ۳۵۳، n

۲۸۔ ایضاً، ص ص ۲۔۳۵۱۔ وراثت کا قانون شریعت کے مطابق نہیں تھا۔ بیوہ اس ساری گرانٹ کو اپنی پوری زندگی میں لے سکتی تھی، لیکن شادی شدہ بیٹیوں کو اس ضمن میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔

۲۹۔ امیر خسرو (وفات: ۱۳۲۵) کا مشہور شعر ہے۔ 'پوری دنیا میں کوئی بھی اس سے زیادہ مردانہ وار چاہنے والا نہ ہوگا جتنا کہ ایک ہندو عورت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو ایک بجھی ہوئی شمع کے اوپر جلا دینا تو ایسا کام ہے کہ کوئی اڑنے والا پتنگا بھی نہیں کر سکے گا۔' حتیٰ کہ مفسر عبدالقادر بدایونی نے اپنی 'نجات الرشید' (۱۵۹۱عیسوی)، مدیر: سیّد معین الحق، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۱۲، میں اسی انداز میں اسی شعر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ 'کس طرح عشق کی راہ پر کوئی ہندو عورت کے نقش قدم پر آئے گا کہ جو اپنے مردہ (محبوب) پر خود کو زندہ جلا دیتی ہے۔'

۳۰۔ 'شہنشاہ معظم کے ارشادات'، ابوالفضل، 'آئینِ اکبری' مدیر: ایچ بلوچمین، کلکتہ ۱۸۶۶۔۷۷ء، دوئم، ص ۲۴۳

۳۱۔ 'گرچہ انہیں غیر وفادار اور مارنے والے خاوند کے حوالے کیا گیا تھا پھر بھی وہ [عورتیں] کس آسانی سے آگ میں قدم رکھتی ہیں۔ کوئی بھی عورتوں کے بارے میں یقین سے کچھ

نہیں کہہ سکتا۔' (راجہ ترنگینی، ترجمہ ایم۔اے۔اسٹین، دوئم، ص ۳۱)

۳۲۔ اس حکم اور واقعے کے بارے میں دیکھیے: ابوالفضل، 'آئینِ اکبری' مدیر: آغا احمد علی، اور عبدالرحمٰن، کتابیاتی اشاریہ، ۸۷۔۱۸۷۳ء، سوئم، ص ص ۳۔۴۰۲، اس حکم کے بارے میں دیکھیے: ابوالفضل، 'آئینِ اکبری' مدیر: ایچ۔ بوچمین، اوّل، ص ۲۸۴، ابوالقادر بدایونی 'منتخبات التواریخ' مدیر علی احمد ادریس، کتابیاتی اشاریہ، کلکتہ، ۶۹۔۱۸۶۴ء، دوئم، ص ۳۷۶ (جہاں ایک واضح ترمیم ۱۵۹۱ء میں کی گئی جس سے رضا کارانہ طور پر ستی کرنے کی اجازت دے دی گئی) اکبر کے احکامات کے پس پردہ عیسائیوں کے اثرات ممکن ہیں۔ کیونکہ پادریوں نے اس سے قبل بذاتِ خود اکبر کی ستی کی رسومات میں موجودگی کے خلاف احتجاج کیا تھا (اے۔مون سیراٹ، '*Commentary on His Journey to the Court of Akbar*'، ترجمہ: جے۔ایس۔ہائے لینڈ اور ایس۔این بینرجی، کٹک، ۱۹۲۲ء، ص ص ۶۲۔۶۱، بحوالہ: *Letters from the Mughal Court: The First Jesuit Mission to Akbar (1580-83)*، ترجمہ: جان کوریا۔ افانسو، بمبئی، آنند، ۱۹۸۰ء، ص ۶۱)

۳۳۔ ولیم ہاکنز، 'تعلقات'، ولیم فاسٹر (مدیر)، *Early Travels in India, 1583-1619*، لندن ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۰، پیاٹرو ڈیلا ویل، '*The Travels of Pietrodella Valle in India*' ترجمہ: ایڈورڈ گرے، لندن، ۱۸۹۲ء، ص ۸۵، فرانسسکو پیلسارٹ، '*Remonstrantie*'، ترجمہ: ڈبلیو۔ایچ۔مورلینڈ اور پی۔گیال، '*Jahangir's India*'، کیمبرج، ۱۹۲۵ء، ص ص ۸۰۔۷۸۔ پیٹر منڈی 'Travels'، دوئم، ایڈیشن آر۔سی۔ ٹمپل، لندن، ۱۹۱۴ء، ص ص ۳۵۔۳۴، مینڈل سلو، اس کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ ایس۔کمشریٹ میں '*Mandelslo's Travels in Western India*' (۳۹۔۱۶۳۸ عیسوی) لندن، ۱۹۳۱، ص ص ۴۳۔۴۲، فرانسسکو برنیئر، '*Travels in Western India (1656-68)*'، ترجمہ: اروِنگ بروک، اور اے۔کانسٹیبل، نظرِ ثانی: وی اے اسمتھ، لندن، ۱۹۱۶ء، ص ص ۷۔۳۰۶، جین دی تھیوناٹ، ترجمہ: اے لوویل، مرتب: ایس۔این۔سین، '*The Indian Travels*

A'*of Therenot and Careri*'، نئی دہلی، ۱۹۴۹ء، ص۱۲۰، تھامس بورے، 'A
Geographical Account of Countries Round the Bay of
Bengal 1699 to 1679'، مرتب: آر۔سی۔ٹمپل، کیمبرج، ۱۹۰۵ء، ص۳۹

۳۴۔ جے۔اووِنگٹن، ۱۶۸۹، '*A Voyage to Surat in the Year, 1689*'، مرتب: ایچ۔جی۔رابنسن، لندن، ۱۹۲۹ء، ص۲۰۱

۳۵۔ 'اکبر کے ارشادات'، ابوالفضل، 'آئینِ اکبری'، دوئم، ص ص ۴۰۔۲۳۵

۳۶۔ بدایونی، 'منتخبات التواریخ'، دوئم، ص ۳۵۶، ابوالفضل، 'اکبرنامہ'، برٹش لائبریری، مسودہ add۲۴۷، ۲۷، a۲۹۶، 'اکبرنامہ'، کتابیاتی اشاریہ، انڈیا، سوئم، ص ص ۶۳۲۔۲۵۶، 'آئینِ اکبری'، ص ۲۴۳

۳۷۔ ابوالفضل، 'آئینِ اکبری'، دوئم، ص۲۴۲۔ ('اکبرنامہ'، برٹش لائبریری، مسودہ add۲۴۷، ۲۷، f۳۲۷b، 'اکبرنامہ'، کتابیاتی اشاریہ، سوئم، ص۳۸۰ میں اس کی تلخیص موجود ہے) مزید دیکھیں بدایونی، منتخب التواریخ، دوئم، ص ص ۳۹۱، ۳۳۸، اکبر کے عورتوں کے متعلق رویوں کے لیے عمومی طور پر دیکھیے میرا مقالہ 'اکبر اور سماجی ناانصافیاں'، '*Proceedings of the Indian History Congress*' ۵۳واں اجلاس، وارنگل (۹۳۔۱۹۹۲ء)، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ص ۶۔۳۰۳

۳۸۔ عبدالقادر بدایونی، 'نجات الرشید'، مدیر: ایس۔معین الحق، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ص ۷۔۴۳۶۔ یہ مصنف اسی متن میں عورتوں کی علیحدگی کے بارے میں اتنا شدت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ وہ عورتوں کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہونے کی مذمت کرتا ہے اور اس شعر سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی توثیق کرتے ہوئے اس کا حوالہ دیتا ہے (ایضاً، ص۴۶۰)، کتنی بہترین بات خورشید نے اپنے مشیر کو بتائی۔

عورت کا مقام نہ تو پردے کے پیچھے ہے اور نہ ہی قبر میں ہے

۳۹۔ منشی نندرام کیاستھ شری وستوایا، سیاق نامہ، لیتھو، لکھنؤ ۱۸۷۹ء، ص ص ۸۹۔۸۸

۴۰۔ دیکھیے: ببلیوتھیک نیشنل (پیرس)، MS Blochet Surl Pers
482, ff200a-202a, 206a, 208a-b, 217a-b. میں دیئے گئے معاہدہ

ازدواج میں 198a-b چار شرائط مخصوص نہیں کی گئیں۔ بلکہ ان کو محض 'عالمِ دین کے ہاں تسلیم شدہ اور معروف قرار دیا گیا ہے۔ یہ تب عملی طور پر بھی معیاری شرائط ہی تھیں۔ بیوی پر تشدد کی تعریف اس طرح کی گئی کہ جس سے کوئی نشان باقی رہ جائے، اور ان دونوں معاہدوں میں غیر حاضری کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ محض ایک سال ہی دیا گیا ہے، ان دستاویزات کو سب سے پہلے شیریں موسوی نے پیش کیا اور ان کا مطالعہ کیا، دیکھیے: Travails of a Proceedings of the Indian History ' Congress Mercantile Community '۵۲واں اجلاس، نئی دہلی، ۹۲-۱۹۹۱ء، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ص ۹۰-۴۰۰ء

۴۱۔ یہ نکتہ پایا جاتا ہے عرفان حبیب، 'معاشی اور معاشرتی تبدیلی'، History of Humanity ' جلد پنجم، مدیر پیٹر برک اور خلیل انالسک، یونیسکو (پیرس/لندن) ۱۹۹۹ء، ص ۴۱

ڈاکٹر مبارک علی کی تصنیف

'تاریخ اور عورت'

کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

آج ہی طلب فرمائیں

قیمت: ۳۰۰ روپے

ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز،

۸۔ الاحمد مینشن، گلشنِ اقبال، بلاک ۱۳۔ اے، یونیورسٹی روڈ، کراچی

گلبدن بیگم۔ بحثیت مؤرّخ

ڈاکٹر مبارک علی

عہدِ وسطیٰ کی تاریخ نویسی میں دو پہلو بہت اہم ہیں۔ اوّل، مؤرّخ بادشاہ اور اس کے دربار کو مرکز بنا کر تاریخی واقعات کو اس کے تناظر میں لکھتے ہیں، چونکہ ان میں سے اکثر دربار کے ملازم ہوتے تھے اس لیے ان کی تاریخ نویسی میں حکمرانوں کے کارنامے، ان کی تعریف و توصیف ہوتی تھی...... اگرچہ اس میں دوسرے واقعات کا بھی ذکر ہے، مگر وہ ضمنی ہے۔ عام لوگ اس تاریخ نویسی میں غائب ہیں۔

اس تاریخ نویسی کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اسے مردوں کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ چونکہ لکھنے والے بھی مرد ہوتے تھے، اس لیے مرد ان کی تاریخ کا محور ہیں۔ اس وجہ سے جنگوں اور جنگی کارناموں کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ مردوں کی بہادری اور شجاعت کے قصے اور ان سے متعلق روایات کو رومانوی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس تاریخ میں عورتیں تقریباً غائب ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہے بھی تو مالِ غنیمت میں۔ صلح کے لیے ان کو بطور تحفہ دینے اور مردوں کی تابعداری کرنے کا ہے۔

جن چند عورتوں کا ذکر ہے تو اس طرح کہ وہ اقتدار کے بعد اپنی نسوانیت کو ختم کر کے مردوں کی طرح ہو گئیں۔ جیسے رضیہ سلطانہ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی، گھڑسواری کرتی تھی اور مردوں کی طرح طور طریق اختیار کر لیے تھے یا پھر عورتوں کا ذکر ہے تو بطور سازشی اور فریبی کہ جنہوں نے مردوں کو گمراہ کیا۔

عہدِ مغلیہ میں، مغل شاہی گھرانے کی عورتوں کے بارے میں، ہربنس مکھیا نے اپنی کتاب 'مغلز آف انڈیا' (Mughals of India) میں لکھا ہے کہ مغلوں کے ابتدائی دور میں ان کی عورتیں

بہت آزاد تھیں اور رزم و بزم میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ مگر اکبر کے آتے آتے روایات بدل گئیں۔ ہندوستانی کلچر کے تحت شاہی خاندان کی عورتوں پر پابندی لگتی چلی گئی اور مغل حرم 'شبستان اقبال' میں تبدیل ہو گیا کہ جس کے اردگرد راجپوت سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ عورتوں کے آنے جانے کے بارے میں قوانین بنا دیئے گئے۔ ناموسِ حرم کا تصور اس قدر ابھرا کہ مغل عورتیں نظروں سے غائب ہو گئیں۔ مؤرخ ان کا ذکر اشاروں اور کنایوں میں کرنے لگے۔

گلبدن بیگم، جو بابر کی بیٹی تھیں، انہوں نے اکبر بادشاہ کی فرمائش پر 'احوال ہمایوں بادشاہ' تحریر کی۔ ایک لحاظ سے یہ ان کی یادداشتیں ہیں۔ چھوٹی عمر میں انہوں نے بابر بادشاہ کے عہدِ حکومت کو دیکھا اور پھر ہمایوں کے پورے عہد کا حال بیان کیا ہے۔ ان کی تاریخ کی اہمیت یہ ہے۔ کہ انہوں نے مغل خاندان اور گھریلو زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے کہ جو دربار کے مؤرخوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اگرچہ انہوں نے ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ہونے والی جنگوں اور کامران کے ساتھ ان کے معرکوں کا حال لکھا ہے، مگر یہ برسبیلِ تذکرہ ہے۔ ان کا اصل موضوع مغل خاندان کی گھریلو زندگی اور اس کی سرگرمیاں ہیں۔ بادشاہ اور ان کے گھر کی عورتوں سے تعلقات کا ذکر ہے۔ پکنک، دعوتیں، جشن اور تہواروں کا ذکر ہے۔ جس کی وجہ سے اس عہد کی ثقافتی تاریخ اور اس کے پہلو ابھر کر آتے ہیں۔

اس لحاظ سے گلبدن بیگم نے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ نویسی کے دونوں پہلوؤں کو نظرانداز کیا ہے۔ یعنی جنگ و جدل اور قتل و غارت گری اور مردانہ بہادری و شجاعت کی جگہ ان کی تاریخ میں عورتوں کی دلکش اور رعنائی ہے۔ دوسرے ان کی تاریخ مردانہ نقطۂ نظر کے بجائے عورتوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ جو گھریلو زندگی میں مسرت، خوشی، اور اطمینان کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ جو اقتدار اور طاقت کے حصول کے خلاف، اہلِ خاندان کو آپس میں جڑا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں۔

گلبدن نے عورتوں کے جو نام دیئے ہیں، ان سے بھی مغل دربار کے کلچر کا اندازہ ہوتا ہے، ان ناموں میں گل رنگ، گل رخ، گل چہرہ، دلدار، سلطان بیگم اور ماہم بیگم۔ یہ نام ایرانی اور وسط ایشیا کے کلچر سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں عربی اور مذہبی نام نہیں ہیں۔

مغل حکمران خاندان کی عورتوں کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے گلبدن بیگم نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی فتح کے بعد کابل سے ۹۶ خواتین آگرہ آئیں تو بابر نے ان کی

رہائش کے لیے انہیں محلات دیئے اور گذارے کے لیے وظائف مقرر کیے۔

بابر کا یہ دستور تھا کہ وہ ہر جمعہ کو بزرگ خواتین کی خیریت دریافت کرنے جاتا تھا۔ ایک بار جب موسم سخت گرم تھا، اسے کہا گیا کہ اس موسم میں نہ جائے تو اس نے جانے پر اصرار کیا، تاکہ خواتین کو نہ جانے پر مایوسی نہ ہو۔

اسی طرح ہمایوں کا بھی دستور تھا کہ وہ خاندان کی عورتوں کے گھروں پر جاتا تھا، ایک بار جب بیگا بیگم نے شکایت کی کہ وہ اس کے ہاں نہیں آیا، تو ہمایوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ افیم کا عادی ہے، جس کی وجہ سے اس پر سستی غالب آ جاتی ہے۔

گلبدن کی تاریخ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مغل خاندان کی عورتیں خاندانی جھگڑوں کو دور کرنے اور تصفیہ کرانے میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں، بلکہ انہوں نے خاندان کے بحرانوں میں مدد کی اور خاندان کے افراد کو سہارا دیا۔ مثلاً بابر کی بہن خانزادہ بیگم کی مثال ہے، جب بابر سمرقند میں محاصرے میں تھا اور شیبانی خان اس پر غالب تھا۔ اس وقت اس نے شیبانی خان کے اس مطالبے کو مان لیا کہ خانزادہ بیگم کی شادی اس سے کردی جائے تو وہ بابر کو شہر سے جانے دے گا۔ شیبانی خان کے قتل کے بعد جب خانزادہ بیگم واپس آئی تو بابر نے بہت عزت و رقوم سے اس کا استقبال کیا۔ خانزادہ بیگم نے بعد میں کوشش کی کہ کامران اور ہمایوں کے درمیان صلح کرائیں۔ انہوں نے کامران اور نہدال کے درمیان بھی صلح کرائی۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں اور حمیدہ بانو کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب بھکر میں حمیدہ بانو بادشاہ کے آداب کے لیے آئیں، تو بادشاہ کو ان سے محبت ہوگئی۔ انہوں نے جب دوبارہ حمیدہ بانو کو طلب کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بادشاہ کے سامنے پہلی بار آنا اور آداب بجالانا تو درست ہے مگر دوسری بار اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہمایوں کی جانب سے شادی کے لیے اصرار ہوا تو حمیدہ بانو نے کہا کہ میں ایسے شخص سے کیسے شادی کروں کہ جس کے گریبان تک میرا قد ہے۔ اگرچہ بہت لیت ولعل کے بعد یہ شادی ہوگئی، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک عورتوں کو شادی کے بارے میں اپنی مرضی کا اختیار تھا اور وہ بادشاہ کی درخواست بھی مسترد کرسکتی تھیں۔

بابر اور ہمایوں کو ہندوستان آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، مگر بابر نے فوراً آگرہ،

گوالیار میں محلات اور باغات بنوائے۔گلبدن بیگم نے شاہی خاندان کی دعوتوں کا حال لکھتے ہوئے، ایک دعوت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں شاہی خاندان کی عورتیں اپنے رتبے اور مرتبے کے حساب سے علیحدہ علیحدہ قالینوں پر بیٹھی تھیں۔ان میں ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے طشت تقسیم کیے گئے۔

دوسری جانب بادشاہ کی مہم سے واپسی پر شہر کی آرائش وزیبائش کا رواج ہوا۔مثلاً جب ہمایوں چنار کی مہم سے واپس ہوا تو اس خوشی میں شہر کو سجایا گیا۔ ماہم بیگم نے ایک دعوت کی جس میں ۷۰ ہزار لوگوں نے شرکت کی۔اس طرح نہدال کی شادی کے جشن میں دعوتوں اور تحفوں پر خوب خرچ کیا گیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی دولت کو حکمراں طبقوں نے ہمیشہ اپنی شان و شوکت کے لیے استعمال کیا۔

گلبدن نے اپنی کتاب میں ثقافتی سرگرمیوں میں عورتوں کی شرکت کی تفصیل دی ہے۔عورتیں نہ صرف گھر پر تفریحات میں حصہ لیتی تھیں، بلکہ گھڑسواری کرتی تھیں، شکار کی مہم پر جاتی تھیں اور جنگی مہمات میں بادشاہ کے ہمراہ ہوتی تھیں۔

گلبدن کے ہاں اس پر افسوس اور تاسف کا اظہار ہے کہ ہمایوں اور اس کے بھائیوں میں لڑائی جھگڑے رہے، خصوصیت سے کامران ہمیشہ فساد پر آمادہ رہا، اس ایک تصادم میں اس کا بھائی نہدال مارا گیا۔اس لیے وہ جنگ کی حامی نظر نہیں آتی ہے۔ جنگ عورتوں کے لیے ایک بھیانک عمل ہے کہ جس میں ان کے بھائی، شوہر اور رشتے دار مارے جاتے ہیں۔اس لیے وہ جنگ سے نفرت کرتی ہیں۔یہی جذبات ہمیں گلبدن کے ہاں ملتے ہیں۔

گلبدن بیگم نے بڑی عمر پائی۔ اکبر کے ابتدائی عہد میں بہرم خان کے خلاف جو سازش ہوئی اس میں یہ بھی شریک تھیں۔ بعد میں حمیدہ بانو کے ہمراہ حج کے لیے گئیں اور بھرپور زندگی گذاری۔ احوالِ ہمایوں پر ان کی تحریر سادہ اور دلکش ہے۔ واقعات کو بہت عمدگی کے ساتھ، مگر اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کا انگریزی ترجمہ سندر سورج نے کیا ہے، اردو میں دو ترجمے ہوئے ہیں، ایک عثمان حیدر مرزا کا ہے دوسرا رشید اختر ندوی کا ہے۔

کتاب کے آخری صفحات غائب ہیں، مگر شاید مرزا کامران کی سزا کے بعد زیادہ واقعات

بیان بھی نہ ہوئے ہوں۔

اس کتاب کی مغل تاریخ نویسی میں بڑی اہمیت ہے کہ یہ ایک شہزادی کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جس نے واقعات کا خود سے مشاہدہ کیا ہے، یا معتبر راویوں سے سنا ہے، لیکن اس کی تاریخ کا دائرہ شاہی خاندان کے گرد ہی گھومتا ہے اور انہیں واقعات کا تذکرہ کرتی ہے کہ جو شاہی خاندان سے متعلق تھے۔

لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مغل سماجی وثقافتی رجحانات اور رویوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ ادب آداب کے بارے میں، بزرگ خواتین کے احترام کے بارے میں، زیب و زینت اور آرائش میں ان کے ذوقِ جمال کے بارے میں۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی سرگرمیاں محدود تھیں، مگر عورتوں نے اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے تفریح کے مواقع پیدا کر لیے تھے۔ 'احوالِ ہمایوں بادشاہ'۔ اس عورت کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جو تاریخ کو عورتوں کی نظر سے دیکھتی ہے اور بیان کرتی ہے۔ یہی اس کی اہم خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد طاہر کی تحقیقی تصنیف

Political Dynamics of Sindh

1947 - 1977

جس میں آزادی کے بعد کے تین عشروں میں سندھ کی داخلی سیاست اور مرکز کے ساتھ اس کے تعلقات کی حرکیات کا معروضی تجزیہ کیا گیا ہے۔

اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب

صفحات: ۸۰۱، قیمت: ۸۰۰روپے

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، پوسٹ بکس نمبر: ۸۴۵۰، کراچی

۱۸۵۷ء میں خواتین کا کردار

ڈاکٹر انصار زاہد خان

ترجمہ: انور شاہین

ہماری تاریخ خواتین کی عائلی وفاشعاری، ایثار ومحبت اور روحانی کمالات کی مثالوں اور نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ تاہم ایسی استثنائی صورتیں اور مواقع بھی نظر آتے ہیں جب عورتوں نے جنگِ جمل سے لے کر عہدِ حاضر تک قائدانہ کردار بھی ادا کیا ہے۔ البتہ اس مضمون میں ہم صرف ہندوستان میں آزادی کی پہلی جنگ (۱۸۵۷ء) میں خواتین کی قائدانہ صلاحیتوں کے پہلو تک خود کو محدود رکھیں گے۔

سامراجی حکمرانوں نے جو کہ مقامی باشندوں کی ایک وسیع اور مقبولِ عام مخالفانہ متحدہ جدوجہد سے حیرت زدہ بلکہ صدمے سے دوچار تھے، اس کی ولولہ انگیز قومی نوعیت کو بنگال کی فوج کے سپاہیوں کی بغاوتِ محض کہہ کر تحقیر کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ فوج تھی کہ جسے رابرٹ کلائیو نے جنگِ پلاسی سے قبل تین کمپنیوں کی شکل میں بھرتی کیا تھا اور جس فوج نے پورے شمالی ہند حتیٰ کہ افغانستان تک کمپنی کا جھنڈا اگاڑ دیا تھا۔ امریکہ کی جنگِ آزادی کے بعد کسی نے ایسی وسیع وعریض بغاوت نہ دیکھی تھی۔ مستقبل میں ایسی متحد مقامی مخالفت کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے کے خوف میں مبتلا سامراجی حکمرانوں نے بے دست وپا بہادر شاہ ظفر اور اس کی بیگم زینت محل کو ان کے قید خانے ہی کے صحن میں رات کی تاریکی میں دفنا کر ان کی قبروں کو برابر کر دیا مبادا ان کی قبریں ہی کہیں زیارتوں کا مرکز بن جائیں۔ کراچی میں جہاں باغی سپاہیوں کو توپوں کے دہانوں میں رکھ کر اڑا دیا گیا، اس جگہ ایمپریس مارکیٹ کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ تاہم غدر کی اصطلاح نے قومی حافظے میں ایک قابلِ تعظیم علامتی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ ہمارے قومی ماضی کا محرک اور تفاخر کا احساس

دلانے والا ایک عظیم لمحہ بن گیا۔ کسی اور بغاوت کو کبھی بھی 'غدر' کا نام نہ دیا گیا۔

بلاشبہ یہ عظیم مزاحمتی تحریک بنگال آرمی ہی نے شروع کی تھی لیکن جلد ہی اس نے قومی حیثیت اختیار کرلی جس میں عورتوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ان میں سے تین مثالیں پیش کی جارہی ہیں جوکہ اس حوالے سے اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۸۵۳ء میں جھانسی کے راجہ لاولد مر گئے۔ ڈلہوزی کی شروع کردہ پالیسی کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی نے راجہ کے 'متبنیٰ' بیٹے کو ان کا جانشین ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی بیوہ رانی لکشمی بائی کو جوکہ دراصل ایک غیر اہم برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ساٹھ ہزار روپے کی پنشن دے کر ریاست کو برطانوی عملداری میں لے لیا گیا۔ جب میرٹھ اور دہلی میں بغاوت کی خبر آئی تو رانی نے مصالحت کی نصیحت کے برخلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک اچھے جرنیل کی طرح انہوں نے جھانسی اور گردونواح کی قلعہ بندی کی۔ تاہم ان کے وسائل کی کمیابی نے انہیں حملہ آور سامراجی افواج کی کامیابی سے مزاحمت کرنے سے روک دیا۔ جھانسی کو خالی کرنا ضروری ہوگیا۔ رانی نے جنگ جاری رکھی اور گوالیار کی طرف بڑھیں۔ کوتہ کی سرائے پہ جو گوالیار سے چار میل جنوب میں تھی، وہ لڑتے لڑتے مرگئیں اور قریبی باغ میں ان کی چتا جلائی گئی لیکن ان کی بہادری نے عوامی تصورات کے اندر جگہ بنالی۔

ایسی ہی ایک اور بہادر خاتون (ہیروئن) جن کا تعلق معمولی گھرانے سے تھا، بیگم حضرت محل تھیں، جوکہ ایک سابقہ درباری عورت تھیں، لیکن اپنی کشش اور صلاحیتوں کے باعث انہوں نے لکھنؤ کے شاہی حرم میں ایک ممتاز جگہ بنالی تھی۔ ایک سال قبل ریاست اودھ پر کمپنی نے بدانتظامی کے جھوٹے الزامات لگا کر قبضہ کرلیا تھا۔ دہلی اور کانپور سے آتی ہوئی خبروں نے اودھ میں بھی عوامی بغاوت پیدا کردی۔ حضرت محل نے اس کی بڑھ کر قیادت سنبھالی۔ وہ جھانسی کی رانی کی طرح فوجوں کی قیادت کی تو اہل نہ تھیں لیکن انہوں نے انگریزوں کے پروپیگنڈے کا جواب دینے کی کوشش کی اور ملکہ وکٹوریہ کے بالمقابل خود اپنے فرمان جاری کیے۔ انگریزوں نے ریزیڈنسی میں پناہ لے رکھی تھی اور اس کو مزید جاری رکھنے کے اہل نہ تھے تا آنکہ کمپنی کی نجات دہندہ فوجوں نے ان کو بچایا۔ شکست کھانے کے بعد حضرت محل نیپال کی جانب چلی گئیں اور وہیں یہ کھٹمنڈو میں دفن کی گئیں۔

اس ضمن میں تیسرا واقعہ سیّد مبارک شاہ کا تحریر شدہ ہے جنہیں بغاوت کے بعد بہادر شاہ نے کوتوال مقرر کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کو معافی دے دی گئی لیکن انہیں ۱۸۵۷ء دہلی کے واقعات پر ایک رپورٹ تیار کرنے کو کہا گیا۔ ان کا بیان ہے:

'ایسا بارہا ہوا کہ رامپور کی بوڑھی کمزور مسلمان خواتین نے باغیوں کی قیادت کی۔ جب سپاہی پسپا ہونے لگتے تھے تو وہ ننگی تلواریں لہراتے ہوئے آگے بڑھتیں اور سپاہیوں کو غیرت دلاتی تھیں۔ وہ انہیں بزدل کہتیں اور چلاتیں کہ دیکھو کس طرح عورتیں آگے بڑھ رہی ہیں جب کہ وہ ان کے پیچھے آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ (وہ کہتیں) ہم تو گولیوں کی بارش یا (بوچھاڑوں) میں بے روک ٹوک آگے بڑھ رہی ہیں جب کہ تم بھاگ کر دور جا رہے ہو۔ سپاہی معذرت کرتے ہوئے کہتے کہ ہم تو گولہ بارود لینے جا رہے ہیں، لیکن عورتیں جواب دیتیں ''تم ٹھہرو اور مقابلہ کرو ہم تمہارے لیے گولہ بارود لاتی ہیں۔'' یہ عورتیں گولیوں کی بارش میں بہت بے خوفی کے ساتھ چلتی جاتیں اور Batteries میں موجود سپاہیوں کو کارتوس کی رسد پہنچاتیں۔ لیکن اللہ کی رضا سے ان کو کبھی کوئی زخم نہ لگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دو میں سے ایک خاتون کو قیدی بنا کر سول کمشنر مسٹر گریتھیڈ کے سامنے لایا گیا جو کہ شہر کی صورتِ حال اور باغی فوج کے حالات کے بارے میں تفتیش کر رہا تھا۔ اس کارروائی کے بعد اس نے عورت کو پانچ روپے دے کر چھوڑ دیا اور ساتھ ہی یہ حکم بڑی سختی سے دیا کہ کوئی شخص اس عورت کی بے حرمتی نہ کرے۔ چونکہ وہ خود کبھی باغیوں کی جانب واپس نہ آئی اس لیے اس کے بارے میں بہت سوں کا یہ خیال ہے کہ وہ انگریزوں کی جاسوس رہی تھی۔ جب بھی غازیوں کے گروہ حملہ کرنے کو جاتے تو عورتیں ان سب سے آگے جا رہی ہوتی تھیں۔'

مبارک شاہ کو یا تو اس قیدی عورت کے بارے میں غلط اطلاع دی گئی تھی یا اس نے جان بوجھ

کر اصلی حقائق تو چھپانے کی کوشش کی۔ اس عہد کی ایک اور رپورٹ جیون لال کی ہے جس میں ایک عورت کا ذکر ہے جو گھڑ سوار دستوں کے 'سوار' کی سی سبز وردی (مردانہ لباس) میں ملبوس تھی۔ ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو جب سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ چکے تھے وہ بہت بہادری سے لڑ رہی تھی۔ اس نے ۵۷ ویں انفنٹری کے گھڑ سواروں کے حملے کی قیادت کی اور دشمن کے دو سپاہیوں کو مار دیا۔ خود وہ زخمی ہوئی اور قید کر لی گئی۔ اس کو بوڑھا اور بدشکل بتایا گیا۔ ہڈسن اس کو جانے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے انبالہ کے ڈپٹی کمشنر جے ڈگلس کو ۲۹ جولائی کے مکتوب میں یہ لکھا کہ جنرل اس کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ ہڈسن کو یہ خوف تھا کہ وہ دوسری جون آف آرک نہ بن جائے۔ اس لیے اس کو انبالہ میں قید کر دیا گیا۔ بعدازاں وہ اور اس کے ساتھیوں پر کیا بیتی، ہمیں نہیں معلوم۔ انگریزوں کو یہ غلط اطلاع پھیلا کر انہیں بے توقیر کرنے میں ضرور کامیابی ہوئی کہ وہ ان کے جاسوس تھے۔ یہ تھیں وہ جنگجو خواتین جو سپاہیوں کو لڑنے کا حوصلہ دلاتی تھیں لیکن خود المناک انجام سے دوچار ہوئیں۔ ہم ان کو سلام پیش کرتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ مبارک شاہ، 'کوتوال کی ڈائری'، مدیر: انصار زاہد خاں، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۸۸

۲۔ جیمز لیزر، 'دی ریڈ موزٹ'، لندن، ۱۹۵۶ء، ص ص ۲۔۲۰۱

۳۔ مزید دیکھیے: 'دہلی، ۱۸۵۷ء، ڈائری اور خط و کتابت'، لندن، ۱۹۰۲ء، ص ۱۴۳

۴۔ معین الحق، 'دی فرسٹ وار آف انڈی پنڈنس'، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۳۵

۵۔ جیون لال، بمطابق 'میٹکاف، ٹو نیٹو نیریٹوز آف دی میوٹنی ایٹ دہلی'، ویسٹ منسٹر، ۱۹۸۸ء

اردو ادب کی تواریخ اور خواتین قلم کار

ڈاکٹر فاطمہ حسن

اردو ادب کی تاریخ کے بارے میں کام کرتے ہوئے وہی سوالات ذہن میں آتے ہیں جو تاریخ بطور موضوع پر جدید مؤرخین اٹھاتے ہیں۔ یہ سوالات نئے نہیں ہیں لیکن اہم ضرور ہیں۔ ان میں سے چند بنیادی سوالات یہ ہیں کہ کیا تاریخ کا علم زور آور شخصیات اور بالادست طبقے سے منسلک واقعات و حالات پیش کرنے اور ان کے سیاسی و سماجی ایجنڈے کے بیان و وضاحت پر ختم ہو جاتا ہے؟۔ کیا ماضی میں تاریخ نگاروں نے موضوع کے دامن کو تنگ رکھنے کے لیے بہت سے حقائق کو نظرانداز نہیں کیا ہے؟۔ کیا ہر عہد کے پھیلاؤ میں ایسے افراد وجود نہیں رکھتے ہیں جن کا کردار سماج پر اثر اندازی میں بالادست طبقے کے برابر یا زیادہ رہا ہو؟۔ پرکشش شخصیات کے سحر، اقتدار کے ایوان، رزم و بزم کے شور اور دستیاب ماخذ کے ڈھیر، اس خاموش گروہ اور مؤرخ کے درمیان کس حد تک حائل رہے جو کسی بھی عہد کی ثقافتی، سیاسی اور نظریاتی تبدیلی کا محرک رہا ہے؟۔ یہی سوالات ترقی پسندوں نے کسانوں، مزدوروں اور عام افراد کے حوالے سے اٹھائے ہیں۔ تاہم اُن کی گہرائی اور معنویت اس وقت زیادہ واضح ہوتی ہے جب تاریخ میں عورتوں کی غیر موجودگی کا سوال سامنے آتا ہے۔ خصوصاً ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب نسائی تحریک کو خواتین قلمکاروں کا ساتھ ملا تو ایک طرف تو ان کتابوں کے دوبارہ مطالعوں پر زور دیا گیا جن کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے اور دوسری طرف خواتین کو تاریخ کے اندھیرے سے نکالنے پر توجہ دی گئی۔ نسائی تحریک نے مطالعہ کا رُخ بدل دیا ہے۔ اب سماجی علوم میں خواتین کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ تاریخ میں اُن کی عدم شمولیت کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مؤرخین نے نہ صرف علم تاریخ کی تعریف متعین کرنے پر زور دیا ہے بلکہ خواتین مؤرخ اپنی تاریخ خود لکھنے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ حوالے کے لیے

'جدید تاریخ' جس کے موئف ڈاکٹر مبارک علی ہیں میں عورتوں کی تاریخ کے عنوان سے جون اسکوٹ کے طویل مضمون سے ایک اقتباس پیش کر رہی ہوں۔

> 'عورتوں کی تاریخ کو نہ صرف روایتی تاریخ نویسی کی ساخت اور تشکیل کو بدلنا ہوتا ہے بلکہ پورے تاریخی عمل کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے اور اب تک تاریخ پر جو مردوں کو اجارہ داری ہے اُسے بھی توڑنا پڑتا ہے۔ اس مفروضے کو بھی چیلنج کرنا ہوتا ہے کہ اب تک تاریخ مکمل اور جامع نہیں بلکہ اس میں بہت سے خلاء ہیں جنہیں پُر کرنا ضروری ہے۔'

خواتین قلم کار کی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہوئے ایسے ہی عمل سے گزرنا میرا اور معاصر خواتین کا تجربہ رہا ہے۔ زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، خالدہ حسین، کشور ناہید، شاہدہ حسن، ڈاکٹر تنویر انجم ہم سب بیک وقت تاریخی عمل کے تجزیے کے ساتھ ساخت کی تشکیل کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ ہم سے پہلے عصمت چغتائی اور خصوصاً قرۃ العین حیدر نے جن کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ واضح طور پر پیش کردہ حقائق کو مفروضہ قرار دیا ہے اور تاریخ کے خلا کی نشاندہی کی ہے۔ صرف خواتین قلم کار ہی نہیں آج کے بہت اہم ادبی محققین اور ناقدین جن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ضمیر علی بدایونی، ڈاکٹر آصف فرخی، ڈاکٹر شاہ محمد مری وغیرہ شامل ہیں نے بھی خواتین کے باب میں ہونے والی کوتاہیوں اور اُن خواتین کے مطالعے کو اہم قرار دیا ہے جو پورے نسائی شعور کے ساتھ لکھ رہی تھیں مگر اُنہیں کہیں کہیں (گوپی چند نارنگ کے الفاظ) میں حاشیے میں جگہ دی گئی۔ آج بہت اہم دانشور تاریخی عمل کے تجزیے کے ساتھ ساخت کی تشکیل کی طرف متوجہ ہیں۔ یہ کوئی شعوری طور پر اپنایا ہوا رویہ نہیں ہے۔ صدیوں کے رائج پیدرسری نظام کے تحت قائم ہونے والی سماجی اقتدار کے خلاف ایک فطری ردِعمل ہے جس نے ماضی کے ہیروؤں کی 'یک صنفی' اور اُن کی سماجی اور عقلی برتری کو رد کر دیا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی وعدہ کتاب گھر سے شائع ہونے والی فیمنیزم پر چار کتابیں جو سیمینار میں پڑھے جانے والے مضامین اور بحث ومباحث کے بعد مرتب کی گئیں ہم عصر قلم کاروں کی خصوصاً خواتین کی فکری ہم آہنگی اور واضح نسائی شعور کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ 'خاموشی کی آواز'، 'فیمنیزم اور ہم' اور 'نسائی ردِ تشکیل' یہ تینوں کتابیں جان اسکاٹ کے اقتباس کو سچ ثابت کر رہی ہیں۔ یہ ایک عہد کی سچائی ہے اور ایسے انسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو برابری کی سطح

پر پورے خطہ زمین پر موجود ہے مگر اِس کے ہونے کا سراغ تاریخ میں نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔

اُردو ادب کی تواریخ پر بھی جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ ہمیں مردوں کی طرف سے مردوں کا بیانیہ ہی نظر آتی ہیں۔ خواہ وہ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' ہو یا ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' کی تین جلدیں (جواب تک منظر عام پر آچکی ہیں)۔ صرف مرد قلمکاروں اور اُس سماج کا احاطہ کر رہی ہیں جس میں لکھنے والی عورت کا وجود مفقود ہے۔ یہی صورت حال مولانا حامد حسن قادری کی 'داستانِ تاریخ اردو'، آغا محمد باقر کی 'تاریخ نظم ونثرِ اردو' اور رام بابو سکسینہ کی 'تاریخ ادبِ اردو' میں نظر آتی ہے۔ تواریخِ ادب میں خواتین کا عدم وجود کتنا غیر حقیقی ہے اِس کا جائزہ لیتے ہوئے میں اُن اہم قلم کار خواتین کا ذکر کروں گی جنہیں تذکروں میں نہیں تاریخ میں جگہ ملنی چاہیے تھی۔

اردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس سے ۱۸۶۹ء سے ہوتا ہے۔ ان کے فوراً بعد میں جتنے ناول لکھے گئے انہیں کے زیر اثر لکھے گئے جن کا سماجی ایجنڈا خواتین کی تعلیم وتربیت تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اسی انداز کا ایک ناول 'اصلاح النساء' لکھا گیا جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا ناول ہے جو مصنفہ کے بیٹے نے ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آنے کے بعد شائع کیا۔ ابتدائی ایڈیشن پر والدہ محمد سلیمان لکھا جاتا رہا۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اب اس کا نیا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں مصنفہ کے اصل نام رشید النساء کے ساتھ چھپا ہے۔ جس میں دیباچہ اول جو خود مصنفہ نے ۱۸۹۳ء میں لکھا تھا کے ساتھ دیباچہ دوم بیگم ثریا قرنی، دیباچہ ایڈیشن ۲۰۰۰ء سید قصر امام اور دو تفصیلی مضامین بالترتیب ادیب سہیل اور زاہدہ حنا کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ زاہدہ حنا مصنفہ کے تعارف میں لکھتی ہیں:

> 'رشید النساء جنگ آزادی سے چار برس پہلے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے مغل زوال کو اپنے کانوں سے سنا اور برطانوی عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کا خاندان برطانوی ہندوستان کے اقتدار سے جڑا رہا، کئی شمس العلماء، کئی خان بہادر اور کئی نائٹ ان کے بھائی، بھتیجے اور داماد تھے۔ جدید تہذیب کی روشنی ان کے خاندان کے زنان خانے میں تو نہیں آئی لیکن اس کا عکس زنان خانے کے اندھیرے میں پو پھٹنے کا ملگجا اجالا ضرور پھیلاتا رہا۔'

اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ادیب سہیل نے لکھا ہے:

'اصلاح النساء تحریر کرتے ہوئے رشید النساء کے پیش نظر محض یہ مقصد نہیں رہا کہ ناول کے حوالے سے اخلاقی پند ونصائح بیان کر دیئے جائیں، بلکہ انہوں نے اپنے ناول کی اساس عورتوں میں روشن خیالی کے فروغ پر رکھی ہے، وہ عورت کے معاشرے کی ہر اعتبار سے تطہیر چاہتی ہیں، اس کا اظہار ناول میں کہیں متن کی سطح پر ہوتا ہے کہیں اس کے بین السطور اور کہیں کرداروں کی زبان سے۔'

زاہدہ حنا جنہوں نے 'اصلاح النساء' کی بازیافت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنے مضمون 'اردو کی ناول نگار خواتین سوا صدی کے قصہ' میں لکھتی ہیں:

'اصلاح النساء کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ہی ''افسانہ نادر جہاں'' (۱۹۰۱) از نواب فخر النساء، نادر جہاں بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ''مشیر نسواں'' (۱۹۰۶) اکبری بیگم کا ''گودڑ کا لال'' (۱۹۰۷) ''اختر النساء بیگم'' (۱۹۱۰) از نذر سجاد حیدر کو بھی نظر انداز کیا گیا اور محمدی بیگم کے ناول ''صفیہ بیگم'' (۱۹۲۰) کو اردو میں کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا ناول قرار دیا گیا۔'

مندرجہ بالا ناولوں میں اکبری بیگم کا ناول 'گودڑ کا لال' اپنے عہد کا بے حد مقبول ناول ہے جو ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ اس ناول کے بارے میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔

'نذر سجاد حیدر سے زیادہ مشہور و مقبول ان کی پھوپی اکبری بیگم (والدہ افضل علی) تھیں۔ اُن کے ناول ''گودڑ کے لال'' نے ایک اسطوری حیثیت اختیار کر لی تھی اور یہ ناول غالباً ۱۹۱۰ء سے پہلے لاہور سے شائع ہوا تھا لیکن ہمارے یہاں اُردو فکشن پر ریسرچ بھی بہت ہی رواروی میں کی جاتی ہے۔'

ناول 'گودڑ کے لال' میں نے بھی اسکول کے زمانے میں اپنی دادی کے پاس دیکھا اور پڑھا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک بے حد دلچسپ اور پاپولر ناول تھا۔ قرۃ العین حیدر نے یہ گلہ بھی کیا ہے۔

'گودڑ کے لال' سے لے کر زاہدہ حنا تک پاپولر اور غیر پاپولر خواتین فکشن

> نگاروں کا ایک طویل ترین سلسلہ ہے جسے ہمارے نقادوں نے التفات کے لائق نہیں سمجھا۔ بعض اہم خواتین کو سرے سے فراموش ہی کر دیا گیا۔[۲]

رشید النساء اور اکبری بیگم کے بعد دو اہم ترین ناول نگار جنہیں نہ صرف مقبولیت حاصل ہوئی۔ بلکہ جدید ناول کی ابتداء ان سے ہوئی ہے۔ نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے مس نذر الباقر کے نام سے ۱۴؍برس کی عمر میں بچوں کی کہانیوں سے لکھنے کی ابتداء کی۔ ۱۹؍ویں صدی کے اختتام اور ۲۰؍ویں صدی کے آغاز میں خواتین کے متعدد رسالے شائع ہونے لگے تھے۔ جن میں تہذیب نسواں (۱۸۹۸)، خاتون (۱۹۰۴)، عصمت (۱۹۰۸) طویل عرصے تک شائع ہوتے رہے۔ مس نذر الباقر، مس حجاب اسماعیل رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ نذر لباقر جو سجاد حیدر ریلدرم سے شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھنے لگیں۔ اپنی نثر اور قصہ گوئی کی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ۱۸۹۴ء میں علیگڑھ میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور بچوں کے ہفت روزہ 'پھول' کی ادارت بھی کی۔ اُن کے پانچ ناول اور ناولٹ 'آہِ مظلومہ' (۱۹۱۴)، 'جانباز' (۱۹۱۸)، 'ثریا' (۱۹۳۰)، 'نجمہ' (۱۹۳۹) اور ناولٹ 'مالی کی بیٹی' سامنے آئے۔ ان کا ناول جانباز 'عصمت دہلی' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ان کی یادداشت اور ڈائری پر مشتمل ان کی لائق صاحبزادی قرۃ العین حیدر کی مرتب کردہ کتاب 'گزشتہ برسوں کی برف' جو ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان کے عہد کی خواتین کی سماجی سرگرمیوں اور روشن خیالی، قابلیت اور صلاحیتوں کا بہت دلچسپ بیان ہے۔ نذر سجاد حیدر سادہ اور رواں نثر لکھتی رہی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کا انتقال ۱۷؍اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی میں ہوا۔

اِسی دور میں ایک اور خاتون افسانہ اور ناول نگار حجاب امتیاز علی نے شہرت حاصل کی۔ حجاب امتیاز علی جنہوں نے مس حجاب اسماعیل کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ تعلیم یافتہ اور بہت روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ساڑھے گیارہ برس کی عمر سے لکھنے کا آغاز کیا۔ اُن کی تصانیف میں متعدد افسانوی مجموعے اور ناول ہیں۔ ان کا ناولٹ 'میری ناتمام محبت' اور ناول 'ظالم محبت' ان کے عہد کی سماجی تبدیلیوں کے آئینہ

دار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں مغربی ادب سے متاثر محسوس ہوتی ہیں۔ اردو ادب کی ناول نگاری میں جدید دور کے آغاز کو ان دو ناول نگار خواتین کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔

ترقی پسند تحریک خواتین کے لیے دو طرح سے سازگار ثابت ہوئی۔ ایک طرف تو خواتین نے برابری کی سطح پر لکھنے اور ادبی سرگرمیوں میں شمولیت کا آغاز کیا۔ دوسری طرف تاریخ میں اُن کو نظرانداز کرنے کا رویہ کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ جدید تواریخِ ادب میں اُن خواتین قلمکار کا ذکر ہونے لگا جنھیں نظرانداز کرنا کسی طور پر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر انور سدید کی 'مختصر تاریخِ ادب' اور ڈاکٹر سلیم اختر کی 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' میں اس عہد کی لکھنے والی خواتین کا ذکر ہے۔ تاہم ان سے پہلے بہت اہم لکھنے والیوں کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے رومانی افسانہ نگاروں میں حجاب امتیاز علی اور ترقی پسند شعراء میں ادا جعفری کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اردو شاعری کے غزل کے باب میں ناصر کاظمی سے ظفر اقبال تک جن میں ابن انشاء، ساقی فاروقی، احمد مشتاق شامل ہیں غزل کو شاعرہ کا کوئی نام نہیں۔

ترقی پسند تحریک جہاں سماج کے دیگر پسماندہ طبقے کے لیے سازگار تھی وہاں خواتین کیلئے بھی بہت موثر رہی اور اس کے زیر اثر ڈاکٹر رشید جہاں، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، صدیقہ بیگم سیہاروی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، واجدہ تبسم، جیلانی بانو جیسی لکھنے والیوں نے یہ غلط فہمی دور کر دی کہ خواتین کوئی ادبی کارنامہ انجام نہیں دے سکتیں۔ خصوصاً عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر، افسانہ 'لحاف' اور 'خاکہ درزخی' ایسی تخلیقات تھیں جنہیں متعصب نقاد بھی نظرانداز نہیں کر سکے۔ پاکستان بننے کے بعد خواتین کو لکھنے کے لیے سازگار ماحول ملا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والی تین خواتین اپنے تخلیقی کام کی وجہ سے صف اول کے ادیبوں میں شمار ہوئیں۔ یہ خواتین قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور حاجرہ مسرور ہیں۔ جن کی وجہ سے خواتین کے لیے ادبی فضا سازگار ہوئی۔ قرۃ العین حیدر کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' اور 'آگ کا دریا' پاکستان کے ابتدائی دور کی تخلیق ہیں۔ خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' کی پذیرائی ہوئی۔ ان کے فوراً بعد جمیلہ ہاشمی کے ناول 'تلاش بہاراں' اور 'دشت سوس'، الطاف فاطمہ کا ناول 'دستک نہ دو'، رضیہ فصیح احمد کا ناول 'آبلہ پا' مقبول ہوئے۔ حاجرہ مسرور، بیگم اختر جمال، نثار عزیز بٹ، خالدہ حسین، فرخندہ لودھی کی تحریریں نے ادبی مقام حاصل کیا۔ بانو قدسیہ اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے

ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوئیں اور بہت معتبر حوالہ بنیں۔ زاہدہ حنا، رشیدہ رضویہ، فردوس حیدر، فرحت پروین، نیلم بشیر احمد، نگہت حسن افسانے کے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

افسانوں کے حوالے سے خالدہ حسین کا نام اس لیے بہت اہم ہے کہ ان کے افسانوں نے جدید ادب کے ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کیا مگر ان کا اس طرح مطالعہ اب تک نہیں کیا گیا جیسا 'سواری' جیسی کہانی لکھنے والی کا ہونا چاہیے تھا۔ خالدہ حسین نے اس کہانی میں علامت اور واقعہ نگاری کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا ہے جو معنیٰ اور کیفیت دونوں سطح پر قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کا ناول 'کاغذی گھاٹ' بھی وجودی فکر اور اسلوب کی بنا پر بہت اہم جدید ناول ہے تاہم خالدہ حسین کو اب تک ادبی مؤرخین اور ناقدین نے نظر انداز کرنے کا رویہ اپنایا ہوا ہے۔

تواریخِ اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ مؤرخین نے شاعرات کو دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ ایسا نہیں تھا کہ کسی عہد میں شاعرات موجود نہیں تھیں یا اُن کا ہونا بالکل معدوم تھا۔ شاعرات کے تذکروں اور رسائل میں اُن کی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں شائع ہونے والی جمیل احمد کی کتاب 'تذکرہ شاعرات' اس میں دو سو سے زائد ایسی خواتین کا ذکر ہے جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ 'وہ عفت مآب تھیں۔ اُس بازار سے نہیں تھیں۔'

اگرچہ اس بازار سے تعلق رکھنے والی خواتین میں مہہ لقا بائی چندا، جیسی شاعرہ بھی پیدا ہوئی مگر ان کے اور ان جیسی شاعرات کے کلام پر شک و شبے کا اظہار کیا گیا۔ ان شاعرات سے منسوب کلام کو ان کے استاد اور پرستاروں کا تحفہ سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں مہہ لقا بائی چندا کو استثنیٰ قرار دیا گیا ہے لیکن ان کے لیے بھی دو خیالات پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ علم و فضل میں یکتا تھیں اور شعر و سخن کا علم رکھتی تھیں اس لیے کئی معتبر نقاد ان کی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انکا دیوان ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا۔ ان کے لیے شفقت رضوی لکھتے ہیں۔ ولؔی کے بعد سراؔج اور سراؔج کے بعد چندا تاریخی تسلسل میں سامنے آتے ہیں تو زبان اور بیان کی منزلیں طے ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ولؔی کے صفائی زبان کے سب معترف ہیں۔ سراؔج نے اس کو مزید نکھارا، سنوارا۔ چنؔدا کے ہاں ترقی کی تکمیل نظر آتی ہے جس میں محبوبانہ نسونیت کی آمیزش ہے۔ وہ بڑی شاعرہ نہ سہی اچھی شاعرہ ضرور تھی۔

چندا کی مثال سے پتہ چلتا ہے کہ شاعرات ہر عہد میں موجود تھیں۔شریف گھرانوں کی جو خواتین اس دور میں لکھ رہی تھیں ان کو اپنے کلام کو سنانے تو کیا شائع کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔خواتین کے ابتدائی رسالوں میں ان کے لکھے ہوئے مضامین شائع ہوتے تھے مگر شاعری مردوں کی ہی ہوتی تھی۔شاعرات میں ز۔خ۔ش۔، رابعہ پنہاں، بلقیس جمال کے علاوہ صفیہ شمیم ملیح آبادی، کنیز فاطمہ حیا، خورشید بانو وہ نام ہیں جو رسائل میں شائع ہوئے۔

ز۔خ۔ش۔(زاہدہ خاتون شروانیہ) اردو شاعری کا بہت اہم نام ہیں۔ یہ پہلی شاعرہ ہیں جنہیں ان کی توانا فکر اور طرزِ کلام کی وجہ سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔اگرچہ انہوں نے اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔کئی بار نام تبدیل کیے۔کچھ عرصے تک نہ چھپنے کا فیصلہ کیا مگر ان کی نظموں نے قارئین کو متوجہ کیا۔ز۔خ۔ش نے کم عمر پائی۔وہ دسمبر ۱۸۹۶ء بھیکم پور علی گڑھ میں پیدا ہوئی اور ۲۶ر فروری ۱۹۲۲ء کو ۲۶ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ان کے کلام کے دو مجموعے 'آئینۂ حرم' اور 'فردوسِ تخیل' منظر عام پر آئے۔'فردوسِ تخیل' کو انہوں نے اپنی زندگی میں مرتب کر دیا تھا۔مگر یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔۳۸۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۲۱ نظمیں شامل ہیں جو متنوع مضامین اور تخلیقی اظہار کی وجہ سے ان کی شعری ذہانت اور قادر الکلامی کی آئینہ دار ہیں۔

ز۔خ۔ش ایک باشعور اور تعلیم یافتہ شاعرہ تھیں۔وہ تمام عمر اس بات پر نالاں رہیں اور اس کا اظہار کرتی رہیں کہ عورت پر ترقی کی راہیں بند کر دی گئی ہیں۔خود انہیں اپنی سیاسی اور سماجی نظریات کی مکمل آزادی نہیں تھی۔سیاسی نظریات کے اظہار میں والدہ کی انگریز پرستی اور داخلی کیفیات کے بیان میں خاندانی روایات حائل رہیں۔ز۔خ۔ش پر میرا تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔جس میں نہ صرف اُن کی شاعری بلکہ اُس عہد کی تاریخ بھی موجود ہے۔زاہدہ خاتون شروانیہ کے تقریباً ۲۰۰ سے زائد خطوط جس میں اُن کے عہد کی سماجی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی تاریخ اور مباحث کی دستاویز ہیں۔خواجہ حسن ثانی نظامی کے پاس محفوظ ہیں۔یہ خطوط خواجہ حسن نظامی کی بیگم لیلیٰ خواجہ بانو کو (جو رسالہ 'اُستانی' کی مدیرہ بھی تھیں) کو لکھے گئے ہیں اور اِس میں خواجہ حسن نظامی سے بھی ایسی بحث و مباحث ہیں جن سے کچھ تاریخی حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں۔اِس طرح تاریخ کا ایک باب محفوظ ہونے کے باوجود ریکارڈ پر موجود نہیں ہے۔اِن خطوط کے کچھ حصے میں

نے اپنی تحقیق میں نقل کیے ہیں۔ ز۔خ۔ش کے چند اشعار دیکھیئے۔

میں شانے سے درگزری آئینے سے باز آئی
اب دل ہی نہیں جس میں ہو ذوق خود آرائی

ہر چند کہ صورت میں ہوں نور کی مورت میں
ناظر نہ ہو جب کوئی کس کام کی زیبائی

زنداں میں ہے کیوں یوسف پنجرے میں ہے کیوں بلبل
یہ کون سی حکمت ہے یہ کون سی دانائی

ز۔خ۔ش کے بعد رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال دونوں بہنیں وہ شاعرات ہیں جن کی شاعری میں نسائی اظہار اور نسائی شعور نمایاں ہے۔ رابعہ پنہاں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۷۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی غزلیں ان کے ہم عصر مرد شعراء کے طرزِ اظہار سے مختلف نہیں تاہم ان کی کیفیات اور تجربات ایک عورت کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

میری تو ہر نگاہ ہے وقف عبودیت
وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا لیے ہوئے

رابعہ پنہاں کا ایک اور شعر دیکھیئے۔

دل پر خوں نے بخشا رنگِ چشم فتنہ ساماں کو
سنوارا میری وحشت نے تری زلفِ پریشاں کو

رابعہ پنہاں نے اپنی نظم 'عورت سے خطاب' میں عورت کو براہِ راست دعوت عمل دی ہے وہ لکھتی ہیں۔

ہے تضادِ زندگی تیرا معمائے عجیب
چشمِ ظاہر بیں پہنچ سکتی نہیں تیرے قریب

بلقیس جمال کا مجموعہ کلام عصمت بک ایجنسی نے ۱۹۳۳ء میں 'آئینہ جمال' کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے صرف ۱۳ سال کی عمر میں غزل لکھ کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ بلقیس جمال کو زبان و

بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ان کی شاعری میں اعلیٰ جمالیات اور خوبصورت اظہار نمایاں ہے۔اُن کا ایک شعر دیکھیے۔

نہیں ہے جو اسی کو ڈھونڈتی ہوں
جمالہ اس جنوں سے فائدہ کیا

انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ان کی زیادہ تر نظموں کا حوالہ اور موضوع خواتین ہیں۔متعدد اہم شاعرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو ادب کی تواریخ ادا جعفری سے شروع کی جاتی ہے۔ادا جعفری ۲۲ ر اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ان کا پہلا مجموعہ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کے دیباچے میں جس پر یکم فروری ۱۹۴۷ء کی تاریخ ہے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

'یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے ہمارے ملک کی خواتین کو اپنی طرف رجوع کرلیا ہے۔ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ خواتین عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہوا کرتی ہیں اب زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہیں اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار بننے پر آمادہ ہوگئی ہے۔'

ادا جعفری کی کلیات 'موسم موسم' ان کے چھ مجموعوں کے ۷۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔اُن کی خود نوشت 'جو رہی سو بے خبر ہی رہی' بھی ایک بہت اہم تصنیف ہے۔ادا جعفری کی شاعری میں روایت کا شعور اور نئے طرز احساس کا ایک امتزاج ملتا ہے جس نے یہ واضح کردیا کہ شاعرات جو لکھ رہی ہیں ان میں ایک طرح کی تازگی ہے۔یہ تازگی اپنے احساسات، کیفیات اور تجربات کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے کسی تجرباتی داؤ پیچ سے نہیں۔انہوں نے شاعری میں سادگی، بے ساختگی کے ساتھ مختلف معنیٰ و مضامین کا اضافہ کیا ہے۔

ادا جعفری کے فوراً بعد زہرا نگاہ کی شاعرہ نے ادبی حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔زہرا نگاہ ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں اُن کا بچپن کراچی میں گزرا۔زہرا نگاہ کا پہلا مجموعہ 'شام کا پہلا

تارا‘ اُن کے شعری سفر کا ایسا آغاز تھا جس میں امکانات کی راہیں روشن تھیں۔ پہلے مجموعے کی پہلی نظم میں پہلا تارا آنے والی بہت سی صبحوں کا استعارا بن گیا۔ اس نظم میں شاعرہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی، اردگرد کی فضا کو محسوس کرتی، اپنے ظاہری اور باطنی وجود کا ادراک رکھتی، ایک ایسے ساتھی کا اعلان کرتی ہے جو برابری کی سطح پر موجود ہے۔

شام کا یہ پہلا تارا اُن کے شعری سفر میں ساتھ رہا۔ دوسرے مجموعے ’ورق‘ سے تیسرے مجموعے ’فراق‘ تک زہرا نگاہ نے بہت مضبوط قدموں کے ساتھ ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ زہرا نگاہ کا شعری سفر جاری ہے۔ اُن کی شاعری سے ملاقات، اُن سے ملاقات ہے۔ اُن کا یہ ہمدم دیرینہ شام کا پہلا تارا ’فراق‘ میں بھی اُن کے ساتھ ہے اور دلوں میں اُتر جانے والی سچی شاعری کے امکانات کو روشن کر رہا ہے۔ اس مجموعے سے دو اشعار دیکھیے۔

ایک کے گھر کی خدمت کی، اور ایک کے دل سے محبت کی
دونوں فرض نبھا کر اس نے ساری عمر عبادت کی

صورتِ دل کشی رہی خواہش زندگی رہی
داغِ دلِ خراب سے رات میں روشنی رہی

آج کے عہد میں جو شاعرات پورے نسائی شعور کے ساتھ ادب کی تاریخ میں اپنا مقام بنا رہی ہیں اُن میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض دو بہت اہم نام ہیں۔ کشور ناہید کا پہلا مجموعہ کلام ’لب گویا‘ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ غزلوں اور دوہوں پر مشتمل تھا۔ کشور کا لب ولہجہ اور تیور ابتداء ہی سے اتنے مختلف اور بااعتماد تھے کہ نہ صرف سنجیدہ لکھنے والے ان کی طرف متوجہ ہوئے بلکہ ناقدین بھی ان کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ اب اُن کی ضخیم کلیات ’دشتِ قیس میں لیلیٰ‘ خودنوشت ’بری عورت کی کتھا‘ متعدد نثری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔

کشور ناہید ہمارے عہد کی ایک ایسی شاعرہ اور ادیبہ ہیں جس نے صنفی مفروضات کو اپنی ذہانت، عملی صلاحیت اور تخلیقی اظہار سے یکسر غلط ثابت کر دیا۔ اب خواتین قلمکار کو نہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کی تحریر کے کیا معنی نکالے جائیں گے۔ نہ ہی روایتی ناقدین کی توقعات اور مردانہ سماج کے ایجنڈے پر پورا اُترنے کی خواہش۔

فہمیدہ ریاض ۲۸ر جولائی ۱۹۴۵ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی پرورش اور گریجویشن تک تعلیم حیدرآباد سندھ میں ہوئی جہاں اُن کے والدین قیام پاکستان سے قبل سے آباد تھے۔ بعد میں اُنہوں نے لندن میں بھی تعلیم حاصل کی۔ اُن کا پہلا مجموعہ 'پتھر کی زبان' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اور دوسرا مجموعہ 'بدن دریدہ' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری ایک نئے طرز احساس کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہے جس میں عورت کے اپنے وجود کا بھرپور احساس نمایاں ہے۔ فہمیدہ کی عورت دوسروں کے وجود کا سایہ نہیں بلکہ مکمل شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے۔ انہوں نے روایتی رویوں سے کنارہ کشی کی اور ایک نئی فضا میں سانس لینے کی کوشش کی۔

فہمیدہ ریاض نے ایسے موضوعات پر بھی لکھا جو بہت تلخ تھے۔ خواتین ان پر سوچتی تھیں مگر اظہار نہیں کرتی تھیں۔ خواتین کو خون خرابے اور فساد کی جڑ لکھا جاتا رہا ہے اور ایسا مالِ غنیمت سمجھا گیا ہے جس کی چھینا جھپٹی فساد کا سبب بن گئی ہے۔ مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ بھی انسان ہے۔ اس کی بھی سوچ اور ذہن ہے۔ وہ کوئی اثاثہ نہیں ہے جسے تقسیم کر دیا جائے یا تحفہ میں دے دیا جائے۔ نظم 'اقلیما' میں ایسی سوچ کا اظہار بڑی شدت سے کیا گیا ہے۔ 'مقابلہ حسن' فہمیدہ کی ایسی نظم ہے جس پر کافی لے دے مچی مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ نظم ایک ایسے رویئے کی طرف بھرپور احتجاج ہے جو صدیوں سے عام رہا ہے۔ عورت کا جسم ادیب، شاعر، مصور، مجسمہ ساز سب کا موضوع رہا۔ ذہن اگر موضوع تو مزاح کے ساتھ۔ اس طرح عورت صرف تفریح اور تزئین و آرائش کی شے بن کر رہ گئی۔ فہمیدہ نے اس نظم میں اس رویئے کی طرف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ شاعری کے سفر میں انہوں نے خود کو زمان و مکاں کی قید سے آزاد جانا اور مولانا رومی تک پہنچ گئیں۔ فہمیدہ کی غزل کا ایک شعر ہے۔

نقوش پاؤں کے لکھتے ہیں منزل نایافت
مرا سفر تو ہے تحریر میری راہوں میں

ان کا یہ سفر انہیں نثر کی وادیوں میں بھی لے گیا۔ انہوں نے زندہ بہاریں جیسی زندہ تحریر لکھی۔ گوداوری اور خط مرموز میں زندگی کی کہانیاں سنائیں۔ پھر بھی 'منزل نایافت' نے انہیں رکنے نہ دیا

کہ انھوں کی تحریر انہیں اب ایک اور سمت لے جارہی ہے۔آج کل یہ رومی کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ انسانیت و محبت کو جو معاشرے سے ناپید ہو رہی ہے اس بے کراں عشق سے جگایا جائےکے جو صوفیوں اور شاعروں کا مسلک رہا ہے۔

اردو ادب کے وسیع دامن میں شاعرات کے کلام کا گراں مایہ ذخیرہ ہے۔ اِن میں شفیق فاطمہ شعرا، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، بلقیس ظہیر الحسن، پروین فنا سید، شبنم شکیل، پروین شاکر، شاہدہ حسن، یاسمین حمید، عشرت آفرین، منصورہ احمد، ثمینہ راجہ، ریحانہ روحی، تسنیم عابدی، ثروت زہرا زیدی اور دیگر متعدد شاعرات نے اپنی شناخت پیدا کی ہے۔ان کی شاعری کو صرف زنانہ تذکرے میں نہیں بلکہ تاریخ کے تسلسل میں دیکھنا چاہیے۔

وقت کی گنجائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اِس مضمون میں اُن چند خواتین ناول و افسانہ نگار اور شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔جن کی تخلیقات کو مستند رسائل اور معتبر ناقدین کی سند حاصل رہی ہے۔ جن کی غیر موجودگی تاریخ کے اوراق کی غیر موجودگی ہے۔ یہ قلمکار خواتین اردو ادب کی تاریخ کو مکمل کرنے اور ماضی کی کوتاہیوں سے اجتناب کے لیے مثال ہیں۔کیا کسی بھی عہد کا سماجی مطالعہ اورلسانیات اُس عہد کو تحریر کرنے والی خواتین کے بغیر مکمل ہوسکتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو تاریخ پر از سرنو کام کرنے کی ضرورت ہے۔

انہوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی، اس کے باوجود انہیں زنانہ مدرسہ کھولنے کا شوق بے حد و بے حساب تھا۔اس شوق کو انہوں نے بیسویں صدی کی ابتداء میں پورا کیا۔۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک زنانہ مدرسہ 'مدرسہ اسلامیہ' قائم کیا جس کے معائنہ کے لیے گورنر بنگال، لیڈی فریزر آئیں، پٹنہ والوں کے لیے زنانہ مدرسے کا قیام اور لیڈی فریزر کا اس کے معائنے کے لیے آنا ایک واقعہ تھا۔ چنانچہ اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں تک شہر اور شہر والوں میں ہوتا رہا۔ یہ مدرسہ کئی برس تک چلتا رہا۔ ڈاکٹر آصفہ واسع کے بیان کے مطابق اس مدرسے کو بعد میں بادشاہ نواب رضوی نے بی۔این۔آر اسکول کا نام دیا اور اپنی جائیداد اس کے اخراجات کے لیے مختص کردی۔ مہارانی بیتیا نے اس اسکول کے لیے عمارت دی، اس وجہ سے یہ اسکول 'بیتیا ہاؤس' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس اسکول میں ایک ہوسٹل بھی تھا جس کی نگرانی رشید النساء کی بڑی بیٹی نصیب النساء کے حصے میں آئی تھی۔

اسی ناول کے بارے میں ایک اور مضمون میں قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے۔

'گودڑ کا لال' کا مرکزی کردار ایک لڑکی ہے۔ وہ لڑکی لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کا ہے جب کوئی لڑکی میڈیکل کالج میں نہیں پڑھتی تھی۔ برقعہ کے ساتھ لیبارٹری کا کام ممکن نہیں۔ اس لیے وہ کالج بے پردہ جاتی ہے۔ بے پردہ کسی طرح جاتی ہے غور کیجئے۔ سفید رنگ کی لڑکی ہے اور بے حد خوبصورت ہے۔ تھوڑی سی توے کی سیاہی شکل پر مل لیتی ہے تاکہ بدشکل نظر آئے اور بدشکل نظر آنے کے بعد وہ کالج میں جاکر پڑھتی ہے۔ یہ بات بڑے مسخرے پن کی لگ رہی ہے کہ لڑکی کو انہوں نے اس طرح دیکھا لیکن آپ یہ دیکھیئے کہ ان کے اندر جذبہ کیا تھا'

ڈاکٹر مبارک علی کی نئی تصنیف

Pakistan in Search of Identity

شائع ہوگئی ہے

اس کتاب میں مصنف کے وہ مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں جو پاکستان میں شناخت، تاریخ، ریاست اور مذہب کے تعلق کے موضوعات پر تحریر کیے گئے۔ کتاب میں تحریکِ خلافت اور کراچی کے ماضی و حال کی ثقافت پر بھی مضامین شامل ہیں۔

صفحات: ۱۶۲، قیمت: ۴۰۰ روپے

(طالب علموں کے لیے ۵۰ فیصد رعایت)

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی،

پوسٹ بکس نمبر: ۸۴۵۰، کراچی

اردو کی اولین نسوانی خودنوشت 'بیتی کہانی'

صائمہ حیات

خودنوشت یا آپ بیتی ایک بیانیہ صنفِ نثر ہے۔ ہمارے ہاں اس صنفِ تحریر پر اہلِ قلم نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اول تو یہ کہ ہمارے ہاں گزر جانے والی زندگی کو وقعت نہیں دی جاتی اور اس کے علاوہ ہمارے جیسے قدامت پسند معاشرے میں حقیقت نگاری ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ بالخصوص جب کہانی اپنی زبانی ہو۔ اس میں سچائی، دیانت داری، صاف گوئی اور جرأت اظہار کا امتحان ہوتا ہے اور ان عناصر کے یکجا ہوتے بغیر اس فن کا معیار قائم نہیں ہوسکتا۔

پنجابی ادب کی لیجنڈ امرتا پریتم اپنی خودنوشت 'رسیدی ٹکٹ' کے آخری باب میں سوانح حیات کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> 'خودنوشت سوانحِ حیات کو اکثر چمک دمک بھری یک طرفہ سچائی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل ہے'۔

اگر خودنوشت لکھتے ہوئے مکمل دیانت داری برتی جائے تو واقعتاً ایسا ہی ہے۔ آپ بیتی میں واقعات اور حالات وغیرہ جمع کرتے وقت بڑی ہوشیاری سے ترتیب و تدوین کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس طرح کے کسی شخص کی زندگی بالکل اسی طرح سامنے آئے جس طرح اس کی اپنی حیات میں اس کا تسلسل رہا ہو۔ خیال اور مبالغہ آرائی کی کارفرمائی کا اس میں دخل نہ ہو۔ اس لیے خودنوشت سوانحِ عمری پیش کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں تقسیم سے قبل لکھی گئی کئی خودنوشت سوانح عمریوں کا سراغ ملتا ہے۔ جن میں مکمل، نامکمل اور مختصر آپ بیتیاں شامل ہیں۔

لکھی جانے والی سوانحِ عمریوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس صنفِ نثر کو خواتین لکھاریوں نے کم ہی اپنایا ہے۔ جن لکھنے والیوں نے اپنی خودنوشت یا سوانحِ عمریاں لکھی ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انہیں ادبی حلقوں میں بے حد پزیرائی ملی اور وہ پڑھنے والوں میں بھی بے حد مقبول ہوئیں اور بقول عطیہ داؤد کے عورت کی لکھی ہوئی آپ بیتی اتنی زیادہ پڑھی نہیں جاتی جتنی زیادہ وہ زیرِ بحث آتی ہے۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو جو مقبولیت اور پسندیدگی امرتا پریتم کی خودنوشت 'رسیدی ٹکٹ' کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ رسیدی ٹکٹ میں امرتا پریتم نے نہایت دیانت داری سے اپنی ہستی کی سچائی کو بیان کیا ہے۔ رسیدی ٹکٹ کی نثر نہایت خوبصورت نغمگی لیے ہوئے ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نثر محبت کے چشمے سے پھوٹی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والی ایک اور خودنوشت جس نے ادبی حلقوں میں بے پناہ داد وصول کی وہ اردو کی جدید شاعرہ ادا جعفری کی خودنوشت 'جو رہی سو بے خبری رہی' ہے۔ ادا جعفری نے اس خودنوشت میں جو نثر لکھی وہ ان کی شاعری اور شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس خودنوشت سے ان کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

ایک اور اہم آپ بیتی جو بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت 'ہم سفر' کے نام سے شائع ہوئی، اس آپ بیتی میں حمیدہ اختر نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کو بلاتکلف دوسروں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں زندگی کی تمام تر رعنائی اور دلکشی نہایت سادہ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان کتابوں میں خاص رکھ رکھاؤ اور تہذیب کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور اہم آپ بیتی اردو کی بے باک شاعرہ کشور ناہید کی 'بُری عورت کی کتھا' شائع ہوئی۔ کشور ناہید نے نثر میں بھی قدرے بے باکی کے جوہر دکھائے۔ زبان و بیان کی پابندی سے قدرے آزاد، طنزیہ اور ذومعنی تحریر کے جا بجا مظاہروں کے سبب یہ کتاب ادبی حلقوں میں 'ہاٹ کیک' بنی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس کتھا میں صاف گوئی، سچائی اور جرأت اظہار کا مظاہرہ دوسری شخصیات کے لیے تو کیا ہے تاہم اپنی ذات سے متعلق بے حد محتاط رہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ 'بری عورت کی کتھا' ایک کمرشل خودنوشت ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک آپ بیتیوں میں ڈاکٹر عالیہ امام کی 'رفیقِ دل فگاراں' عذرا عباس کی 'میرا بچپن' ثریا خورشید کی 'چناروں کے

سائے'، بیگم سیدہ مشکور کی 'بیگم کی ڈائری'، افضل توصیف کی 'درر کی دہلیز'، صالحہ عابد حسین کی 'سلسلۂ روز وشب' اور حالیہ شائع ہونے والی معروف شاعرہ عطیہ داؤد کی خودنوشت 'آئینے کے سامنے' کے نام سامنے آتے ہیں۔

یہ آپ بیتیاں تو پڑھنے والوں تک پہنچیں لیکن اس بات کا تعین ہونا ابھی باقی ہے کہ اردو کی پہلی نسوانی خودنوشت کسے کہا جائے اور پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ کب اور کس نے لکھی؟

میرے پیشِ نظر کتاب 'بیتی کہانی' ہے جسے ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو جناب معین الدین عقیل اردو کی اولین نسوانی خودنوشت قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق بیتی کہانی کو شہر بانو بیگم نے ۱۸۸۵ء میں تحریر کیا اور پھر ڈیڑھ برس بعد محض دیباچے کا اضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

اس لحاظ سے 'بیتی کہانی' اردو کی پہلی نسوانی خودنوشت ہے۔ اس آپ بیتی کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ یہ اولین نسوانی خودنوشت ہے بلکہ یہ کتاب اس دور میں لکھی گئی جب ہندوستانی خواتین کو تعلیم کے مواقع حاصل نہیں تھے اور لڑکیوں کو سوائے پردے کے کوئی اور درس نہیں دیا جاتا تھا۔ ایسے عالم میں کسی خاتون کا کتاب لکھنا اور پھر ایسی صنفِ ادب کو اختیار کرنا جو اس وقت عام نہیں ہوئی تھی ایک قابل توجہ امر ہے۔

'بیتی کہانی' شہر بانو بیگم کی زندگی کی المناک تصویر ہے۔ شہر بانو کسی غریب گھرانے سے نہیں تھیں بلکہ ان کا تعلق ریاست پٹودی کے حکمراں خاندان سے تھا، شہر بانو رئیسِ ریاست نواب اکبر علی خان کی دختر تھیں۔ نواب اکبر علی خان کی شانِ وشوکت ریاستی حکمرانی اور مال و دولت سے ہی نہیں ظاہر ہوتی تھی بلکہ اس کا اظہار اس سے بھی ہوتا تھا کہ ۱۲/ بیویاں، ۵ بیٹے اور ۱۲/ بیٹیاں بھی ان کی ملکیت تھیں۔ شہر بانو نواب اکبر علی کی نویں بیوی سے تھیں۔ شہر بانو اپنے ابا کی تو اکلوتی بیٹی نہیں تھیں لیکن یہ اپنی ماں کی اکلوتی اولاد ضرور تھیں۔

شہر بانو ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئیں اور جس دن ان کی پیدائش کا جشن ریاست پٹودی میں منایا جارہا تھا اس دن اتفاق سے نواب عبدالرحمٰن خان صاحب رئیس جھجر کا بھی آنا ہوا، انہوں نے بیٹی کی مبارک باد نواب اکبر علی کو دی اور پھر شہر بانو کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ شہر بانو کی نسبت ان کے پیدا ہوتے ہی ریاست جھجر کے نواب عبدالرحمٰن کے فرزند محمد نور علی خان کے ساتھ کر دی گئی۔ یعنی

ایک نواب کے گھر جنم لیا تو دوسرے نواب کے کھوٹنے سے بندھ گئیں۔ شہر بانو کی خوب قسمتی ایسی جسے جان کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ ان کی شادی بمشکل ۵ برس کی عمر میں کر دی گئی۔ آپ ۵ برس کی شہر بانو کو تصور میں لایئے اور اس ظلم کی شدت کو محسوس کریں کہ کہاں ۵ برس کی ننھی معصوم جان اور اس پر اس شادی کی ناگہانی آفت۔ شہر بانو کی شادی روایتی شان وشوکت سے کی گئی۔ آپ بیتی میں شادی کے وقت ان کے شوہر کی عمر درج نہیں ہے لیکن ہمارے خیال میں 10، 12 سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ شہر بانو کے بچپن کے دن میکے اور سسرال میں ہنستے کھیلتے گزرے۔ زندگی کی المنا کی اور بربادی شہر بانو نے نو برس کی عمر سے دیکھی جب ۱۸۵۷ء کا غدر کا واقعہ ہوا۔ اس غدر میں نواب اکبر علی خان نے انگریزوں سے اچھے تعلقات قائم کر لیے اور یوں ان کی ریاست اور حکمرانی محفوظ رہی۔ دوسری طرف شہر بانو کے سسر نواب عبدالرحمٰن نے بغاوت کی اور اس جرم کی پاداش میں پھانسی پر لٹکا دیئے گئے اور ریاست جھجر انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔ شہر بانو کے شوہر اور پورے خاندان کو جھجر چھوڑنے کا حکم ہوا اور پھر سارا خاندان لودھیانہ جا کے جا بسا۔

شہر بانو بھی اپنی ساس کے ہمراہ ۱۸۵۸ء میں لودھیانہ روانہ ہوئیں اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ریاست کے خاتمے کے بعد نواب جھجر کے سارے خاندان کے ساتھ شہر بانو بیگم بھی تباہ حال ہوئیں۔ دربدر ہو کر زندگی تنگ دستی میں گزارنے پر مجبور ہوئیں۔ ان کے شوہر نااہل و ناکارہ اور بگڑے ہوئے نواب کے کردار کی بدترین مثال تھے۔ اپنا رہا سہا اثاثہ لٹا دینے کے بعد بیوی کے نہایت قلیل وظیفے پر جو ریاست پٹودی کے ورثاء کے لیے منظور ہوا تھا، انحصار کیا۔ نواب نور علی خان کا صرف ۲۴ سال کی عمر میں ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ کتاب میں کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملتا کہ نواب نور علی خان شہر بانو کا سہارا بنے ہوں۔ بیوی شوہر کے تعلقات کی خوش گواری کا اندازہ کم از کم اس بات سے نہیں ہوتا کہ وہ پانچ بچوں کے والدین بنے۔ شہر بانو کی کوئی اولاد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی اور اس طرح نہیں بے پناہ تکلیفوں کے ساتھ اولاد کی جدائی کا غم ملا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اپنی مستقل علالت کے باعث لدھیانہ سے کمشنر کی اجازت سے دہلی منتقل ہوئیں۔ یہاں ان کی ملاقات مس تھورن (Miss Thorn) کے توسط سے مس فلیچر سے ہوئی۔ وہ شہر بانو کو پڑھنا لکھنا سکھاتی تھیں اور یہ مس فلیچر کو اردو بولنا سکھاتی تھیں۔ مس فلیچر کی ہی فرمائش پر شہر بانو نے 'بیتی کہانی' تصنیف کی۔ شہر بانو کی تعلیمی قابلیت تو بظاہر کچھ بھی نہیں سوائے اسکے کے انہوں نے اردو کی ابتدائی

کتابوں جن میں ڈپٹی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس'، 'تاریخ ہند' اور مولانا محمد حسین آزاد کی چار درسی کتب جو انہوں نے مس فلیچر سے پڑھیں۔ لیکن 'بیتی کہانی' کو پڑھتے ہوئے کسی مقام پر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ مصنفہ کی اولین تخلیق ہے۔ یہ چیز شہر بانو کی تخلیقی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ 'بیتی کہانی' میں خاندان پٹودی کی مختصر تاریخ کا ایک باب موجود ہے جو شہر بانو کی تاریخ سے دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ سادہ اور برجستہ جملے اور اشعار کا برملا استعمال شہر بانو کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آپ بیتی میں جو احساس کرب اور تلخی نظر آتی ہے وہ شہر بانو کی زندگی کے تلخ تجربات، تنگ دستی و تباہ حالی اور اپنوں اور بیگانوں سے ملنے والی اذیتوں اور مایوسی کے سبب ہے۔ مصنفہ نے اپنے تلخ تجربات کو بڑی گہرائی اور شدت سے محسوس کیا ہے اور بیان کرنے کی بھی ایک پرتاثیر کوشش کی ہے۔

'بیتی کہانی' میں اُس عہد کے معاشرے کی بھرپور عکاسی بھی ہوتی ہے۔ کتاب سے اس دور کی عورت کی محکومی، بے بسی اور لاچاری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شہر بانو نے اپنی بے بسی کو ان چند جملوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

> 'مجھ جیسے بدنصیب دنیا میں دیکھے بھی کیا، سنے بھی نہ ہوں گے۔ غدر میں کیسی مصیبت اُٹھائی، ساس کی کیسی کیسی سختیاں سہیں، خاوند نے یوں برباد کیا، اولاد سے یہ پھل ملا کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ زندگی کے دکھ پورے کرتی ہوں جو ایسے ایسے دکھ بھرتی ہوں۔
> نہیں معلوم خدا ابھی اور کیا کیا دکھائے گا۔ کس کس طرح آزمائے گا۔ غرض چالیس برس کی عمر میں دنیا کا خوب تماشا دیکھا اور دیکھتی ہوں۔ دنیا بڑی مکار ہے۔ اس کا کیا اعتبار ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ ۵۰۰ روپے خرچ پاندان کا مقرر ہوا تھا اور اب وہی ہم ہیں کہ ۹۰ روپے میں گزارہ کرتے ہیں۔ میری کہانی پڑھ کر تم کیا نفع پاؤ گی، رنج و غم کھاؤ گی، اپنا جی دکھاؤ گی۔'

آپ ان جملوں میں شہر بانو کے کرب کو محسوس کر سکتے ہیں۔

'بیتی کہانی' صرف شہر بانو کی کہانی نہیں بلکہ اس سماج کی پسی ہوئی تمام ادھ موئی عورتوں کی کہانی ہے۔

برصغیر کی انہیں ادھ موئی عورتوں کے بارے میں زاہدہ حنا اپنی کتاب 'عورت زندگی کا زنداں' میں لکھتی ہیں کہ:

> 'مشرق میں ذہین عورتوں کی ہڈیوں پر تہذیب کے تاج محل تعمیر ہوئے ارجمند بانو جو ملکہ ممتاز محل کے نام سے مشہور ہوئی جس کا مقبرہ تاج محل، عجائب روزگار میں ملتے ہے وہ شاہ جہاں کے سترھویں بچے کی پیدائش میں ختم ہوئی تھی۔ Maternal Mortality کا ایک ناقابلِ یقین واقعہ۔ جس سماج کی ملکہ ۱۷ بچے پیدا کرتی ہو اس کی عام عورت کا کیا احوال ہوگا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔'

شہر بانو بیگم کی 'بیتی کہانی' زاہدہ حنا کے انہی جملوں کی ایک جھلک ہے۔

معروف ترقی پسند مؤرّخ اور ادیب

سیّد سبطِ حسن

کی آخری تصنیف

مارکس اور مشرق

شائع ہوگئی ہے۔ مصنف اپنے انتقال کے وقت اس کتاب کی تکمیل میں مصروف تھے اب یہی کتاب ضروری تدوین و ترتیب کے بعد شائع کردی گئی ہے

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

قیمت: ۲۵۰ روپے

مکتبۂ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر۔ کراچی۔ ۷۴۴۰۰

تاریخ میں عورت کا مقام۔ایک سائنسی تناظر

ڈاکٹر طارق سہیل

ترجمہ: محمد مظاہر

'مردوں کی کندھے چوڑے اور بڑے ہوتے ہیں اور کولہے تنگ اور چھوٹے اور عورتوں کے مقابلے میں ان میں معاملہ فہمی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ عورتوں کے کندھے چھوٹے اور تنگ مگر کولہے بڑے ہوتے ہیں۔ مہد سے لحد تک انہیں گھر کی چار دیواری میں رہنا چاہیے۔ خاموش بیٹھیں، خانہ داری کریں، بچے جنیں اور ان کی پرورش کریں۔'

(مارٹن لوتھر۔۱۴۸۳۔۱۵۴۶ء)

علم معنویات (semantics) ہو یا کسی بھی نوعیت کا تعصب، عرصہ دراز سے اس کا پلڑہ مردوں کے حق میں جھکا ہوا ہے۔ تاریخ تو صرف اس کی کہانی ہے۔ تاریخ کے ابلاغ کے لاتعداد طریقے رہے ہیں۔ وہ بیانات جو عظیم حکمرانوں کے دربار سے جاری ہوئے، واقعات اور کہانیاں جنہیں سادہ لوح مردوں اور عورتوں نے لکھا۔ زبانی روایات اور اس سب پر مستزاد، علم تاریخ نویسی جس کا موجد عظیم ابن خلدون تھا۔ اس مقالے کی اساس اسی قسم کی تاریخ پر رکھی گئی ہے اور اس میں علم بشریات اور حیاتیاتی معلومات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

جنسی تولید کے ذریعے افزائش نسل کرنے والی انواع کے افراد دو قسم کی صورت میں اپنا وجود رکھتے ہیں یعنی مردانہ اور زنانہ جسم۔ ترقی یافتہ حیوانوں میں یہ فرق نہایت واضح ہوتا ہے۔ نروں کا جثہ قدرے پھیلا ہوا اور ان پر چربی چڑھنے سے انداز نمایاں طور پر مختلف ہوتا ہے۔ حیاتیات کے نقطۂ نظر سے کہیں جامع تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ زمنی کا حرکت پذیر مہین جرثومی خلیہ تخلیق کرتا ہے جو جسم سے باہر اپنے سے بڑے سست رَو بیضے کی تلاش میں رہتا ہے جنہیں کوئی مادہ جنم دیتی ہے۔

بیگانہ لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوگا کہ مادہ کا بیضہ مرد کے جرثومے سے کوئی سو گنا بڑا ہوتا

ہے۔ ایک مرد ایک احتلام میں اٹھائیس کروڑ منویہ جرثومے تخلیق کرتا ہے۔ جبکہ ایک عورت اپنی پوری تخلیقی عمر میں صرف ۴۰۰ بیضے پیدا کر سکتی ہے۔

دماغ میں پائے جانے والا جنسی فرق

مردوں اور عورتوں کے دماغ کی عمومی تشریح الاعضا سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مختلف ہیں۔ بالغ مردوں کا دماغ اوسطاً بالغ عورتوں کے دماغ سے بڑا ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کے ہر طرف زنانہ دماغ مردانہ دماغوں کی اوسط جسامت کا ۹۱ فیصد ہوتا ہے۔ (یہ نتائج پیکن برگ اور وایٹ کی ایک جدول سے ماخوذ ہیں جو ۱۹۶۴ء میں مرتب کی گئی تھیں) جبکہ ان میں بھی مختلف آبادیوں میں ۸۸ تا ۹۴ فیصد کا فرق پایا گیا۔ کئی قسم کے بالغ مردانہ دماغوں کا اوسط وزن ۱۳۴۵ گرام نکلا جب کہ اسی اوسط کے ۹۱ فیصد میں اوسط تخمینے کے مطابق بالغ عورت کا دماغ کا وزن ۱۲۲۲ گرام ملتا ہے۔

بالغ مردوں اور عورتوں کے دماغوں کے 'اوسط' فرق کا تشریح الاعضا کے دستیاب علم کے ذریعے بآسانی خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ مردوں کا دماغ عورتوں کے دماغ کے مقابلے میں قریب قریب دس فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عورتوں کا دماغ ان کے جسموں کے مقابلے میں اس لیے قدرے بڑا ہوتا ہے کہ کیونکہ اول الذکر غیر متناسب انداز میں وزن میں بڑھتا ہے۔ زنانہ دماغ کے عصبی خلیے گہری کثافت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ کس کر بندھے ہوتے ہیں جبکہ عصبی خلیوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ مردوں میں اعصابی مرکز سے مربوط کرنے والے نسیجوں دار خلیے زیادہ ہوتے ہیں۔ زیرِ عرشہ (hypothapamus) کے دو مرکزی خلیے جن کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ مردوں سے مخصوص جنسی اطوار میں شریک رہیں وہ مردوں میں مقابلتاً بڑے ہوتے ہیں۔ وہ تینوں ڈھانچے جو دماغ کے داہنے اور بائیں نصف کرّوں کو مربوط کرتے ہیں وہ عورتوں میں پائے جانے والی جسامت سے عموماً بڑے ہوتے ہیں۔ آخر میں دماغ مردوں میں چونکہ ایک جانب اُلدرا ہوتا ہے مگر خواتین میں اکثر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ جیسا کہ کنپٹیوں کے نیچے پائے جانے والے گویائی والے خلیوں کی بالائی سطح کی جسامت میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس ساری کھچڑی کا لبِ لباب یہ ہے کہ اوسطاً مردوں اور عورتوں کا دماغ نرالی حد تک مختلف ہے اور اسے ادراک سے مربوط ہونا چاہیے۔

عورتوں کی داستان کو سمجھنے کے واسطے ہمیں پراچینی عہد میں جانا پڑے گا اور مردوں اور عورتوں کے مابین پائے جانے والے فرق کی کہانی کا موازنہ کرنا ہوگا، ان اختلافات کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ مقامِ پیدائش کو کھوجنا ہوگا، طرزِ حیات، تقسیم محنت کے اصول، وظائف زوجیت کے طریقوں اور کنبے کی تعداد میں تبدیلی معلوم کرنا ہوگی۔ گذشتہ چند دہائیوں میں حجری باقیات کی عمروں کے تعین کرنے میں بڑی پیش رفت ہوئی ہے ہ سب کچھ کاربن اور خلیے کی تحقیق سے پتہ چلا ہے۔ جس سے ہماری تفہیم میں بھی اضافہ ہوا۔

کرۂ ارض پر اس وقت بستیاں بننے لگیں جب ۳۰۰ یا ۴۰۰ نفوس کے ایک جتھے نے افریقہ کو چھوڑا اور بحیرۂ احمر کو پار کرلیا۔ یہ کوئی ایک لاکھ برس کے لگ بھگ ہوا۔ اور تقریباً اتنی ہی مدت نوعِ بشر اپنی ابتدائی صورت میں سب صحارا افریقہ میں بسر کر چکا تھا۔ افریقیوں کا یہ جتھہ گاتے ناچتے اور شکار کرتے ہوئے روانہ ہوا۔ اسے آگ سلگانا، رسیاں بٹنا، تختے جوڑ کر پانی پر سفر، نیزے، سویاں اور ظروف سازی بھی آ چکی تھی۔ بسر اوقات کا بندوبست شکار اور تلاش پر منحصر تھا۔ بچوں کی شرح پیدائش کم تھی کیونکہ عورتیں بچوں کو چار سال تک دودھ پلاتیں اور دودھ اترنے کے زمانے میں استقرارِ حمل ممکن نہیں۔ ابتدائی نوع کے بشر مختلف براعظموں میں طول و عرض میں پھیل گئے۔ انہوں نے سابقہ بشر نما انسانوں کی جگہ لے لی اور اپنی نسلی صفات مستحکم کرلیں۔ نوعِ بشر کے آغاز کے متعلق قیاسی نظریہ کہ وہ متعدد خطوں کے تھے بالآخر حل ہوگیا۔ اس خیال پر کہ ان کا آغاز ایک ہی خطے سے ہوا اس کے خلاف نہایت مسکت شہادتیں مل گئیں اور نسلی صفات میں جو اختلافات تھے انہیں بدلتے موسموں، دھوپ کی دستیابی، غذا اور ارضی درجہ حرارت سے منسوب کردیا گیا۔

وظائف زوجیت اور خاندان

نوعِ بشر کو متعدد مراحل سے گزرنا پڑا جس کا تعلق طرزِ حیات سے تھا جن میں ذرائع بسر اوقات اور خوراک کی دستیابی کی شرح کہ جس پر زندگی پنپ سکے اور محفوظ زندگی کی اتنی ضمانت کہ جس میں باقاعدہ افزائش اور پرورش ممکن ہو۔ لوئیس ایچ مارگن کی کتاب Ancient Society (۱۸۸۰ء) اس ضمن میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں موجودہ قدیم سماجوں کا جو دنیا

کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، مطالعہ کیا گیا۔ فریڈرک اینگلز نے مورگن کی کتاب پر ایک ناقدانہ مقالہ بعنوان The Origin of the Family Private Property and State (۱۸۸۴ء) لکھا۔ اینگلز نے نوعِ بشر کی ترقی کا تین مراحل میں خلاصہ کیا:

۱۔ **دورِ وحشت:** یہ ایسا مرحلہ تھا جب انسان تمام اشیا کو فطری حالت میں ہتھیا لیا کرتا اور اسی عادت کا دور دورہ رہا۔ انسانی خلاقی نے جن اشیا کو جنم دیا انہوں نے اس ہتھیانے کے عمل میں بڑھ چڑھ کر دست گیری کی۔

۲۔ **دورِ بربریت:** یہ وہ زمانہ ہے جب انسان نے پالتو جانور کی افزائشِ نسل اور پرورش کرنا اور بونا جوتنا سیکھ لیا اور اس نے ان مساعی کے طریقے سیکھے جن کے ذریعے فطری اشیائے پیداوار کی رسد میں اضافہ کیا جاسکتا تھا۔

۳۔ **تہذیب:** اس عہد میں انسان نے کام کرنے کے ایسے بہتر طریقے سیکھ لیے جن کو قدرتی پیداوار پر آزمایا جائے۔ یہی زمانہ باقاعدہ صنعت اور فن کا ہے۔

جدید ماہرینِ بشریات نے ان زمانوں کو حجری ہتھیاروں کا دور، میان حجری دور اور اُخروی حجری دور کہا۔ حجری دور کا زمانہ ۱۰۰۰۰ ق۔م کا ہے۔ (بیس لاکھ سے دس ہزار سال قبل مسیح تک) جبکہ میان حجری زمانہ ۸۰۰۰ ق۔م پر اختتام کو پہنچ جاتا ہے اور 'اُخروی حجری' دور ۸۰۰۰ سے ۲۵۰۰ ق۔م پر ختم ہوا۔

ان تینوں میں طویل ترین عرصہ عہد وحشت کا ہے یعنی دور حجری کا۔ عہد حجری سے اُخروی حجری تک خاندان تبدیلی کی زد پر رہا۔ قدیم ترین سے جدید زمانے تک چار قسم کے خاندانوں کی شناخت ہوئی جس کے لیے قدیم ترین لوگوں کا مطالعہ کیا گیا ہے:

۱۔ ہم نسبی خاندان (Consanguine Family)

۲۔ Punaluan خاندان

۳۔ جوڑا دار خاندان (Pairing Family)

۴۔ یک زوجیت والا خاندان (Monogamous Family)

ہم نسبی خاندان، خاندان کے آغاز کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں خاندانی دھڑوں کی ان کی نسلوں کے مطابق پرورش کی جاتی ہے۔ زن اور شوہر کا تعلق فوری اور برادریوں کے درمیان قائم

کرنے کے لیے ایک ہی نسل کے مرد اور عورت ارکان ہوتے۔ بندھن ڈھیلا ڈھالا ہوتا۔ اس نسل کے تمام مردوں کی دسترس میں ہر عورت ہوتی۔ واحد اوہامی ممانعت یہ تھی کہ دو نسلوں کے مابین جنسی رشتہ قائم کیا جائے مثلاً باپ بیٹی کے مابین، دادی اور باپ کے درمیان، دوسرا مرحلہ پونالوآن خاندان کا تھا۔ یہاں پر تزویج محرمات کی ممانعت کے دائرے کو پھیلا کر ان بچوں کو شامل کر لیا گیا جن کے والدین یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی اولاد ہو۔ اس کے علاوہ ایک ہی نسل کے چچازاد، خالہ، ماموں، پھوپھی زاد بچے شامل کر لیے گئے۔ جس نے بڑھ کر پدری یا مادری نسل کا سلسلہ دراز کیا اور خاندان کو تقسیم کر کے ایک خلیے تک پہنچا کر چھوڑا۔ ایک ہی نسل کے اندر توالد و تناسل کی بھی ممانعت تھی۔ اگرچہ دوسری نسل کے تمام کزنوں سے رشتے استوار کیے جا سکتے تھے۔

کوئی ۱۰۰۰۰ سال پہلے نوعِ بشر زراعتی طرز کی حیات کے سبب ہندوستان، چین، وادی فرات، نیل کی وادی اور شمال مغربی جنوبی امریکہ میں مستقل بود و باش اختیار کرنے لگی۔ یہ انہی جگہوں پر ہوا کہ پہلی مرتبہ جوڑا خاندان نمودار ہوا اور یہاں سے دریافت ہوا۔ اس خاندانی نظام میں شوہر کی ایک 'ملکہ بیوی' ہوتی۔ خاندان کے کسی دو افراد کے درمیان توالد و تناسل شادی کے ادارے کی وجہ سے تقریباً معدوم ہو گیا کیونکہ اس کی ممانعت کر دی گئی۔ جائیداد، اقتصادیات اور وراثت ان تینوں نے جوڑا خاندان کی ترقی و استحکام میں زوردار کردار انجام دیا۔ کثیر الازدواجی کا رواج تھا لیکن ہر عورت کو متعدد مردوں سے جنس کاری کرنے کی سخت ممانعت تھی (جسے کثیر شوہری کہا جا سکتا ہے) کیونکہ عورت کی عصمت کی حفاظت بچہ جائز ہونے کی ضمانت تھی۔ ملکہ بیوی کو خاندان میں بالادست کردار ملتا تا کہ گھربار کی مناسب نگہداشت ہو۔ وہ قانون قاعدے کی سرپرست ہوتی، ایثار پیشہ اطوار کی مالک ہوتی۔ تاہم اس مرحلے میں جب مرد مرتا تو اس کا ترکہ پھر بھی اس کے نطفے کو ملتا (مراد ہے نرینہ اولاد کو) بجائے تمام اولادوں کے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باپ درست ہے نا کہ ماں۔ کیونکہ عورت اپنے بچوں کے واسطے دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔ اینگلز نے اسی پر کہا 'یہ پوری دنیا میں نسوانی صنف کی عالمی شکست تھی'۔ جائیداد کی ملکیت نے انسانوں کے درمیان سب سے پہلی خلیج پیدا کر دی جس سے یہ لگا کہ عورت کمتر ہے۔ رشتوں کی تحلیل ایک یکطرفہ فیصلہ تھا جو فریقین نے کیا۔ اس جوڑا خاندان نے یک زوجگی کے تصور کو 'میان حجری' کے آغاز میں فروغ دیا جب ۸۰۰۰ ق۔م میں تہذیب اپنے رکھوالے نکال رہی تھی۔ اس کا دارومدار

مرد کی بالادستی پر ہے۔ جس کا واضح مقصد یہ ہے کہ ایسے بچے پیدا ہوں جن کی ولدیت غیر متنازع ہو۔ اس کی یوں ضرورت پڑی کیونکہ بعد میں ان ہی بچوں کو فطری وارثوں کی حیثیت سے اپنے باپ کی جائیداد لینا تھی۔ بیوی اور دبتی چلی گئی، اس پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور شادی کی تنسیخ تب ہی ممکن تھی جب شوہر اس کی اجازت دے۔ یک زوجگی کا نظام صرف عورتوں پر مسلط کیا گیا کیونکہ مرد آزاد تھا کہ وہ داشتائیں رکھے، کنیز رکھے اور چاہے تو جسم فروش عورتوں سے راہ و رسم بڑھائے۔

یوں عورتوں کی حیثیت ہمہ گیر مساوات سے گر کر جو اسے دورِ وحشت میں میسر تھی 'مہذب دنیا' میں زیرِ دست مقام پر آ گئی۔ اس تبدیلی کے تین اسباب ہیں:

۱۔ گذر اوقات کے طریقے، شکار اور تلاش والا سماج

۲۔ افزائشِ نسل پر بے اختیاری

۳۔ بالادستی اور جارحیت

شکاری اور خوراک کی تلاش میں سرگرداں سماج

شکاری اور خوراک کی تلاش کرنے والے سماج کا انحصار زیادہ تر مرد پر ہوتا جو شکار مارتا اور عورت زیادہ تر اشیا کو تلاش کرتی رہتی (مگر یہ بات ایک خاص زمانے تک ہی درست ہے اور وہ بھی صرف کسی حد تک) 'مرد شکاری' اتنی ہی فرضی حکایت ہے جتنی کہ 'جمع کرنے والی عورت' یہ فرضی حکایت اس نکتے پر ٹکی ہوئی ہے کہ مرد اپنے گروہوں کے لیے زیادہ خوراک لے آتا ہے اور اگر وہ بڑھ کر حصہ نہ ڈالیں تو گروہ نابود ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں گھسا پٹا دعویٰ تو یہ ہے کہ شکار والی بھاگ دوڑ مرد کرتا تھا اور عورتیں اشیا جمع کرتیں۔ تمام سماجوں میں دونوں کلیے غلط نکلے ہیں۔

مرد شکاری کی فرضی حکایت کو جب انسانی ارتقا کے مطالعے میں پرکھا گیا تو کئی ضمنی مفہوم آڑے آئے اس کے علاوہ انسانی سماجوں میں بھی ایسی ہی صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔ اس امر پر اکثر ناحق زور دیا جاتا ہے کہ جثہ والے جانوروں کے شکار نے انسانی ارتقا کو دیگر کئی عناصر کے مقابلے میں کہیں زیادہ دھکیلا ہے۔ اس نمونے پر قائم ہونے والے انسانی ارتقا میں صرف مردوں نے گوشت کو حاصل کیا جو انسانی دماغ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے اور امداد باہمی کی صلاحیتیں

جدید انسانی سماج کے لیے کتنی اہم تھیں۔ وضع حمل اور پرورش کرنے کی ذمّے داریوں کی وجہ سے عورتوں کو اکڑوں بیٹھ کر سبزی ترکاری تلاش کرنے والے کم وقعت کام میں الجھا دیا گیا۔ اس نمونہ خیال کے متعدد ناقدین ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز خیال یہ ضمنی مفہوم ہے کہ صرف ایک ہی صنف نسلِ انسانی کے ارتقا کی محرک رہی ہے۔ یہ خیال تو یہ سمجھتا ہے کہ ہر وہ شخص جو چلنے پھرنے کے قابل ہو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ گھاس پات جمع کر سکتا ہے جبکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس طرح فرضی حکایت تو یہ ہوئی کہ جسمانی طور پر وہ شکار پر مائل نہ تھیں اور انہوں نے اشیائے خورد و نوش کو تلاش کرنے کو ترجیح دی۔ اس سے بڑھ کر فرضی حکایت اس کی بھی حامل ہے کہ عورتیں اتنی خوراک جمع نہیں کر پاتیں جتنی مرد کر لیتے ہیں۔ جس کے معنی تو یہ ہوئے کہ خوراک جمع کرنا شکار سے فروتر ہے اور دوسرے درجے پر ہے۔ جبکہ سچ تو یہ ہے کہ جمع کرنا ایک ایسا کام ہے جس میں گہری مہارت درکار ہے۔ اس کے لیے اوزاروں کا استعمال اور نباتات کی سینکڑوں انواع کا علم بھی چاہیے۔ یوں دونوں فرضی حکایات کا انحصار حقیقی صورتِ حال پر نہیں ہے۔ شکار کی سب سے اچھی صورت یہ ہے، جثہ جانوروں کے شکار سے کبھی بھی ۳۰ فیصد سے زیادہ پروٹین حاصل نہیں ہوئے اور ۷۰ فیصد پروٹین جمع کرنے کی مساعی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس قسم کی بھی شہادتیں ملی ہیں کہ عورتوں اور بچوں نے بھی شکار کرنے میں حصہ لیا اور مردوں نے جمع کرنے میں۔

افزائشِ نسل کو کنٹرول نہ کر سکنے کی مجبوری

جب تک دنیا میں 'گولی' نہیں ایجاد ہوئی تھی عورتوں کو اپنی پیداواری مدت پر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ جبکہ مرد نتائج کو نظر انداز کرتے ہوئے جتنی عورتوں سے چاہے جنسی تعلق رکھ سکتا تھا جبکہ عورتوں کو خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ نوعِ بشر کی عورت روئے زمین پر واحد ایسی نوع ہے جس کی شہوت سامنے نہیں آتی اور جس کی بیضہ دانی سے اخراج اچھی طرح مخفی ہے حد یہ ہے کہ خود اس سے بھی۔ دیگر تمام حیوان حیاتیاتی نشانیوں (رنگ، بو یا پھر ایک چیپی) کے ذریعے اپنی بارآوری کا زمانہ ظاہر کرتے ہیں۔ یوں عورتیں اپنے ایامِ حیض کے دوران بھی مجامعت کے لیے نہایت دلکش نظر آتیں۔ بچوں کی پرورش، دودھ کا اترنا اور اشیائے خوراک کی تلاش عورتوں کی آزادانہ سرگرمیوں میں بڑی حد تک مانع ہوتیں جب شکار جمع کرنے والی تہذیب کے زمانے میں وسائل قلیل تھے تو

عورتوں اور مردوں دونوں کو جفاکشی کرنا پڑتی۔ عورتوں کو حدوں سے بڑھ کر۔ جوں ہی تہذیب زراعتی مرحلے میں داخل ہوئی خوراک بکثرت ہونے لگی اور نوعمری ہی سے اجناس نے شیرِ مادر کی جگہ لینا شروع کردی۔ جوں ہی شیرخواری کی مدت میں کمی آئی نسوانی زرخیزی میں کوئی تین گنا اضافہ ہوگیا۔ زندگی کے چکر میں جہاں عورت اوسطاً ۴/ ۵ بچے جنا کرتی اب وہ ۱۰/۱۲ جننے کے قابل ہوگئی۔ طرزِ زندگی کی اس تبدیلی نے عورتوں کو تولیدی اور تخلیقی رتبے سے اتار کر قریب قریب بچوں کی دیکھ بھال اور خانگی ذمّے داریوں کے پھیر میں ڈال دیا۔ اقتصادی سرگرمیاں سب کی سب تقریباً مرد کے دائرہ عمل میں چلی گئیں جس کے نتیجے میں عورتوں کو ایک اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

بالادستی اور جارحیت

'ایک عورت، کتے اور اخروٹ کے درخت کو تم جتنا مارے جاؤ گے اتنے ہی وہ سدھرتے جائیں گے۔'

(تھامس فلر (۱۶۰۸۔۱۶۶۱ء) برطانوی پادری

نوعِ بشر اس دھرتی پر وہ واحد ہستی ہے جس نے اپنی ہی نسل کو قتل کرنے میں لاثانی امتیاز حاصل کیا ہے۔ اگر خردی سطح پر دیکھا جائے تو جارحیت کی جڑوں میں آپ جنسیاتی حسد پائیں گے۔ اُخروی حجری عہد میں کروڑوں برس تک مردوں اور عورتوں کو جنسی تعلق کی بے حد وحساب سہولت میسر تھی اور بلا کسی دعوے دار کے۔ حسد کا نمودار ہونا عورت پر ملکیتی حقوق کو مسلمہ امر مان لینے کا نتیجہ تھا تاکہ بچوں میں پدری نطفے کا تسلسل رہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام جارحیتوں کا مقصد وسائل میں اضافے کی خواہش رہا ہے۔ چاہے یہ زرخیز وادیاں ہوں، نودریافت سونے کی کان پر اژدہام یا پھر پیٹرول کے حصول میں سبقت۔ بڑی فوجوں کے ساتھ لشکرکشی نے، جن میں مردوں کی منظّم افواج کے حصہ لینے نے، عورتوں کی حیثیت کو مزید نیچے کرکے ثانوی حیثیت دے دی اور عورتیں فاتحین کے لیے مالِ غنیمت میں شمار ہونے لگیں۔

اقتصادی نظام کو مستحکم کرنے کی غرض سے پدری وراثت کو اختیار کیا گیا۔ عورتوں کو نہ صرف جسمانی طور پر زیر کیا گیا بلکہ فکری طور پر بھی تاکہ نظام چلتا رہے۔ چاردانگ عالم میں پھیلا ہوا یہ خیال کہ عورت جسمانی اور فکری طور پر ادنیٰ ہے مقدس دستاویزات کے لیے اساسی پتھر ثابت

ہونے کے علاوہ نیچرل مفکرین کے ذہنوں میں بھی سمایا رہا۔ یہاں تک کہ ڈارون نے اپنی کتاب (Descent of Man) میں یہ تبصرہ کیا:

'دونوں اصناف کی فکری قوتوں میں مابہ الامتیاز چیز یہ ہے کہ مرد جس چیز کو ہاتھ میں لے لیتا ہے چاہے وہ افکار عالی ہوں، استدلال یا بات تخیل کی ہو یا پھر محض انسانی ہاتھوں کے لمس کے استعمال کا معاملہ ہو، وہ اس کو رفعت کے مقام تک لے جاتا ہے۔'

گو کہ میں ایک ڈھیٹ قسم کا ڈارون کا عاشق ہوں۔ اس کے باوصف میں نے نہایت سنجیدگی سے عورت کی کمتری کے متعلق ڈارون کی تعلیمات سے اختلاف کیا ہے۔ ڈارون نے یہ بھی تبصرہ کیا تھا کہ بطور شادی شدہ مرد کے میری حیثیت 'ایک غلام جیسی جو حبشی سے بدتر ہوتا ہے' کی ہوگی۔ پھر اسے یادِ ماضی مغلوب کرلیتی ہے 'کوئی بھی تنہائی کی زندگی نہیں بسر کرسکتا بالخصوص ناتواں کر دینے والے بڑھاپے میں۔ جب وہ دوستوں اور بچوں کے بغیر دوسرے لوگوں کے چہرے کو گھورنے والا رہ جاتا ہے۔' ڈارون اپنی گفتگو کو فلسفیانہ پیرائے میں سمیٹتا ہے 'ہاں ہمیں انگنت خوش و خرم غلام ملتے ہیں۔' اور تھوڑے عرصے بعد اس نے شادی کرلی۔ ڈارون کے خیال میں زیادہ تر انواع کی بالغ مادائیں دونوں اصناف کے بچوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس دلیل اور دیگر شہادتوں کی بنیاد پر وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ ارتقائی طور پر مرد ہر حال میں عورتوں سے آگے جاچکے ہیں۔ اس معاملے میں ڈارون کو ہم عصر فطرتیت پسندوں اور ماہرینِ بشریات سے حمایت ملی جن میں نمایاں اور ممتاز پال بروکا (۱۸۲۴۔۱۸۸۰ء) بھی شامل ہیں۔

مذکورہ نتائج کو از سرِ نو جانچنے سے جب یہ لگتا ہے کہ جیسے مادائیں کم ذہین ہوں۔ تو اس سے دستیاب شہادتوں میں فاش غلطیاں نظر آئیں جن سے عورتوں کی کمتری ثابت ہوتی اور اسی طرح ارتقائی نظریے کے اہم گوشوں میں بھی۔ ایلین مارگن نے یہ استدلال کیا کہ علمِ حیاتیات جس میں عورتوں کی کمتری کو نقش کر دیا گیا تھا اسے مرد ہی پڑھاتے تھے۔ یہ بھی کہ مفکرین اس معاملے میں مائل اس پر رہے ہیں کہ 'حیاتیات اور ابتدا' کے پورے اہم موضوع میں سے ہوا کی طرح گذر جائیں اور وہ گذر بسر کے لیے حصولِ اشیا میں دونوں اصناف کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کرتے رہے جن میں بچوں کی پرورش سے لے کر اوزار اور ظروف سازی بھی شامل ہے۔ اگرچہ کوئی بھی ارتقائی

حیاتیات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ جس میں جنگلی ورثہ، آدمی کے ارتقا، شکار اور گوشت خوری نے انسانی فکر میں اس گہرائی سے جڑیں پکڑلی ہیں جتنی انجیل کے بابِ پیدائش نے۔ ارتقا کو سیاسی، معاشی اور سماجی ترقیات کے پس منظر میں ازسرِنو جانچنا چاہیے۔ دنیا کی تمام جامعات میں خواتین کے داخلوں کی تعداد سے شاید ان لوگوں کے ذہن روشن ہو جائیں جواب بھی عورتوں کی کمتری پر یقین رکھتے ہیں۔ جوں ہی عورت کو مرد سے مسابقت کا موقع ملا اس نے کئی شعبوں میں اپنی برابری ثابت کردی۔ جدید عہد میں عورتوں کی سربلندی آسمان سے نہیں ٹپکی۔ اس کا دارومدار اس کی جینیاتی ساخت میں پوشیدہ ہے۔

عورتیں، جنس اور محبت

پوری تحریری تاریخ سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے عہد تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورتوں میں جنسی جذبات سرے سے نہیں ہوتے یا کم از کم اس قسم کے احساسات نہیں ہوتے جیسا کہ مردوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک ممتاز ماہرِنفسیات ہیولاک ایلس، لارڈ ایکٹن کے قول کو یوں دہراتا ہے۔ لارڈ صاحب اپنے عہد کی ایک ممتاز ادبی شخصیت اور سند تھے انہوں نے اس مجوزہ امر کی ملامت کی کہ عورتوں میں جنسی خواہشات نہیں ہوتیں۔ 'یہ ایک شرمناک اتہام ہے۔' ان دنوں جو بے شک اب گذر چکے ہیں، لیکن اب عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورتیں بھی جنسی ہیجان کے نقطۂ عروج تک پہنچتی ہیں۔ کنزے نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ ۹۰ فیصد عورتیں مجامعت میں بہت خوشی محسوس کرتی ہیں اور ۱۴ فیصد مردوں کے برعکس متعدد مرتبہ ہیجانی عروج تک پہنچتی ہیں۔ ماسٹر اور جانسن نے کنزے کی تحقیقات کی توثیق کی ہے۔ تاہم بغیر عروج تک پہنچے بھی جنسی جذبات کے ابھار سے بھی عورتوں کو بہت مزہ آتا ہے اسی طرح سماجی طور پر جنسی تعلقات کا بھی اثر ہوتا ہے۔ جری ڈاکٹر میری اسٹوپس جو زنانہ جنسیت کی مدافعت میں غضبناک بے خبری اور تعصبات سے چومکھی جنگ لڑتی رہی اور مال کار اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے سب کچھ پتہ چل چکا ہے۔ اس نے تمام حدود پھلانگ کر اپنے خاوند کو ایک دستاویز پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ جس میں اسے یہ اختیار دیا گیا کہ محض صحت اور صفائی کے نقطۂ نظر سے وہ کسی اور ذریعے سے بھی جنسی ضروریات پوری کر سکے گی اگر کبھی شوہر موصوف اس کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہو۔

سگمنڈ فرائیڈ کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر آپ نسوانیت کے متعلق کچھ مزید جاننا چاہتے ہیں تو آپ اپنے تجربات ہی کو کھنگالیں یا پھر شاعروں سے رجوع کریں یا پھر اس وقت کا انتظار کریں جب سائنس آپ کو زیادہ بنیادی اور مربوط معلومات مہیا کرے۔

حیوانی اطوار سے متعلق ہمیں جو بھی شہادتیں دستیاب ہیں وہ اسی نتیجے کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ جنسی جذبہ ایک باہمی معاملہ ہے اور یہ بھی کہ دونوں اصناف کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اور دونوں ہی اسے فرو کرنے پر مجبور ہیں اور دونوں کو جوڑا کھانا پڑتا ہے جو اسے بجھانے کے لیے لازم ہے۔ دونوں اصناف عورتوں اور مردوں میں جو ہارمون جنس کا محرک ہے اسے ٹس ٹسٹی رون کہا جاتا ہے۔ یہ مردوں کے خصیوں میں سے بڑی مقدار میں خارج ہوتا ہے اور عورتوں کی کلوی جھلی سے نسبتاً کم مقدار میں نکلتا ہے۔ لوگ خوش ذائقہ غذا اس لیے نہیں کھاتے کہ کہیں مر نہ جائیں نہ ہی وہ جنس کاری اس لیے کرتے ہیں کیونکہ نسلِ انسانی کی بقا کے لیے ضروری ہے، نہ ہی عورتیں بچوں کو اس لیے تھپتھپاتی ہیں کہ یہ سرگرمیاں مسرت انگیز ہوتی ہیں۔

تمام بشرنما حیات میں عورتوں کو چھوڑ کر ساری مادہ مخلوق جنس کاری کے لیے ہر آنے والے سے تقاضا کرتی تھی اور اپنے شکار کا اس وقت تک تعاقب کیا جاتا جب تک مطلب براری نہ ہو جائے۔ نوعِ بشر کی عورت مرد کے انتخاب کر لینے کے بعد محبت، رفاقت، تجربہ، تجسس، تحفظ، گھر اور کنبہ چاہتی ہے، اسے آپ اس کی تمکنت جانیئے یا مرد کی آغوش میں لینے کی مسرت۔ اس کے باوجود ایک بنیادی عدم توازن موجود رہتا ہے جو مردانہ ہوس کی عجلت اور عورت کی دھیمی خواہش میں رہتا ہے یوں جب معاملے میں کرکراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے تو دوسری عورت ہمیشہ اس بازار میں دستیاب ہوتی ہے۔

جیسا کہ بشرنما انسانوں کے نمودار ہونے کے زمانے اور دورِ وحشت میں دیکھ چکے ہیں۔ ان دنوں میں ہم نسبی خاندانی نظام میں جنس بے حد و حساب دستیاب تھی۔ مرد اپنی آرائش اور زیبائش کے لیے بڑے جتن کرتے ہیں ہمہ اقسام رنگوں کے علاوہ ہڈیوں کے زیور پہنتے، مقابلوں میں اپنی قوت دکھاتے اور ماداؤں کو متوجہ کرنے کے لیے گوشت کا تحفہ دیتے۔ یہ مادہ کا صوابدید تھا کہ متعدد دستیاب مردوں میں سے کسی کا انتخاب کرلے۔ جنسی جرائم اور جماع بالجبر معاملہ بندی میں ابھی نہیں داخل ہوئے تھے کیونکہ یہ دونوں جمعیتی زندگی کو بری طرح غیر مستحکم کرسکتے تھے جس کے وجود کو اس طرح پروان چڑھایا گیا تھا کہ وہ خود کو آدم خور شکاریوں اور قدرتی مظاہر سے محفوظ رکھ سکے

نہ کہ ایک دوسرے سے۔ قبیلے کو محفوظ رکھنے کے واسطے متحد رہنا پڑتا۔ جنسی جرائم اور جماع بالجبر بعد کے مرحلے میں نمودار ہوئے۔ جب چند مرد فالتو دولت کے ساتھ ناروا طریقے سے اپنی خدمت کے لیے بہت سی عورتیں اور جھگڑے کے وقت اور حصولِ وسائل کے لیے قبائلی جنگ کے زمانے میں اراضی، مویشی اور عورتوں پر قابض ہو گئے۔ اس سے پہلے قبائل یا گوت کے اندر خواتین پر تشدد کی حرام باتوں کی طرح سخت ممانعت تھی جیسے دیگر ممانعات کی۔ اس کا بشر نما انسانوں یا ابتدائی عہد میں کبھی زیادہ رواج نہ تھا۔ زراعتی عہد میں عورتوں کے مدارج میں کمی ہونے کے ساتھ عورتوں پر تشدد کے تواتر میں اضافہ ہونے لگا اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ چند تمدنوں نے الہامی کتب کے ذریعے اسے ادارے کی شکل دے دی۔ خدا نے حوا سے کہا (پیدائش ۱۶:۳):

میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی۔ اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی۔ اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'

مستقبل میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بالا دستی اور جارحیت کا رویہ اگر مرد کی حیثیت، مقبولیت اور بقا میں کسی بہتری لانے میں ممد نہ ہوا تو اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ مذکورہ دونوں اوصاف سے اسی طرح نجات حاصل کر لے جیسے کبھی اس نے اپنے جسم پر اگنے والے پشمینہ والے غلاف سے پیچھا چھڑا لیا تھا جب وہ لنگور سے آدمی بننے کے مرحلے سے گذر رہا تھا۔

میرے نزدیک جنسی تشدد کی جبلت اعلیٰ ترین ممالیہ جانوروں کی تخلیق کے ابتدائی نقشے کا حصہ نہ تھی۔ شاید یہ کئی اور داغوں میں سے ایک داغ ہے جو ہمیں یاددہانی کراتا رہتا ہے کہ جب ہمارے خلیے کی جین متعین ہو رہی تھی تو اسے ہماری بقا کی خاطر، امداد رخصت ہوتے ہوئے تسلیمات بجا کر یوں ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ انسان میں کوئی کجی نہیں ہے۔ خدا کے علم میں ہے کہ یہ عورت کی بھی غلطی نہیں ہے۔ ممکن ہے ہمیں طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑے تب کہیں جا کر اس اضطراری مسئلے کا حل ملے۔ شہادت تو یہ کہتی ہے کہ مرد کی فطرت میں جو تشدد ہے وہ بتدریج انحطاط پذیر ہوگا۔

ہم عشق کا ایسا ظہور دیکھتے ہیں جو جنسکاری سے عاری ہوتا ہے تو اس کا اس سے کچھ تعلق ہوا؟ ماں اور بچے میں ایک بندھن ہوتا ہے جو لنگوروں میں بلوغت تک جا سکتا ہے۔ ایک مردانہ بندھن بھی ہوتا ہے جو مردوں کو کھیل کے میدانوں میں دستے کی صورت میں بدل دیتا ہے یا پھر فوج میں۔ اسی طرح زنانہ بندھن بھی ہوتا ہے جو عورتوں کے مل جل کر گروہوں کی صورت میں زنانہ

اجتماعات کا باعث ہوتا ہے بڑی حد تک یہ بندھن تشویش اور جارحیت میں تخفیف لانے کے علاوہ باہمی اعتماد پیدا ہونے کے ساتھ باعثِ سکون ہوتا ہے۔ عشق اور جنس کاری کے مراسم کا لازم وملزوم ہونا کوئی نئی رومانی دریافت نہیں ہے۔ یہ انتہائی ابتدائی مرحلے پر شروع ہو چکا تھا اور یہ محض عورتوں تک ہی محدود نہ تھا کہ جب لنگور نے اپنی مادہ کو اپنے بازو میں کس کر اسے چوما تھا۔ یہ محض جنسی چھیڑ چھاڑ نہ تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ مسمات کہیں ڈر نہ جائے۔ کیونکہ جب کوئی ماں اپنے شور غل مچانے والے بچے کو چومتی ہے تو اس میں چاؤ اور شیفتگی بھی ہوتی ہے۔ عورت کے لیے سلوک کا سارا انعام تحفظ مسرت اور خوش وخرم کرنے کی آرزو کی شکل میں بام عروج پر پہنچتا ہے اور یہی رفیقوں کی طرح ساتھ رہنے والوں کے لیے اوج کا درجہ ہے۔

عورتیں، ایثار پسندی اور ضابطۂ اخلاق

یہ موسم گرما ۱۹۹۱ء کا ایک دن تھا کراچی میں تین جوان عورتیں جو ایک ہی منزل پر میرے فلیٹ کے قریب رہائش رکھتی تھیں پکنک کی غرض سے پیراڈائز پوائنٹ گئیں۔ ان میں سے دو کہنہ مشق تیراک تھیں اور سب میں کم عمر نومشق تھی۔ ان میں سے دو زیادہ عمر والی ایک ٹیلے پر بیٹھ کر تیسری نوعمر لڑکی کو دیکھ لیتیں جو کبھی پانی میں چلتی کبھی ساحل پر کھیلنے لگتی۔ ناگاہ انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک بہت بڑی لہر لڑکی کی طرف چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے فوراً سمندر میں غوطہ لگایا اور لڑکی کو سہارا دے کر ٹیلے پر چڑھنے میں مدد کی۔ ٹھیک اسی لمحے اس سے بھی بڑی ایک اور لہر آئی اور دونوں لڑکیوں کو نگل گئی جن کی لاشیں چند گھنٹوں کے بعد ملیں۔ یہ ایک مصدقہ خبر ہے کیونکہ سب سے کم عمر عورت کراچی کے کسی انگریزی اخبار کی نامہ نگار تھی۔

انسانی برتاؤ کے نظریۂ ارتقا پر یہ کہہ کر یہ اخلاقیات سے عاری ہے ان حلقوں نے بہت ڈانٹ پھٹکار کی جو نظریۂ تخلیق کے پیرو ہیں اور مذہبی عالم ہیں۔ یہ بھی کہ انسانی اطوار کا انحصار حواس کی خبروں اور متواتر آزمائشوں پر ہونا، بقا اور تولید کی بنیاد پر ہے۔ یہی ناقدین نظریۂ ارتقا کی سماجی تفسیر، سماجی ڈارون ازم اور بقائے اصلح کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ وہ نہ جانے کیوں تمام انواع میں پائی جانے والی صفت 'ایثار پسندی' کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ جرثوموں میں بھی ہوتے ہیں جو ہماری گندی نالیوں میں ملتے ہیں۔ بشر نما کی تمام

مادائیں اور ثروی مخلوقات اپنے مفادات کو ایثار کردینے کی خوبی سے مالامال ہیں۔ یہ اپنی حیثیت کو خطرے میں ڈال کر (اور کبھی کبھی زندگی کو بھی) اپنے بچوں اور دیگر قرابت داروں کے مفاد کو پروان چڑھاتی ہیں یا حفاظت کرتی ہیں۔

تمام اقسام کی انواع میں قرابت داروں کا انتخاب ایک مشترک شعار ہے جن میں ثروی حیوانوں (primates)، مچھلیاں، رینگنے والی حیات اور انسان بھی شامل ہیں۔ قرابت دار کی تلاش میں اسی قبیلے کے افراد کی برائے بقا مدد کی جاتی ہے تاکہ وہ پھلیں پھولیں۔ انسانوں میں اس مظہر کو اقربا پروری کہا جاتا ہے۔ جسے جدید مہذب معاشرے میں اب ناپسند کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ امر انتہائی تواتر سے دیکھنے میں آتا ہے خصوصاً مختلف ثقافتوں اور مختلف نسلوں والی جمعیتوں میں۔ ایثار پسندی اور قرابت داری کا انتخاب دونوں ہی ہمارے برتاؤ کی تہہ میں جینیاتی طور پر پیوستہ ہیں۔

ان اوصاف کو انسانی اخلاق کی اساس میں ہونا چاہیے کیونکہ ان سے انسانی مقاصد کو فروغ ملتا ہے۔ اخلاقیات ایک سرگرمی کو کہتے ہیں نہ کہ افکارِ عالیہ کے اظہار، فلسفہ یا آیاتِ ربانی کی تعلیمات کو۔ اس کا وجود سقراط اور ابراہیمؑ سے بہت پہلے بھی تھا۔

عورتیں اور ماحول

ڈارون کا خیال تھا کہ تمام انواع ایک دن ناپید ہو جائیں گی اور ان کی جگہ نئی والی لے لیں گی۔ شاید یہ درست ہے۔ ایک زمانے میں ڈائنوسار کی ایک عرصے تک حکومت رہی ہے۔ ان میں سے آخری ساڑھے چھ کروڑ سال پہلے مرا تھا۔ وہ اس وجہ سے مرکھپ گئے کیونکہ ہماری دھرتی ان کی طرزِ بود و باش کو نہ سہار سکی۔ بے مہابا صنعت کاری اور کاربن کے مسلسل اخراج نے گذشتہ سو سال میں موسمی تبدیلی کو مہمیز لگائی۔ ٹیکوں کی ایجاد اور دیگر حفظانِ صحت کے اقدامات نے دنیا کی آبادی کو گذشتہ پچاس برس میں دوگنا کر دیا۔ خواتین پہلے ہی ماحولیات اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریکوں میں نسبتاً بڑا کردار ادا کر رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہر تحریک برائے امن میں یہ ہراول دستہ ہوتی ہیں کیونکہ ان کے نقطہ نظر سے مستقبل شناسی میں عسکریت سخت مزاحمت کرتی ہے۔

کولمبیا کے ہسپانوی نژاد اور نوبل انعام یافتہ ناول نگار گبریل گریشیا مارکیز کو اپنے جائزے

میں انسانیت کی بقا کے لیے صرف ایک ہی راستہ نظر آتا ہے جو اس نے 'ٹائم' (خزاں ۱۹۹۱ء) کے شمارے میں بیان کیا تھا:

> 'وہ واحد نظریہ جو انسانیت کو ۲۱ ویں صدی میں محفوظ رکھ سکتا ہے یہ ہے کہ خواتین دنیا کا نظام سنبھال لیں۔ میری دانست میں مردانہ بالادستی کے تحت دس ہزار سال کا موقع برباد کیا جاچکا ہے...... اقتدار کے مردانہ ڈھانچے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ماحولیات کی بربادی کی مزاحمت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ اپنے مفادات پر حاوی آنے سے قاصر ہے۔ جبکہ دوسری جانب خواتین کے لیے ماحولیات کا تحفظ ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اقتدار کی یہ ادل بدل زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔'

لب لباب

فرائڈ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ کہا کہ وہ یہ سمجھنے میں کامیاب نہ ہوسکا کہ 'خواتین کیا چاہتی ہیں۔' میرے خیال میں اس نے سوال ہی غلط اٹھایا اس کا کہنا اتنا ہی مبہم تھا جیسے کہ یہ کہا جائے کہ 'مرد کیا چاہتے ہیں۔' فرائڈ 'گولی' کی ایجاد سے کوئی دس برس پہلے مر گیا جب یہ برطانیہ میں متعارف کرائی جارہی تھی۔ اگر وہ جیتا تو وہ جواب کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے روس اور سیکنڈے نیوین ممالک میں عورتوں کی حیثیت اونچی ہوتی جارہی ہے۔ جہاں تک ان کی شرکت پیشہ ور کاموں میں، سول ملازمتوں، کاروباری منیجروں، افواج میں ہے تو ان کی تنخواہیں مردوں کے برابر ہوچکی ہیں۔ تبدیلی کی اسی رفتار سے عورتوں میں زرخیزی کی شرح بھی گھٹ رہی ہے یوں اب اکلوتی خاتون اور اکیلی ماں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اب یہی مظاہر یورپ اور جاپان میں دیکھنے میں آرہے ہیں۔

شاید مارکس نشانے کے قریب پہنچ چکا تھا جب اس نے کہا کہ عورتوں کا مرتبہ اس وقت برابر ہوگا جب سرمایہ داری کو زوال ہوگا اور جیسا کہ اس میں بہتری کا آغاز سامراج کے زوال سے شروع ہوا تھا۔ عورت اسی طرح کوئی 'معمہ' نہیں ہے جیسے کوئی مرد۔ ارتقا نے ان کا انجام کئی امور میں یکساں طے کر دیا ہے اور چند ایک میں مختلف۔ یہ بھی سچ ہے کہ کرکٹ کی گیند کو ایک مرد عورت کے مقابلے

میں کہیں دور پھینک سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک صداقت ہے کہ ایک عورت مرد کے مقابلے میں کہیں بہتر ابلاغ اور معلّمی کر سکتی ہے۔ ارتقا نے یہ بھی طے کر دیا کہ صرف عورت ہی کو سنِ یاس کا سامنا ہوتا ہے۔ کسی اور ثدی حیوان میں یہ صفت نہ ہوگی جس کی وجہ سے ان میں پیداواری عمل اور بچوں کی پرورش آخر تک جاری ساری رہے گی۔ بلاشبہ یہ عورت پر ایک عظیم نوازش ہے کہ وہ بچوں کی پرورش کو پرے رکھ کر دیگر سرگرمیوں میں شریک ہو سکتی ہے۔ سنِ یاس کے ارتقائی نمود کا سبب ڈھونڈتے وقت صرف یہ مفروضہ ملتا ہے کہ مل جل کر پورا قبیلہ نہ کہ کوئی فرد دستیاب ماداؤں کے وجود سے کم وبیش متمتع ہوتا جو اگرچہ بانجھ ہو کر ایک پختہ سن والا صحت مند بڑھاپا بسر کر رہی ہوتیں۔ یوں کہیے یادوں اور ایسا طریقہ جو دوسری انواع پر منطبق نہیں ہوتا اور ہمارے علم میں ہو دڈا یا نانئیں بھی ان کے لیے مفید تھیں۔ جہاں تک اس معاملے میں میری سمجھ کام کرتی ہے کہ ان کی افادیت بطور دانش مندی کا مرقع ہونے میں ہے اور چونکہ ان سب کا تعلق خصوصاً زنانہ ہنر سے ہوتا ہے یعنی گود والے بچوں کی دیکھ بھال سے۔ ان دنوں طبیبوں، نرسریوں اور ہیلتھ وزیٹرز کی خدمات نہیں ہوتی تھیں۔

اب شادی پر کیا کہا جائے۔ جیسا کہ فائراسٹون نے پراندوہ انداز میں کہا ہے 'ہر کہہ ومہ شادی کی قلعی کھولتا رہتا ہے مگر ہر ایک کا خاتمہ بالخیر شادی ہی پر ہوتا ہے۔' متضاد صنفوں کے دو افراد کا مستقلاً یکجا رہنا اور ایک دوسرے کو نیچا نہ دکھانا بہت دشوار ہے۔ لیکن یہ اتنا ہی کٹھن ہے کہ کوئی اپنی ہی صنف کے ساتھ رہے یا پھر والدین کے ساتھ یا پھر جمعیت میں۔ جمعیت میں قیام کی ناکامیوں کی داستان اتنی ہی طویل ہے جتنی ناکام شادیوں کی اور کسی خالی اپارٹمنٹ میں رہنے کی سعی دونوں سے زیادہ جان لیوا ہے۔ مرد بارہا اس کے شاکی رہے ہیں کہ شادی نے ان کا کباڑہ کر دیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس ادارے کو صرف عورتوں نے ہی نہیں بنایا۔ مردوں کی جنسی احتیاجات عین ممکن ہے مقابلتاً زیادہ ہوں لیکن نفسیاتی طور پر احساسِ تحفظ، سماجی قبولیت اور پُرلطف دیکھ بھال کی ضرورت شادی کے ادارے کو دیر تک قائم رکھے گی۔

عورت کی 'اپنی کہانی' میں چونکہ پہلی مرتبہ اس کی انگلیاں جینیاتی ٹریگر تک پہنچی ہیں اس لیے کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کس سمت میں جا رہی ہے۔ سقراط کو البتہ ڈر تھا کہ 'عورت کو ایک مرتبہ اگر مرد کے ہم پلہ بنا دیا گیا تو مرد پر اس کی بالادستی اٹل ہے۔' (سقراط ۴۷۰۔۳۹۹ ق۔م)

حقوقِ نسواں کی عالمی تحریک: ایک اجمالی جائزہ

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد *

خواتین کی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد تاریخ کے ایک طویل دورانیے پر پھیلی ہوئی ہے۔ صدیوں پر محیط اس جدوجہد کو ایک مضمون میں تو کیا کسی ایک کتاب میں بھی سمیٹنا کارِ دارد ہوگا۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون میں اس جدوجہد کے محض چند نمایاں پہلوؤں ہی کی طرف اشارہ کیا جاسکے گا۔ موضوع کی تہہ در تہہ تفصیلات اور دنیا کے مختلف ممالک کے مقامی حالات کے تناظر میں خواتین کی تحریکوں کے تجربات کے جائزے کے لیے ظاہر ہے کہ ایک زیادہ مفصل تحریر کی ضرورت ہے۔

حقوقِ نسواں کی عالمی تحریک کے بارے میں غور کرتے وقت یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہاں خود 'عالمی تحریک' کا مفہوم کیا ہے؟ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہاں 'عالمی تحریک' سے مراد کوئی ایسی تحریک نہیں ہے جو کسی ایک پروگرام، ایک تنظیمی ڈھانچے اور کسی ایک یا چند قارئین کی رہنمائی میں چل رہی ہو۔ خواتین کی 'عالمی تحریک' کوئی منظّم اور باہم مربوط تحریک نہ کبھی تھی اور نہ ہے، بلکہ جس چیز کو عالمی تحریک قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل مختلف خطوں میں اور مختلف معاشرتی تناظرات میں چلنے والی تحریکیں ہیں جن سے مرتب ہونے والے مجموعی تاثر ہی کو ایک عالمی تحریک قرار دیا جاتا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض دیگر عوامل نے بھی خواتین کی جدجہد کو ایک عالمی کردار فراہم کیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں عورتوں کے استحصال کے اسباب بڑی حد تک یکساں رہے ہیں۔ اس استحصال کی شکلیں اور مظاہر بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خواتین کا مسئلہ یا مسائل بڑی حد تک عالمی نوعیت کے حامل رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی جدوجہد چاہے وہ ٹکڑوں کی شکل میں رہی ہو یا اس میں تسلسل کا فقدان رہا ہو، اپنے مجموعی تاثر میں ایک عالمی تحریک ہی نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق سے قطع نظر پچھلے تیس پینتیس برسوں میں دنیا میں بعض ایسے اقدامات ہوئے ہیں اور ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جنہوں نے خواتین کی، مختلف علاقوں میں ہونے والی جدوجہد کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے اور ایک خطے کی خواتین کو دوسرے خطوں کی خواتین کے تجربات سے استفادے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مثلاً ایک بہت اہم پیشرفت تو خود اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم سے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ہوئی جب ۱۹۷۵ء کو خواتین کا عالمی سال قرار دیا گیا۔ نیز ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کے عرصے کو خواتین کے عشرے کے طور پر منانے کا اعلان ہوا۔ اس عشرے میں اقوامِ متحدہ کے ایما پر دنیا کے مختلف ملکوں میں کانفرنسوں کا انعقاد ہوا، بڑے پیمانے پر لٹریچر شائع ہوا اور ان سب کے وسیلے سے خواتین کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔ اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کی نیروبی اور میکسیکو میں ہونے والی کانفرنسوں نے آئندہ ہونے والی اجتماعی سرگرمیوں کا راستہ کھولا۔ ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی اور پھر ۲۰۰۰ء میں 'بیجنگ پلس فائیو' کے نام سے ایک اور کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اقوامِ متحدہ ہی کے زیرِ اہتمام خواتین کی کانفرنسوں میں 'ہزار سالہ ترقیاتی مقاصد' (Millenium Development Goals) کا تصور اجاگر ہوا اور اس عنوان سے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے علاوہ دیگر کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں۔

اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم کے تحت ہونے والی خواتین کی تحریکی اور تنظیمی سرگرمیوں میں رابطوں کی جو اہم شکلیں وضع ہوئیں ان کے علاوہ ایک اور اہم پیشرفت ورلڈ سوشل فورم کے تحت ہوئی۔ ورلڈ سوشل فورم عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کے رجحان میں آنے والے اس زبردست ابھار کا ردِعمل تھا جو ۱۹۹۰ء کے عشرے سے شروع ہوا اور ابھی تک جاری ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس جدید تر دور میں عالمی سطح پر جس قسم کے معاشی اور سیاسی تضادات اجاگر ہوئے اور خود ترقی یافتہ ملکوں کے اندر بھی معاشرے کے پچھڑے ہوئے حلقوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی، اس نے سینکڑوں سماجی و سیاسی تنظیموں، ٹریڈ یونینوں، این جی اوز وغیرہ کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہونے کی راہ دکھائی۔ خواتین کی تنظیمیں بھی اس پلیٹ فارم کا حصہ بنیں، چنانچہ پچھلے ایک عشرے میں ورلڈ سوشل فورم ایک قابلِ ذکر عالمی پلیٹ فارم بن کے ابھرا ہے۔

فورم کے دائرہ کار، اس کی اثر پذیری اور کارکردگی کے حوالے سے ایک سے زیادہ آراء پائی

جاتی ہیں، تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے مختلف ملکوں کے اداروں اور تنظیموں کو آپس میں مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کے ایسے مواقع فراہم کیے ہیں جو اس سے پہلے میسر نہیں تھے۔

اقوامِ متحدہ اور ورلڈ سوشل فورم کے پلیٹ فارموں کے علاوہ ایک اور چیز جس نے خواتین کی تنظیموں کو اور ان کی مختلف علاقوں میں جاری جدوجہد کو جوڑنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے وہ انٹرنیٹ کی سہولت ہے جس نے دنیا میں اطلاعات کا ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے بین الاقوامی رابطے مضبوط ہوئے ہیں اور خواتین کے مؤثر نیٹ ورک وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ عورتوں کا استحصال اب کوئی مقامی مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ استحصال کے ہر واقعے پر دنیا بھر سے آوازیں اٹھتی ہیں اور کمپیوٹر کی اسکرین سے نکل کر یہ احتجاج سڑکوں اور بازاروں تک آ جاتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑی پیشرفت ہے اور سمجھدار لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں عوامل کے نتیجے میں ایک بہت اہم چیز ابھری ہے اور وہ ہے خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق کا ایک عالمی تصور (International Perspective)۔ اب خواتین کی کوئی عالمی تحریک، تنظیمی شکل میں موجود ہو یا نہ ہو، یہ عالمی تصور بجائے خود بڑی اہمیت کا حامل ہے جو خواتین کو عالمی سطح پر ایک وحدت میں بھی پروتا ہے اور مستقبل میں ان کی اجتماعی کوششوں کے لیے راہوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

خواتین کے حقوق کے عالمی تصور کی پشت بانی اور اس کو علمی سطح پر مستحکم کرنے کا کام اس علم اور تحقیق نے کیا ہے جو خاص طور سے گذشتہ تیس چالیس برسوں میں سامنے آئی ہے۔ اس علم اور تحقیق کی اصابت کا نتیجہ ہے کہ صنفیت (Feminism) کو اب بجائے خود سماجی علوم کی ایک اہم شاخ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور دنیا کی شاید ہی کوئی بڑی اور اچھی یونیورسٹی ہو جہاں صنفیت کو ایک مضمون کے طور پر نہ پڑھایا جاتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ اچھی جامعات میں اس مضمون کے لیے باقاعدہ شعبے یا تحقیقی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون مستقل گہرائی کا حامل بنتا جا رہا ہے، اس کے نت نئے نصاب بنائے جاتے ہیں، اس کی تدریس کے لیے بہتر سے بہتر ماڈیول تیار کیے جاتے ہیں۔ نیز اس مضمون کے حوالے سے تحقیقی مجلّے شائع کیے جاتے ہیں اور یہ انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اب

صنفیت کا مضمون صرف طالبات کے لیے ہی نہیں بلکہ طلبا کے لیے بھی دلچسپی کا حامل بن گیا ہے۔

عالمی اور مقامی سطحوں پر خواتین کے حقوق کے شعور کو بیدار کرنے والی علمی سرگرمیوں نے خواتین کی عملی جدوجہد (activism) کو بہت مہمیز کیا ہے۔ چنانچہ اب خواتین خواہ وہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے اپنے معاشروں کے تناظر میں ایک کثیرالجہت جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ احتجاج کا راستہ بھی اختیار کرتی ہیں، تصنیف وتالیف سے بھی کام لیتی ہیں۔ وہ مختلف پیشوں کی سطح پر بھی اپنی تنظیمیں بناتی ہیں، وہ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتی ہیں اور قانون ساز اداروں میں مفیدِ مطلب قانون سازی بھی کرتی اور کرواتی ہیں۔ ان تمام کاوشوں کو جب یکجا کر کے دیکھیں تو ایک عالمی جدوجہد کا تاثر مضبوط ہوتا ہے۔ اب ایسی کتابیں بھی بافراط دیکھی جاسکتی ہیں، جن میں دنیا کے مختلف ملکوں میں چلنے والی عورتوں کی تحریکوں پر تفصیل کے ساتھ اور علیحدہ علیحدہ باب مختص کیے گئے ہیں جن کے ایک ساتھ مطالعے سے ان تحریکوں کی مشترک اقدار، خواتین کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے مسائل، ان کے استحصال کی یکساں اور متفرق شکلیں، سب بیک نظر سامنے آجاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب ۱۹۸۴ء میں 'بہناپا عالمی ہے' *(Sisterhood is Global)* کے نام سے سامنے آئی جس کو رابن مارگن (Robin Morgan) نے مرتب کیا تھا اور جوان کی سترہ سال کی ذہنی و عملی محنت کا حاصل تھی۔ اس سے پہلے ان کی طرف سے 'بہناپا طاقتور ہے' *(Sisterhood is Powerful)* کے نام سے ایک کتاب سامنے آچکی تھی، جس میں امریکہ کی حقوقِ نسواں کی تحریک سے متعلق تحریریں یکجا کر دی گئی تھیں۔ 'بہناپا عالمی ہے' کے اندر انھوں نے دنیا کے ستر ملکوں کی، حقوقِ نسواں کی تحریکوں کی تفصیلات درج کی ہیں۔ اس کتاب کا اسلوب کچھ یوں ہے کہ ہر ملک کے بارے میں بنیادی معلومات، وہاں خواتین سے متعلق جملہ تفصیلات، خواتین کے مسائل کی نوعیت، ان کی سماجی حیثیت، مختلف شعبوں میں ان کی کارکردگی، خواتین کی تنظیموں اور تحریکوں کا جائزہ وغیرہ درج کرنے کے بعد اس ملک کی خواتین کے حوالے سے ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر میں دنیا بھر کی خواتین بحیثیت مجموعی کہاں تک پہنچی تھیں۔ کتاب کے ابتدائیے میں مصنف نے چند جملوں میں خواتین کے اس مقام اور حیثیت کا نچوڑ پیش کر دیا ہے جہاں تک صدیوں کے سفر کے بعد وہ پہنچی تھیں۔ مصنف کے الفاظ میں:

'کیونکہ عملاً تمام موجود ممالک پدرسری ذہنیت پر استوار شدہ سماجی ڈھانچوں کے حامل ہیں، چنانچہ ان سب ملکوں میں انسان ہونے کا معیار مرد ہونا ہے۔ اور یوں عورتیں جو انسان ہی ہیں، وہ 'دوسری' اور 'دکھائی نہ دینے والی' چیز بن جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہوتا یہ ہے کہ حکومتیں اور بین الاقوامی ادارے جب عالمی مسائل کا ذکر کرتے ہیں مثلاً جنگ، غربت، مہاجرین، بھوک، بیماری، ناخواندگی، افراطِ آبادی، ماحولیاتی عدم توازن، بچوں اور بوڑھوں سے زیادتی اور ان کا استحصال وغیرہ وغیرہ، تو ایسا کرتے وقت ان کی توجہ اس طرف بالکل نہیں جاتی کہ ان تمام 'عالمی مسائل' سے جو لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ خواتین ہیں جن سے ان مسائل کو حل کرنے کے ضمن میں بھی کچھ پوچھنا روا نہیں رکھا جاتا۔'[۱]

-۲-

خواتین کی، اپنے حقوق کی بازیافت کی علاقائی اور مقامی تحریکیں ہوں یا عالمی سطح کی کاوشیں۔ ان سب کے پیچھے جو ایک سب سے اہم اور یکساں حقیقت کارفرما ہے وہ 'مرد کے ہاتھوں عورت کا استحصال' ہے۔ صدیوں سے جاری استحصال کا یہ نظام انسانی ترقی کی راہ میں حائل رہا ہے اور اس نے نوعِ بشر کو ان امکانات تک رسائی سے محروم رکھا ہے جو مرد و عورت کی برابری کے اصول کو انسانی معاشرے میں فروغ دے کر ہی ممکن بنائے جاسکتے تھے۔

استحصال کا یہ نظام بھی اپنی ٹھوس تاریخی اور سماجی بنیادیں رکھتا ہے۔ یہ نظام کسی ایک فرد یا افراد کے کسی گروہ، یا پھر کسی نظریے کا تشکیل کردہ نہیں ہے بلکہ یہ استحصال انسان کے اب تک کے سماجی ڈھانچوں میں مضمر یا ساختی (structural) رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ استحصال سماجی ڈھانچے کے تار و پود کے اندر 'بُنا ہوا' (in-built) ہے اور اس کو ڈھانچے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے میں رہتے ہوئے عورت کے استحصال سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ عمرانیات کے علم نے اور تاریخ و بشریات کی جدید تحقیقات نے

ان امور کی بہت کھل کر وضاحت کردی ہے کہ عورت کے استحصال کا آغاز کس طرح ہوا اور تاریخ کے مختلف مدارج میں یہ استحصال کس طور آگے بڑھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب اس بات پر ماہرینِ علوم سماجیات تیزی کے ساتھ متفق ہوتے جارہے ہیں اور بنیادی طور پر یہ معاشرے اور سماجی ڈھانچے میں صنفی تقسیم محنت (Sexual division of labour) کا اسلوب ہے جس نے عورت کو وہ سماجی کردار دے دیا ہے جو اس کو ایک انسان کے مرتبے سے کم تر تصور کرتا ہے۔ تب اس کی جملہ صلاحیتیں سماجی نظام کی بقا اور اس کی بہتر کارکردگی کے لیے صرف ہوتی ہیں نہ کہ اس کی اپنی بشری اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار اور فروغ کے لیے۔ مزید براں جہاں سماجی ڈھانچہ عورت کے ثانوی کردار کو متعین کرتا ہے، وہیں معاشرے کی مذہبی، اخلاقی اور سماجی قدریں اس کے اس کردار کے گرد ایک ایسا حصار کھینچ دیتی ہیں، جس سے باہر جانا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا اور پھر معاشرے کا رائج الوقت قانونی نظام عورت کے لیے بنائی گئی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی قانونی نظام ان سرحدوں کو توڑنے والوں یا والیوں کے لیے سزا کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ چنانچہ خواتین کی آزادی کی تحریکوں کے لیے ہمیشہ یہ سوال بہت اہم رہا ہے کہ وہ موجود نظام کے اندر رہتے ہوئے کس حد تک اپنے مقاصد حاصل کرسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تصور یہ ہے کہ موجود نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی جس حد تک قانون اور سیاست، نیز تحرک (activism) کے ذریعے اپنے حالات کو بہتر بنایا جاسکے، ان کو بہتر بنالینا چاہیے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ ایک چھوٹے زنداں سے نکل کر بڑے زنداں میں منتقل ہونے کے مترادف ہے۔ عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کے حقیقی خاتمے اور اس کے تدارک کے لیے ناگزیر ہے کہ اس سماجی نظام اور ڈھانچے کو ہدف بنایا جائے جس کی اساس استحصال پر مبنی جنسی اور صنفی تقسیم محنت کے اصول پر استوار ہوئی ہے۔[۲]

-۳-

ماضی میں خواتین کی، اپنے حقوق کے لیے چلائی جانے والی تحریکیں مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں کچھ اس انداز سے جاری رہی ہیں کہ کبھی ان تحریکوں میں زیادہ روانی، زیادہ سرگرمی اور جوش و خروش نظر آتا رہا ہے اور کبھی یہ کچھ عرصے کے لیے پس منظر میں بھی جاتی رہی ہیں۔ اسی عدم تسلسل

یا اتار چڑھاؤ کے پس منظر میں بعض مؤرخین نے گذشتہ دو سو سال میں خواتین کی تحریکوں کو مختلف لہروں کی شکل میں زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں تین بڑی لہروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلی لہر اٹھارہویں سے بیسویں صدی کے اوائل تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس عرصے میں امریکہ اور یورپ میں خواتین کی جدوجہد کا محور ووٹ کا حق حاصل کرنا تھا۔ یہ تحریک جسے Suffarge Movement یعنی 'حقِ رائے دہی کی تحریک' کا نام دیا گیا بہت صبر آزما مرحلوں سے گذری۔ اس ضمن میں انصاف پسند ذہن رکھنے والے مردوں نے بھی خواتین کے اس حق کی حمایت کی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں امریکہ میں ۱۹۱۹ء میں، دستور میں انیسویں ترمیم متعارف ہوئی جس کے نتیجے میں خواتین کو ووٹ کا حق حاصل ہوا۔ برطانیہ میں خواتین کو یہ حق ۱۹۱۸ء میں جزوی طور پر ملا اور پھر ۱۹۲۸ء میں سب خواتین کو یہ حق حاصل ہو گیا۔ امریکہ اور یورپ کی خواتین کو ووٹ کا حق حاصل کرنے کے لیے جتنی طویل جدوجہد کرنی پڑی، دوسرے ملکوں کی خواتین کو شاید اتنی محنت کی ضرورت نہیں پڑی اور ان کے معاشروں میں جب جمہوریت اور انتخابات کا دور دورہ ہوا تو یہ حق ایک تسلیم شدہ حق کے طور پر ان کو حاصل ہو گیا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ بہت سے ترقی پذیر ملکوں کی خواتین جو آج ووٹ کے حق سے بہرہ ور ہیں، ان کے اس حق کے حصول میں ان خواتین کا بھی حصہ ہے جنہوں نے پہلے پہل اس ضمن میں آواز اٹھائی اور یورپ و امریکہ میں اس حق کو منوایا۔

خواتین کے حقوق کی جدوجہد کا دوسرا قابلِ ذکر ابھار ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اوائل اور ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اواخر کے درمیانی زمانے میں سامنے آیا۔ اس دور میں خواتین کی جدوجہد کا محور قوانین کے اندر موجود امتیازات کو ختم کروانا تھا۔ اس دور میں قوانین نے شرائطِ ملازمت، تعلیم کے شعبے میں نمائندگی، حقوقِ ملکیت سے متعلق قوانین اور ایسے ہی دوسرے شعبوں میں برابری کے لیے آواز اٹھائی اور اس سلسلے میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔

۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل سے خواتین کی تحریکوں کا تیسرا ابھار سامنے آیا جو ابھی تک جاری ہے۔ اس عرصے میں دوسرے ابھار کے رجحانات کو توسیع حاصل ہوئی اور ان معاشروں میں بھی ان کی بازگشت سنائی دی گئی جہاں یہ دوسرے ابھار میں ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کے اندر تیسرے ابھار کے زمانے میں سابقہ حاصلات کو مزید مستحکم کیا گیا اور ان کا دائرہ بھی وسیع کیا گیا۔

تاریخی ابھار کے یہ تینوں مرحلے بنیادی طور پر یورپ اور امریکہ کے تناظر میں بیان کیے جاتے ہیں اور اس تاریخیت میں ایک طرح کا مغربی جھکاؤ (Western bias) بھی دیکھا جاسکتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی ممالک میں اور مسلم دنیا میں بھی خواتین کی تحریکیں پچھلے سوڈیڑھ سو سال سے کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی ہیں۔ مگر کیونکہ یہی وہ زمانہ بھی تھا کہ جب ان میں سے بیشتر ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں، لہٰذا عورتوں کے حقوق کو بھی قومی آزادی کے وسیع تر پروگرام کے حصے کے طور پر دیکھا گیا۔ چنانچہ خواتین اس تصور کے ساتھ ان تحریکوں میں پیش پیش رہیں کہ آزادی کے بعد جہاں ان کے ملکوں میں جمہوریت اور سماجی انصاف کے نظام قائم ہوں گے وہیں خود ان کے حقوق بھی معاشرے کی سیاسی وسماجی ترقی کے جزو کے طور پر حقیقت کا روپ دھارتے چلے جائیں گے۔ لیکن گذشتہ ساٹھ ستر سال کا تجربہ انہیں یہ بتانے کا ذریعہ بنا ہے کہ اوّل تو بہت سے ملکوں میں حقیقی آزادی اور جمہوری معاشرے کے قیام کا خواب ہی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور اگر کچھ ملکوں میں ایسا ہوا بھی تو خواتین پھر بھی ایک ثانوی حیثیت ہی کی مالک رہیں، چنانچہ ان ملکوں میں آزادی کے بعد جب خواتین کی تحریکوں کا ایک نیا مرحلہ اور نیا دور شروع ہوا تو یہ عہدِ غلامی کے تجربات سے بہت مختلف تھا کیونکہ اب ان خواتین کو اپنے ہی ملک اور اپنی ہی قوم کے مردوں کے تفوق کا مقابلہ درپیش تھا۔ پھر جن ملکوں میں پچھلے ساٹھ ستر برسوں میں آمریت کا بھی دور دورہ رہا، خواہ وہ بادشاہتوں کی شکل میں ہو یا شخصی اور فوجی حکمرانی کی شکل میں، وہاں عورت کی مظلومیت میں مزید عوامل شامل ہوگئے۔ ان ملکوں میں خواتین کی تحریکوں کو جبر کے نت نئے ہتھکنڈوں کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ ان ملکوں میں اگر ان کی کچھ کامیابیاں اور حاصلات ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں ان کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔[۳]

-۴-

خواتین کی تحریکوں پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے جو چند اہم نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں ان میں سرِفہرست نتیجہ یہ ہے کہ برسوں کی جدوجہد کے نتیجے میں آج خواتین بحیثیت مجموعی ایک ایسے مقام تک پہنچ چکی ہیں جہاں ان کی حیثیت اور حقیقت سے صرفِ نظر کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے، چنانچہ پدرسری نظام کے پروردہ افراد اور ادارے بھی کچھ نہیں تو زبانی طور پر ہی خواتین کے حقوق کی

حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر وہ نظریاتی سانچے اور نظریاتی نظام جنہیں ماضی میں خواتین کی ثانوی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے اور خود خواتین کے لیے اس حیثیت کو قابلِ قبول بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، اب ان نظریاتی سانچوں کو بھی خواتین کے حق میں استعمال کرنے کی ایک شعوری کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ اب عیسائی نسائیت (Christian Feminism)، یہودی نسائیت (Judaic Feminism) اور اسلامی نسائیت (Islamic Feminism) کی اصطلاحیں وجود میں آچکی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے حوالے سے مذہب کی ایک نئی تعبیر کی جارہی ہے جس کو بعض خواتین تنظیمیں اور نسائی مصنف خواتین کی حالت کو بہتر بنانے میں نظری اور عملی اعتبار سے معاون تصور کرتے ہیں۔ خواتین کی جدوجہد کی عالمی سطح پر ایک اور کامیابی جدید سائنسی ایجادات کے ذریعے ممکن ہوئی ہے۔ اس ضمن میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی کارکردگی کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ سائنسی علوم کی نئی تحقیقات بھی خواتین کے مؤقف کو مزید کمک پہنچانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ نئے مواصلاتی ذرائع نے ان میں رابطوں کی رفتار میں بھی اضافہ کردیا ہے۔

خواتین کی تحریکوں کے تجربات اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا گوشوارہ ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، اور وہ یہ کہ خواتین کی تحریکیں اگر اپنے حلقے تک محدود رہیں گی تو ان کی یہ تنہائی (isolation) ان کی کامیابیوں کی راہ میں مزاحم ہوگی۔ تجربات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ خواتین کی تحریکیں جب معاشرے کی مجموعی جمہوری تحریکوں کا حصہ بنتی ہیں تو اس سے ان کے مقاصد سے وسیع تر پیمانے پر آگاہی کا ماحول بھی پیدا ہوتا ہے اور جمہوری تحریکوں کو تو فائدہ پہنچتا ہی ہے۔ یہی چیز آئندہ کے لیے بھی خواتین کے لیے ایک راہ کشا حقیقت بنی رہے گی کہ وہ اپنے معاشروں کی مجموعی آزادی اور بہبود کے لیے تحریکیں چلائیں یا اگر ایسی تحریکیں چل رہی ہوں تو ان میں اپنے پروگرام کے ساتھ شامل ہوں، کیونکہ مسئلہ صرف عورت کی غلامی اور آزادی ہی کا نہیں ہے بلکہ ایک ایسے سماج کا ہے جو غلط اور غیر منصفانہ بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ اس سماج میں اگر عورت کے لیے ایک کردار مختص کیا گیا ہے اور ایک دوسرا کردار مرد کے لیے وضع کیا گیا ہے تو امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہی بنیادی انسانی آزادی سے محروم ہیں۔ یہ آزادی تبھی ممکن ہے جب سماج تبدیل ہو، اس کی اساس نئے اور ایسے اصولوں پر رکھی جائے جو شرفِ انسانیت کے حامل ہوں اور جن کے فروغ سے مرد اور عورت دونوں ہی حقیقی آزادی سے پہلی بار آشنا ہوں۔

حوالہ جات:

۱۔ رابن مارگن، 'Sisterhood is Global'، (مڈل سیکس، برطانیہ: پینگوئین بکس، ۱۹۸۵ء)، ص ا

۲۔ اس موضوع کے تفصیلی مطالعے کے لیے ڈاکٹر طاہرہ ایس۔ خان کی کتاب بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو: 'عزت کے نام پر' (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)

۳۔ تیسری دنیا کے مختلف ملکوں میں خواتین کے احوال، ان کی پسماندگی کی جہتوں اور ان کی اپنے حقوق کے حصول کی کاوشوں کے بارے میں اب بہت سا لٹریچر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس ضمن میں کماری جے وردھنے (Kumari Jayawardane) کی کتاب *Feminism and Nationalism in the Third World* (لندن: زیڈ بکس لمیٹڈ، ۱۹۸۶ء)، تیسری دنیا کے ممالک میں خواتین کی تحریکوں کا ایک اچھا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اسی طرح لوئی بیک (Lois Beck) اور نکی کیڈی (Nikki Keddie) کی مرتبہ: *Women in The Muslim World*، (کیمبرج، ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۸ء) اور چیرس واڈی (Charis Waddy) کی تصنیف *Women in Muslim History*، (لندن: لانگ مین، ۱۹۸۰ء) مسلم دنیا میں عورتوں کی تاریخ اور تحریکوں کا مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ نویل سداوی (Nawal al Sadawi) کی کتاب *The Hidden Face of Eve* *Women in the Arab World*، (لندن: زیڈ پریس، ۱۹۸۰ء) عالمِ عرب میں خواتین کی حیثیت اور جدوجہد پر ایک اہم علمی حوالہ ہے۔ برصغیر جنوبی ایشیا کے حوالے سے بھی خواتین کی تحریکوں پر قابلِ ذکر لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جنوبی ایشیا میں مسلم صنفی تحریکوں پر بھی الگ سے کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس ضمن میں عابدہ سمیع الدین اور آر۔ خانم کی مرتب کردہ تین جلدوں پر مشتمل کتاب *Muslim Feminism and Feminist Movement* ایک بھرپور مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہندوستان (جلد اوّل) پاکستان (جلد دوم) اور بنگلہ دیش و سری لنکا (جلد سوم) کے بارے مضامین دیے گئے ہیں۔ یہ مضامین جو مختلف مصنفوں کے لکھے ہوئے ہیں، متعلقہ ملکوں میں

خواتین کی حیثیت، وہاں کے قانونی نظاموں کے تضادات، تعلیم اور صحت کے شعبوں میں عورتوں کی حیثیت، مختلف سیاسی جماعتوں کے پروگراموں اور ملک کے مجموعی سیاسی نظام میں ان کو دی گئی جگہ اور ایسے ہی دیگر امور کا تنقیدی انداز میں احاطہ کرتے ہیں۔

'تاریخ' کے گذشتہ شمارے (نمبر ۴۰) کے مضامین۔ ایک نظر میں

ابوالفضل کی تاریخ نویسی میں 'وقت' کا تصور	ہربنس مکھیا
تخلیقِ پاکستان کے سماجی محرکات اور نظریہ: ایک جائزہ	حمزہ علوی
علامہ اقبال اور مردِ مومن: مسلمان مردانگی کا دعویٰ	ڈاکٹر روبینہ سہگل
ڈاکٹر فیروز احمد کی دنیائے فکر و عمل	ڈاکٹر سید جعفر احمد
گل پن: جنوبی ایشیا میں جوہی بم کے دس سال	ضیا میاں اور ایم۔ وی رامن
صوفیائے کرام کا ورثہ اور اُس کو لاحق خطرات	غافر شہزاد

خصوصی شعبہ: جسونت سنگھ کی کتاب 'جناح: اتحاد سے تقسیم تک': تنازعہ، مباحث، تجزیے

ہندوستان کے تین معروف تاریخ نویسوں کے خصوصی انٹرویو	
پروفیسر ہربنس مکھیا، ڈاکٹر اجیت جاوید، پروفیسر اوما سنگھ	انٹرویو: انور شاہین
مسخ کرنے کے ماہر	ڈاکٹر عائشہ جلال
حال کے خیالی تصورات اور ماضی کے واقعات	ڈاکٹر طارق رحمٰن
خالص تاریخ	ڈاکٹر ہمایوں خان
جسونت سنگھ کی منطقی اور تجزیاتی تصنیف	خواجہ رضی حیدر
تم بالکل ہم جیسے نکلے	رضا رومی
تقسیمِ وطن کا اصل ذمے دار کون؟	ایم۔ جے۔ اکبر
نہرو، جناح اور تقسیم	اصغر علی انجینئر
تقسیم کا درد ہمارے جگر سے پوچھو...... !	سید منصور آغا
ایک بار پھر سرزمینِ ہند پر جناح کا جنم	عزیز برنی
جسونت کی تخلیق	اے۔ یو۔ آصف
جناح کا جن بی۔ جے۔ پی کو لے ڈوبا	نور اللہ خان
جناح: ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے	اے۔ یو۔ آصف

فاطمہ مرنیسی بطور ایک نسائی مؤرّخ

انور شاہین

'باادب باملاحظہ ہوشیار، شہنشاہِ عالم تشریف لاتے ہیں'۔۔۔ اقتدار کے ایوانوں میں یہ آواز ہمیں قرنوں پہلے سے گونجتی سنائی دیتی ہے۔ شہنشاہ کا یہ وجود ہمیں کبھی نسوانی وجود سے بدلتا نظر نہیں آتا سوائے چند استثنائی صورتوں کے جو حیرت ناک ہونے سے زیادہ کسی قانون کی خلاف ورزی محسوس ہوتی ہیں۔ اقتدار کے محلات سے لے کر جھونپڑیوں کی بے نیل ومرام دنیا تک نظر دوڑائیں۔ عورت کا چہرہ تاریخ کے اوراق سے غائب ہے۔

تاریخ کی راہداریوں میں اور فلسفیانہ روایات کی بھول بھلیوں سے عورتیں غائب نظر آتی ہیں۔ اگر کہیں ان کا سراغ ملتا ہے تو منفی انداز میں۔ یوں تاریخ کے اس اصل ذخیرے کی قطع و برید کا لازمی نتیجہ سماج وثقافت کی نامکمل، مسخ شدہ اور غیر حقیقی تصویر کشی ہے۔ تاریخ کا بیانیہ وسیع پیمانے پر محض مردانگی کا ریکارڈ ہے یا مردانہ نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اس لیے اس کو his-story کہنا اور اس کے بالمقابل her-story کی دریافت ایک منطقی عمل ہے تاکہ تاریخِ انسانی کو اس کا دوسرا نصف چہرہ بھی دیا جاسکے۔

معیاری تاریخ کے پیمانے سے عورت کی زندگی، کردار اور شرکت وہ نکتہ ہے جس پر انیسویں صدی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں نسائیت پسندوں نے اصرار شروع کیا۔ اس کا مطلب چند خالی فریموں میں عورتوں کی تصویریں ثبت کرنا نہ تھا بلکہ یہ نسائی تحریک کی سرگرمیوں کا ایک اہم ذیلی میدان قرار پایا۔

نسائی تاریخ کا ایک اور پہلو خاتون مصنّفین، فنکاراؤں اور فلسفیوں کے خیالات اور کارناموں کو ازسرِنو دریافت کرنا ہے تاکہ ماضی میں موجود عورتوں کی آوازوں، احساسات، خیالات اور ان کو

حاصل انتخاب کی آزادی کا جائزہ لیا جا سکے۔[۱]

نسائیت کیا ہے؟

نسائیت بنیادی طور پر اس نظریے کا نام ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو بھی برابر کے حقوق ملنے چاہئیں کیونکہ جدید معاشروں میں عورتوں کو منظّم انداز میں کمتر پوزیشن میں رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں اپنی محکومیت کی نوعیت کو سمجھ لیں اور اس کو بدلنے کے طریقے اختیار کریں۔ نسائیت کا بنیادی سوال پدریت اور مردانہ حاکمیت کی جڑیں تلاش کرنا اور ایک استحصال سے پاک معاشرہ بنانا ہے جس میں کسی قسم کا تعصب اور امتیاز نہ ہو چنانچہ اس مثالی معاشرے کی خاطر افراد (مرد و عورت دونوں) کا جدوجہد اور شعوری عمل کرنا نسائیت ہے۔[۲]

دنیائے مغرب میں ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جنم لینے والی[۳] عورتوں کے حقوق یا آزادیٔ نسواں کی تحریک جس کو نسائی تحریک قرار دیا جاتا ہے، دنیا میں عہدِ حاضر کی دیگر تحریکوں سے نہ صرف منفرد بلکہ بہت زیادہ متنازعہ تحریک ہے۔ اس امر پر ماریا میز نے اصرار کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ 'نسائیت کے معاملے میں مرد و عورت دونوں ہی نے انتہائی جذباتی ردِعمل کا اظہار کیا ہے کیونکہ اس کا نشانہ کوئی بیرونی عامل نہیں، بلکہ خود مرد و زن کے رشتوں پر مشتمل کائنات ہے کہ جس کو بدلنا اس تحریک کا مقصود و منتہا قرار پایا ہے'۔[۴]

نسائی تحریک کے نتیجے میں مراعات یافتہ طبقے کی مراعات میں کمی آ سکتی ہے، کچھ عورتوں کی بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے اور استحصالی و جابر گروہوں اور انسانوں (مرد و زن) کے اس نظام کے دوسرے عناصر سے تعلق ٹوٹ سکتا ہے۔ اس پرانے نظام کی ہم آہنگی ہی دراصل منافع سازی، اقتدار کی بازی گری اور لالچ کو سہارا دیتی ہے اور اسی حلقے میں رشتے ابھی تک مستحکم چلے آ رہے تھے لیکن حقوقِ نسواں کی تحریک یا نسائی تحریک (feminism) اس ہم آہنگی و سکون کے جزیرے کو ایک انتشار کے طوفان سے دوچار کرنے کا نام ہے۔ فیمنسٹ دراصل اس خاموشی بھری سازش کو توڑنے والے افراد ہیں جو کہ مرد و زن کے رشتوں میں موجود عدم مساوات اور جبر کے متعلق پائی جاتی ہے۔ مردانہ برتری کے اس نظام کو جب جنسیت (sexism) اور پدریت (patriarchy) کے نام دیئے جاتے ہیں تو اس سے اس ازم کے متعلق ابہام کم نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔[۵]

خود نسائی تحریک اندرونی خلفشار کا شکار رہی ہے کیونکہ اس سے عورتوں کے حقوق کے حامی افراد نے بھی لاتعلقی و نفرت کا اظہار کیا ہے، اس کو سامراجیت، مغربیت اور سرمایہ داری جیسے نظاموں کا حصہ، شاخسانہ یا ہتھکنڈہ قرار دیا ہے۔ یا اسی قبیل کا ایک نظام سمجھا ہے۔ چنانچہ نسائیت اور نسائی تحریک کو بہت زیادہ تحقیری انداز میں پکارا گیا۔ اسے محنت کش طبقے کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے، طبقاتی جدوجہد یا قومی آزادی کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کا ایک وسیلہ بھی قرار دیا گیا۔ اس تناظر میں ہم اگر یہ دیکھیں کہ نسائیت کا تصور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں متفقہ طور پر عالمی کانفرنسوں اور دستاویزات میں مقبولیت حاصل کرنے لگا تھا، تو یہ دراصل ترقی پذیر ممالک کی نسائی مقاصد کے لیے سرگرم قوتوں کی جانب سے اس لیبل کو بعینہٖ قبول کرنے کا اشارہ تھا جیسا کہ اسے مغرب کے فیمنسٹوں نے دو دہائی قبل اختیار کیا تھا۔[۵]

مندرجہ بالا تعارف کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ لفظ یا تصور نسائی (فیمنسٹ) کے گرد جو منفیت کا حلقہ پایا جاتا ہے اسے توڑ کر اس کے اصل پیغام کو سمجھنے کی سعی کی جائے۔ کیونکہ اس مقالے کا موضوع 'فاطمہ مرنیسی بطور ایک نسائی مؤرّخ' اس تصور اور اصطلاح سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

نسائی تاریخ

۱۹۶۰ء کے عشرے میں نسائی تحریک کی دوسری لہر جو منظرِ عام پر آئی تو ساتھ ہی نسائی خطوط پر علمی تحقیق کی ضرورت سامنے آ چکی تھی۔ چونکہ نسائی نقطۂ نظر عورتوں کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری سمجھا گیا۔ یہ تحقیق کے طریقۂ کار (methodology) کے لیے مفید زاویۂ فکر (approach) مہیا کرتا ہے جہاں مقبولِ عام و معیاری طریقہ ہائے تحقیق ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایک برطانوی نسائی مؤرّخ سوزان پیڈرسن کے مطابق 'نسائیت نے تاریخ کی تحریر کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔' اس کا نسائیت کے تصور سے گہرا تعلق ہے۔ اگر نسائیت اس نظریئے کا نام ہے کہ 'اصناف کے درمیان اختلافات اور عدم مساوات فطری طور پر ظہور پذیر نہیں ہوئیں بلکہ ایک تاریخی عمل کا نتیجہ ہیں'، تو اس کے بعد نسائی تاریخ دانوں کے لیے دو قسم کے مشن نظر آتے ہیں۔

(الف): عورتوں کی زندگیوں، تجربات اور ذہنیت کو اس زوال آمادگی اور ابہام سے نکالا جائے، جس میں ان کو غیر فطری طور پر ڈال دیا گیا ہے، اور

(ب): تمام تاریخی بیانیوں کو از سرِ نو جائزہ لے کر نئے سرے سے تحریر کیا جائے تا کہ صنف کے عامل کی تشکیل اور کارکردگی کو واضح کیا جاسکے۔

نسائی مؤرّخین ان دونوں مقاصد سے خود کو وابستہ کیے ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں انہوں نے عورتوں کے وجود، کام اور اہمیت کے حوالے سے نئی نئی تشریحات وضع کی ہیں۔ ان کو زیادہ معنی خیز سمجھا ہے اور تاریخی و معاشرتی عمل کے تناظر میں نئے زاویے سے پرکھنے کی انتھک جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس کا مطلب تاریخ کی سمجھ میں رہ گئے خلاء، غلطیوں یا سقم کی اصلاح و فراہمی نہیں ہے، بلکہ وہ ماضی میں عورتوں کے نقطۂ نظر اور آزادی و انتخاب کی تلاش اور اس پر زور دیتے ہیں اور اس کے ساتھ جدید تاریخ کے اہم بیانیوں کی بھی صنفی تعلقات میں آنے والی تبدیلیوں کے حوالے سے تشریح کی جارہی ہے۔[۷]

سنگاری اور وید کے مطابق عورتوں کی تاریخ کو شامل کیے بغیر بھی تاریخ نویسی نسائی ہوسکتی ہے، کیونکہ اس میں یہ امر مسلمہ ہوسکتا ہے کہ حقیقت کا ہر پہلو صنفی بنیادوں پر بیان کیا جانا چاہیے اور اسی وجہ سے ہم آج جو جانتے ہیں اس پر بھی سوال کیا جانا چاہیے اور اس علم کے پیچھے جو نظریاتی مفروضے اور نام نہاد صنف سے غیر جانبدار طریقہ ہائے تحقیق مستعمل ہیں ان سب کا بھی بغور و مستقل جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔[۸]

پیڈرسن کے مطابق تاریخ کے بیانیوں سے ہم ایک اور چیز خارج کر دیتے ہیں وہ ہے طاقت کا کردار' اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ طاقت ہر جگہ موجود ہے اور کمزور بھی طاقتور کی طرح طاقت کا ستعمال کرتے ہیں تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کھلاڑی برابر نہیں ہیں اور یہ کہ حتیٰ کہ ایک متعدد رشتوں میں جکڑا ہوا نظام بھی ایک یا دوسری جانب زیادہ جھکاؤ اور وزن ڈال سکتا ہے اور یہ کہ طاقت کے بھی درجے ہوتے ہیں اور مکمل طور پر اختیار (agency) اور مکمل مجبوری (fixity) کے مفروضوں کے بیچ ایک وسطی میدان ہے اور یہی وسطی میدان بہت اہم ہے جس میں ہم بہت دلچسپ سوال تراش سکتے ہیں اور بہت ہی دلچسپ تاریخ جنم لے سکتی ہے۔[۹]

پیڈرسن کا کہنا ہے کہ سیاست کا عنصر تاریخی بیانیوں اور تجزیوں میں واپس لانے کی ضرورت ہے اور ہمیں مجموعی طور پر نظام کے تجزیے سے زیادہ اس کے اجزا پر توجہ مرکوز کرنا ہے اور عملیوں (processes) اور ان کے نتائج کے ساتھ ساتھ معنی و تفہیم پر بھی سوال اٹھانے کی ضرورت ہے۔

نسائی تاریخ دان سامراج اور قوم پرستی کی صنفی بنیادوں پر تشریح اور بیان کا کام بھی اپنے ذمے لے چکے ہیں ان کی سلطنتوں کے کاروبار اور صنفی تشخص کی تشکیل کے ربطِ باہم پر بھی گہری نظر ہے اور اس طرح یہ نظرِ ثانی کی مہمیز (revisionist impulse) تاریخ نویسی کا اہم عنصر بنتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس کے زیرِ اثر ساری کی ساری تاریخ کو صنفی زاویہ نظر سے دیکھنا اور از سرِ نو تحریر کرنا نسائی مؤرخین کی سب سے بڑی خواہش و منشا نظر آتا ہے اگر نسائی تحریک اور نسائی تاریخ نویسی کے مندرجہ بالا تصورات اور آئیڈیل کی روشنی میں فاطمہ مرنیسی کے کام کا جائزہ لیا جائے تو وہ ان سب معیارات پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں فاطمہ مرنیسی کی تحریروں، خیالات اور تحقیق کے نتائج و سفارشات کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حصہ دوم

فاطمہ مرنیسی اور اس کا علمی کام

فاطمہ مرنیسی ۔ ایک تعارف

حقوقِ نسواں کی معروف علمبردار اور بین الاقوامی طور پر شہرت پانے والی نسائی ماہرِ عمرانیات و محقق، فاطمہ مرنیسی مراکش کے شہر فیض میں ۱۹۴۰ء میں تولد ہوئیں۔ انہوں نے زندگی کا پہلا عشرہ ایک مراکشی حرم کی دیواروں میں گذارا، بعد ازاں قوم پرستوں کے بنائے ہوئے جدید اسکول میں ان کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا۔ انہوں نے رباط کی محمد پنجم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں امریکہ کی برانڈیز (Brandies) یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور محمد پنجم یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے شعبے میں پڑھاتی رہیں۔ خواتین کے حقوق کے لیے چلنے والی تحریکوں کے حوالے سے وہ تحقیق اور سرگرمیوں میں ممتاز رہیں ستر کی دہائی میں اٹھنے والی عالمی پیمانے کی نسائی تحریکوں سے انہوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی ان کی تحریروں کے ترجمے کئی عالمی زبانوں میں کیے گئے ان کی تحریریں زیادہ تر فرانسیسی میں ہیں۔ سائنسی تحقیق کے اداروں اور سول سوسائٹی سے ان کی وابستگی مستقل ہے اور ان کی تصنیفات کا سلسلہ کئی شکلوں میں جاری ہے۔ [۱۰]

زیرِ نظر مضمون فاطمہ مرنیسی کی جن کتابوں کے جائزے پر مبنی ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ اگرچہ ان کا تصنیفی و تحقیقی کام جاری ہے اور متعدد نئے گوشوں اور جہتوں کو آشکار کر رہا ہے لیکن اس مضمون کو ان کی مقبولِ عام اور ابتدائی دور کی کتابوں تک محدود رکھا گیا ہے۔

1- *Beyond the Veil Male Female Dynamics In Muslim Society,* Cambridge: Massachusetts, Revised Edition 1985, London Al Saqi Books, 1984.

2- *Women and Islam An Historical and Theological Enquiry,* Tr. Mary Jo Lakeland, Oxford: Basil Blackwell, 1991.

3- *The Forgotton Queens of Islam,* Tr. Mary Jo Lakeland, Oxford: Polity Press, 1993.

4- *The Veil and the Male Elite: A Feminist Interpretation of Women's Rights in Islam.*

5- *Dream of Tresspass Tales of a Harem Girlhood,* 1994.

6- *Women's Rebellion and Islamic Memory,* London/New Jersey: Zed Books, 1996, Trnaslation Zed Books, 1996.

ذیل میں ان کتابوں کا فرداً فرداً مختصر تعارف اور ان کے مندرجات پر تبصرہ پیش کیا جارہا ہے ان کا اجمالی جائزہ اس مضمون کے آخری حصے میں پیش کیا جائے گا۔

ا۔ 'پردے سے آگے۔ جدید مسلم معاشرے میں صنفی نظام کی حرکیات'*

(یہ کتاب اردو میں 'حجاب سے آگے' کے طور پر شائع ہو چکی ہے)

یہ کتاب پردے میں چھپی عورتوں کی زندگی پر کلاسک مطالعہ ہے اور اس پردے کی دنیا کے اندرونی حالات پیش کرتی ہے۔

---

* *Beyond the Veil, Male Female Dynamics in Modern Muslim Soc*

اس کا بنیادی مفروضہ (Premise) یہ ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کا حالیہ اضافہ دراصل بدلتے ہوئے صنفی کرداروں اور صنف پر مبنی شناخت کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ یہ کتاب واضح کرتی ہے کہ کس طرح حالیہ مروّج تصورات جدید قانون اور رسم و رواج میں در آئے ہیں اور اسلامی تاریخ میں صنف/جنس سے متعلقہ نظریات و رویّے یعنی حرکیات (dynamics) معیاری ہیں۔ مرنیسی نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ روایتی مسلم علمانے عورت کی جنسیت کو سرگرم بلکہ جارحانہ اور سماجی نظم و ضبط کے لیے ایک ممکنہ خطرہ قرار دیا ہے جس کے نتیجے میں اسلام کا سماجی ڈھانچہ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ یہ عورتوں کو علیحدگی اور پردے کے نظام کے تحت کنٹرول کر سکے۔ گویا مرنیسی کا یہ کہنا ہے کہ عورتوں کا موجودہ مقام دراصل ان کے 'کمتر' ہونے کے سبب سے نہیں بلکہ ان کی انتشار پھیلانے کی صلاحیت کے سبب سے ہے۔ اور یہ کہ اسلام افراد کی برابری کا قائل ہے جس میں ان کی جنس، نسل یا سماجی مقام کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس طرح یہ کتاب اسلام کے جمہوری پیغام کی ایک واضح تشریح پیش کرتی ہے۔

عورت کی جنسیت کی فعالیت کا تصور جو مرنیسی نے اپنی پہلی کتاب Beyond The Veil میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے مرنیسی نے اس ضمن میں اسلام کے بنیادی مآخذ اور تاریخی طور پر مقبول ہونے والی تشریحات کے تقابل سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک دوہرا نظریہ (double theory) ہے۔

اس کے مطابق یہ عام نظریہ کہ عورت ایک معضول (passive) کردار ہے جو کہ سپردگی، شکست اور زیرِ دست ہونے سے خوشی حاصل کرتی ہے، یہ نظریہ مرنیسی کے مطابق واضح، عیاں اور مقبولِ عام (explicit theory) نظریہ ہے جبکہ اس کے مقابل ایک پنہاں نظریہ (implicit theory) یہ ہے کہ 'عورت شکاری ہے اور مرد اس کا شکار' جو کہ امام غزالی کی قرآن کی تفسیر میں نظر آتا ہے۔ اس خفیہ نظریے کی حرکیات کو واضح کرنے کے لیے مرنیسی فرائیڈ کا عورت کی جنسیت کا نظریہ پیش کرتی ہیں جو کہ مغربی مسیحی دنیا میں مقبول ہے جبکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو غزالی کا تصور ہی دراصل مسلم معاشروں میں مقبول ہے۔ جو کہ سرگرم یا فعال جنسیت کا نظریہ ہے اور اسی کو سماجی نظم و ضبط کے لیے تباہ کن مضمرات کا حامل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ سماجی نظم و ضبط کا تحفظ عورتوں کی حیاداری اور پاکیزگی میں سمجھا گیا ہے جس میں اس کی جسمانی اور جنسی ضروریات کی تسکین بھی

شامل ہے۔ مرنیسی عورت کو اس اعتبار سے فتنہ کے برابر قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ پورا مسلم سماجی ڈھانچہ عورت کی جنسیت کے خلاف حملہ آور ہوتا ہے یا پھر اس کے خلاف اپنا دفاع کرتا نظر آتا ہے۔[۱۲]

۲۔ 'پردہ اور مرد اشرافیہ: اسلام میں عورتوں کے حقوق کی ایک نسائی تعبیر' *

اس کتاب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ ذکر ہے کہ وہ محبت اور جنسی تعلقات کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ خود زیادہ بیویوں کے شوہر تھے اور یہ بیویاں گھروں میں بند نہ تھیں۔ فیصلہ سازی میں شامل ہوتی تھیں۔ حضرت محمدؐ نے (مرنیسی کے مطابق) مردوں عورتوں کی مساوات پر زور دیا۔ غلامی کو مسترد کیا اور جمہوری اصولوں پر مبنی معاشرے کو قائم کرنا چاہا۔ مرنیسی کے مطابق بعد میں آنے والے مسلم علما نے ان مقدس متن والی کتابوں اور ذرائع علم کو مسخ کیا، ان میں سے اپنی مرضی سے تشریحات اخذ کیں، جن کا مقصد مردانہ غلبے کو قائم و دائم رکھنا تھا۔ مرنیسی نے حدیث لٹریچر کا باریکی سے جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی تاریخی جڑیں کیا ہیں اور جدید دور میں یہ رجحان کس طرح آیا کہ عورتوں کو محض محکوم اور حاشیائی مخلوق بنا دیا جائے وہ اس امر پر زور دیتی ہیں کہ یہ امتیازی سلوک اسلام کی بنیادی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے بلکہ اسلام اپنی اصل میں جمہوری ہے لیکن علمائے اسلام گذشتہ کئی صدیوں سے اس کے برخلاف تعلیمات کا پرچار کرتے آئے ہیں۔ وہ اپنی دلیل کے حق میں قرآن و حدیث اور دیگر تفاسیر و تبصروں سے کام لیتی ہیں۔ اس کتاب میں وہ پیغمبرِ اسلام، ان کی بیویوں اور ابتدائی دور کے مسلم معاشرے کی تفصیلی جزئیات مرتب کرتی ہیں۔ تحریر اور حوالہ جات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔

---

* *The Veil and the Male Elite: A Femminist Interpretation of Women's Rights in Islam.*

۳۔ 'اسلام اور جمہوریت: جدید دنیا کا خوف'*

یہ ایک فلسفیانہ تحقیق پر مبنی کتاب ہے۔ اس میں مرنیسی کا کہنا ہے کہ اسلام کو عرب لیڈروں نے مسخ کر دیا ہے کیونکہ وہ اپنے عوام کو جمہوریت کا حق نہیں دینا چاہتے۔ اپنے ذاتی تجربوں، عرب تاریخ، قرآنی تجزیوں اور ثقافتی امور کے حوالہ جات کی مدد سے مرنیسی یہ بتاتی ہیں کہ عرب دنیا میں مغرب کا خوف طاری ہے۔ وہ 'میڈیا امام' کے ظہور اور عروج سے خوفزدہ ہیں کیونکہ اس کے باعث آزادی کا تصور گناہ آلود ہوتا جا رہا ہے۔ آج عرب اقوامِ متحدہ میں تو بیٹھے ہیں لیکن ان کو اتنی ڈھیل مل گئی جبکہ وہ اقوامِ متحدہ کے اصول وقوانین پر پوری طرح کاربند نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سعودی عرب اور کویت کے امیر حکمرانوں کے خلاف غصے کے اظہار کے طور پر عرب عوام نے صدام کا ساتھ دیا۔ اس کا خیال ہے کہ گلف وار (خلیجی جنگ) اور عرب نسائیت کا ظہور دونوں عسکریت کی نفی اور جمہوریت کی پرورش کریں گے۔

۴۔ 'حدود شکنی کے خواب'**

یہ کتاب اردو میں 'حدود شکنی کے خواب' ہی کے نام سے ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کا بنیادی سوال یہ ہے کہ عورت و مرد حرم میں الگ الگ کیوں رہتے ہیں؟ عورت گلیوں میں آزادانہ کیوں نہیں چل سکتی؟ جب کہ مردوں کو پھاٹک کے اندر بند کر دیا جائے۔

یہ ۱۹۴۰ء کے عشرے کے فیض شہر کی کہانی ہے جبکہ مراکشی معاشرہ سماجی کایا کلپ کا شکار تھا جب مرنیسی کی ماں جو کہ اکلوتی بیوی تھیں حرم کی چاردیواری میں احمد دربان کے پھاٹک اور تالے کے اندر بند تھیں مرنیسی کی نانی یاسمینہ کھلے درختوں، کھیتوں اور ندیوں والی دیہی فضا کی کشادگی میں نو دوسری بیویوں کے ساتھ رہتی تھیں لیکن مقدس حدود اب بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہیں اپنے میاں کی چاہت ان سب کے ساتھ بانٹنی پڑتی تھی۔ بیرونی دنیا سے حرم کے مکینوں کا رابطہ محدود تھا۔ اس لیے حرم کی اندرونی زندگی اپنے خودساختہ ڈراموں، کہانیوں، چبوترے پر خفیہ سرگرمیوں اور روایتی

---

* *Islam & Democracy: Fear of the Modern World.*

** *Dreams of Trespass: Harem Within Tales of a Moroccan Girlhood.*

ادب وآداب کے قرینوں کے ساتھ گذرتی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز بھی ہم تک فاطمہ مرنیسی جیسی مصنفہ کی خوب صورت تحریر کے ذریعے پہنچتی ہے وہ بتاتی ہیں کہ روایتی مسلم معاشرہ کس طرح صنفی کرداروں کی تشکیل کرتا ہے اوران کی پابندی کرتا ہے؟ پھران پابندیوں میں محبوس خواتین کے جذبات کیا ہوتے ہیں؟ وہ سینما جاتے وقت کس طرح کی آزادی اور فرحت محسوس کرتی ہیں؟ خود حرم کے اندر توسیعی مشترکہ خاندان کے رشتوں کی حرکیات، دور پار کی عورتوں کی مجبوری کے تحت پناہ لینے کی روداد اور مختلف آپ بیتیوں کی حامل خواتین کا باہم گذارا کرنا، محدود دیواروں اور آنگن کی محدود دھوپ وچاندنی میں رہنا، یہ سب ہمیں بظاہر رومانوی سا لگتا ہے لیکن نو سالہ بچی کا اس ماحول میں کس طرح نسوانی اور نسائی شعور فروغ پاتا ہے۔ اس کا بیان بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے اوراس طرح یہ تحریر افسانوی رنگ رکھنے کے باوجود کئی بھیانک حقیقتوں کی عکاس ہے۔

مرنیسی کے بچپن کی ذاتی کہانی یہ بھی بتاتی ہے کہ کس طرح نسائیت اور تاریخ کا شعور اس کے ہاں فروغ پایا۔ مراکش جب تین طرح کی نوآبادیاتی طاقتوں (ہسپانوی۔ فرانسیسی۔ جرمن) سے برسرِ پیکار رہا اور ۱۹۵۶ء میں اسے آزادی ملی تو یہ ۱۶ سال فاطمہ کی ذہن سازی کے اعتبار سے بہت اہم تھے۔ گھرانے میں ریڈیو سے حاصل شدہ معلومات اہم سمجھی جاتی تھیں۔ اس خاندان کے مردوں کا معاشرے میں بہتر مقام اور سیاست سے دلچسپی لازم وملزوم تھے، بچوں کا ان امور کو سننا ہی مراکش میں آزادی کی لہر سے واقفیت اور قوم پرستی کے جذبات جگانے کے لیے کافی تھا خود فاطمہ کی والدہ قوم پرستی کی ایک مثال تھیں۔ وہ آزادی کے موقع پر نغمے گاتے ہوئے گھر سے باہر جشن مناتی رہیں۔ مغربی لباس، آزاد خیال گلوکارائیں اور اداکارائیں۔ اس گھرانے کے لیے سب آزادی کے ماڈل تھے۔ فیمنزم کا سبق مرنیسی نے اور کہیں سے نہیں اپنے خاندان کی عورتوں اور اپنی والدہ سے سیکھا تب قاسم امین جیسے مصنف کا عام گھرانوں میں بہت اثر تھا۔[15] اس کی والدہ قاسم امین کی کتابیں اپنے خاوند سے فرمائش کر کے پڑھواتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ مرنیسی کے گھرانے میں اور کرداروں مثلاً شمع کے ڈرامے اور پھوپھی حبیبہ کی المناک زندگی کے سبق بھی مرنیسی کے شعور کے لیے اہم تھے جو اس کو مایوسی کے بجائے رجائیت کی طرف لے جاتے تھے۔

حدود شکنی کے خواب کی تحریر کا پہلا ہی صفحہ گہرے تاریخی شعور کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ تاریخ کے اہم موڑ جو آتے ہیں اور جو افراد ان کو براہِ راست محسوس کرتے ہیں، ان کا

تجربہ سپاٹ زندگی گذارنے والوں سے یقیناً مختلف ہوتا ہے۔ فاطمہ مرنیسی حدود شکنی کو ایک طرح کی ثقافتی قدر کے طور پر پیش کرتی ہیں جس کی تاکید بھی کی جاتی تھی اور جس سے منع بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے باپ نے اس کو حدود کا احترام سکھایا انہیں خدا کی مرضی اور منشا کا مظہر بتایا اور حدود شکنی کو ایک نقصان دہ عمل قرار دیا۔ اس کے والد نے لڑکی ذات کو کمزور بتایا اور سفر سے منع کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں فاطمہ مرنیسی کی پیدائش کا سال کوئی امن کا سال نہ تھا تب ہسپانوی فوجیں فیض شہر میں داخل ہو رہی تھیں اور فرانسیسی اور ہسپانوی خود مراکش کے اندر برسرِ پیکار تھے مرنیسی اس سبب سرحدوں کو عسکریوں کے ذہن کی تخلیق قرار دیتی ہیں۔

ان کی تحریر میں مردوں کا سرحد کا تصور اور عورتوں کا سرحد کا تصور الگ الگ ملتے ہیں۔ تب حدود کا احترام اور حدود کا جاننا تعلیم کا مقصد قرار پاتا تھا اور بذریعہ تعلیم ایک مسلمان کے لیے حدود کا جاننا لازمی ہے۔

فاطمہ کے اندر نسوانی شعور کا ارتقا کیسے ہوا۔ اس کی جھلکیاں اس کتاب کے پہلے باب میں ملتی ہیں۔ جس کا آغاز اس اہم واقعے سے ہوتا ہے کہ ان کی والدہ نے بیٹی (فاطمہ) کی پیدائش پہ جشن منایا۔ کیونکہ وہ یہ یقین رکھتی تھیں کہ اسلام میں مساوات ہے۔

فاطمہ مرنیسی نے تین فیمنسٹ عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے وہ بچپن میں متاثر ہوئی تھی۔ یہ پہل کرنے والی فیمنسٹس عرب دنیا میں خاصی مشہور تھیں۔

پہلی۔ عائشہ تیمور: قاہرہ کے حرم میں تھی (۱۸۴۰۔۱۹۰۶ء) اس نے ساری زندگی پردے کے خلاف جوشیلی شاعری کی۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی میں لکھ سکتی تھی۔

دوسری۔، زینب نواز: لبنان کی تھیں (۱۸۵۰ء کے لگ بھگ) جو نوکرانی سے پڑھ کر دانشور بنی۔ وہ پردے اور عورتوں کے خلاف مضامین لکھتی رہی کیونکہ وہ ان دونوں کو اسلام کی سربلندی میں رکاوٹ سمجھتی رہی۔ ۱۸۹۳ء میں اس نے عورتوں کی Who's Who مرتب کی جس میں ۴۵۰ سے زائد خواتین کے نام اور سوانح عمریاں لکھیں ان میں قلوپطرہ سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک شامل تھیں۔

تیسری۔ ہدا شاراوی: ایک اونچے خاندان کی مصری حسینہ تھی جو ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئی۔ اس نے تقریر و جلوسوں سے مصر کے حکمرانوں پہ گویا جادو کر دیا۔ اس نے ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے خلاف

عورتوں کے جلوس کی سربراہی کی۔ قانون دانوں پہ زور دیا کہ نئے اہم قوانین نافذ کریں اس نے ترکی کے پہلے قانون میں محض مردوں کے لیے حقِ ووٹ پر احتجاج کیا۔ ہدا شاراوی نے مصر میں عورتوں کے حقوق کی کامیاب جنگ لڑی اور ۱۹۲۴ء میں لڑکیوں کی شادی کی عمر ۱۶ سال تک بڑھا دی گئی۔ اس کے حقوقِ نسواں کے پیغامات و عمل کے باعث نئے آزاد قوم پرست فضا والے ملکوں میں عورتوں کے حقوق آئین میں شامل کر لیے گئے۔ اس طرح کی نسائیت پسند عورتوں کی زندگی پر مبنی ہوم اسٹیج کے ڈرامے دیکھتے دیکھتے فاطمہ مرنیسی نے یہ طے کیا کہ وہ حقوقِ نسواں کے لیے لڑے گی۔

خود فاطمہ کی ماں ان حد بندیوں پھاٹک اور تالوں کو توڑ کر تعلیم بالغاں حاصل کرنا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ حرم میں بیٹھے رہنے سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ اپنی بیٹی سے یہ توقع رکھتی تھی کہ وہ دنیا بدل دے گی۔ وہ ایک نئی دنیا بنائے گی جہاں دیواریں نہ ہوں گی اور پھاٹک و دربان نہ ہوں گے۔ وہاں ایک اور کردار لالہ مانی تھیں جو روایت اور تقلید پرستی کا سبق دیتیں۔ لیکن شمع اور اماں جو روایت شکنی کے ماڈل تھے احتجاج اور شوخی و نسوانیت کے حامل بھی تھے۔ پھوپھی حبیبہ تھیں جو اچھی دنیاؤں کے لیے پُرامید تھی اور نئی نسل کی بیٹیوں کو روشنی بھرے خواب دکھاتی تھیں۔ ان سارے کرداروں، ماحول اور عوامل نے مل کر فاطمہ مرنیسی کے شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

۵۔ 'عورت کی بغاوت اور اسلامی یادیں' *

فاطمہ مرنیسی اس کتاب میں یہ واضح کرتی ہیں کہ ابتدائی دور کے مسلم مؤرّخین نے عام نظریے کے برعکس عورتوں کا ذکر تفصیلی طور پر نہیں کیا۔ بلکہ انہیں محض طاقتور لوگوں کی مائیں یا بیٹیاں بنا کے پیش کیا ہے۔[۱۶]

وہ محض تاریخ کو تاریخی بیانیے کے طور پر نہیں لکھتیں بلکہ تاریخی مواد، تاریخ نویسی کے عمل، اس کے تناظر (Context)، مؤرّخین کے محرکات اور مسلم تاریخ نویسوں کے کردار اور علمی کارناموں (contribution) پر تنقید کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود مؤرّخ سے زیادہ نسائی مؤرّخ ہیں۔ ان کا

---

* *Women's Rebellion and Islamic Memory.*

مشن تاریخی مواد میں سے نسائی نقطۂ نظر سے حقائق اور تشریحات کا جائزہ لینا ہے کہ یہ کس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں اور کس حد تک حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں۔ اسی کتاب میں ایک جگہ وہ یہ لکھتی ہیں کہ:

> 'تاریخی دلیل مسلم مذہبی ریاستوں میں حقوقِ نسواں سے متعلقہ سوالات کے لیے بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات آج اور بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشی و قانونی دائروں میں عورتوں کے متعلق ریاستی پالیسیاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی و عمل کے حوالے سے ہی جائز قرار دی جاتی ہیں۔'

مرنیسی یہ بتاتی ہیں کہ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ کے دو رول ماڈل مسلم دنیا میں دو الگ الگ فرقوں کے لیے ہیں حضرت عائشہ شیعہ فرقے کے لیے ایک منفی ماڈل (anti-model) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت عائشہ خلیفۂ وقت کے کسی عمل کی غلطی کے باعث سول نافرمانی کی نصیحت کرتی ہیں اور خود میدانِ جنگ میں فوجوں کو لے کر جاتی ہیں۔ اس طرح حضرت عائشہ کی ایک سوانح مصر میں سعید الافغانی نے لکھی Aisha & Politics جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ عورتوں کو سیاست سے مکمل طور پر خارج کر دینا چاہیے۔ زاعیہ مصطفیٰ کھادورا نامی مصنفہ نے جو لبنان سے تعلق رکھتی تھیں، ۱۹۴۰ء کے عشرے میں حضرت عائشہ کی ایک سوانح لکھی جس نے مسلم عورتوں کا سر فخر سے بلند کر دیا اس نے عورتوں کی فیصلہ سازی، قانون سازی اور شرعی احکامات کی تشکیل میں عورتوں کے دعوے کو سچ ثابت کر دیا۔ حضرت عائشہ کی حدیثوں کی تعداد ۲۴۲ ہے۔ حضرت علی کی ۲۹، اور حضرت فاطمہ کی محض ایک ہے۔

روایتی تاریخ نویسی کے جو نمونے مسلم مؤرّخین نے پیش کیے ان میں بھی مسلم عورتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے لیکن 'اخبار النسا' نام کا سلسلہ خصوصاً عورتوں کے لیے ہی تھا۔ یہ مشہور اخبار عورتوں کی تفصیل دیتا تھا۔ ایسی کم سے کم ستر کتابیں صلاح الدین مناجد نے شناخت کی تھیں۔ جن میں عورتیں کئی حوالوں سے بیان کی جاتی تھیں۔ حسن و خوبصورتی کا حوالہ بھی ان میں شامل تھا حتیٰ کہ کئی غلام عورتیں بھی ان میں شامل ہوئیں اور نمایاں مرتبوں تک پہنچیں۔ غلام عورتوں کی تاریخ و تذکرے، Qiyar نامی کتابوں میں بھی ہیں۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ عورت مسلم معاشرے میں ایک کم تر

مقام تک گر گئی یہ سوال مرنیسی آگے جا کر کھنگالتی ہیں۔ مرنیسی تاریخ نویسی کے عمل اور اس پر معاشرے/ریاست کے کنٹرول اور اس کی مضمرات سے آگاہی کے ثبوت کے طور پر یہ کہتی ہیں۔ 'عورتوں کا معاشرے میں تصور محض معاشرے اور تاریخی مواد سے نہیں لیا گیا۔ بلکہ یہ اس واسطے (media) پر منحصر ہے جس سے ایسی تحقیق کو پھیلایا جاتا ہو یا پھیلنے سے روکا جاتا ہو۔ یعنی یہ عورتوں کو تاریخی تناظر اور اہمیت عطا کرنے (historicizing the women) کا عمل تھا۔'

فاطمہ خود تاریخ نویسی میں نسائی نقطۂ نظر کو فروغ دینے کے حوالے سے کس امر پر یقین رکھتی ہیں، اس کا اظہار اس اقتباس سے ہوتا ہے:

'تاریخ سے جو کہ کسی ثقافت کی ریکارڈ شدہ یادداشت ہے، براہ راست استفادہ نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ دوسری تیار شدہ اشیا صرف میں آتی ہیں۔ تاریخی مواد تو انتہائی پیچیدہ عملیوں سے گذر کر، جنہیں اکثر اہلِ اقتدار کے ہاتھوں سختی سے کنٹرول اور سنسر کیا جاتا ہے، شہریوں تک پہنچتا ہے جو اس کو منتخب مقاصد کے لیے استعمال (یعنی صرف) کرتے ہیں۔ ان کثیرالجہتی، کثیرالروابط عملیوں کو سادہ تر بنانے کے لیے ہمیں یہ بنیادی مفروضہ اپنانا ہوگا کہ ایک اعلیٰ درجے کا تاریخی مواد جس میں عورتیں معاشرے میں بھرپور شرکت کی حامل ہوں، سودمند ہے اور بلاشبہ اس کی بازیافت اور حصول نسائی حکمتِ عملی کے لیے کیا جا سکتا ہے۔'[۱۷]

اس سے آگے چل کر وہ کہتی ہیں:

'تاریخی مواد جس کثرت سے دستیاب ہے اور وہ جس طرح عورتوں کے حق میں گواہی دیتا ہے، ساتھ ہی ساتھ عورتوں کا معاشرے میں کم تر مقام یہ بتاتا ہے کہ تصورات کی تشکیل کرنے والی قوتوں نے عورتوں کے خلاف امتیاز برتا ہے، لیکن ان قوتوں کو محض رجعت پسند کہنا ہوگا۔ بنیاد پرست کہنے سے ہمیں محتاط ہونا ہوگا کیونکہ جس طرح مغربی تبصرہ نگاروں نے دونوں کو باہم خلط ملط کیا ہے، اس کے باوجود سیاسی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں مسلم عورت کی مفعولیت (passivity) کی محض بنیاد پرستی

> کے اثر کا نتیجہ ہونے کے حوالے سے تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اکثر مسلم معاشروں میں اہلِ اقتدار بنیاد پرستوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ریاست انہیں سیاسی طور پر ناپسندیدہ قرار دیتی ہے۔ محض رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں کو باہم کنفیوژ کرنے سے ہمیں ایک متحرک اور پیچیدہ صورتِ حال کی سمجھ بوجھ میں کوئی اضافہ نہیں ملتا۔'[18]

مرنیسی کے خیال میں بنیاد پرست تحریک کی جڑ میں سیاسی رجعت پسندی موجود ہوتی ہے جس کا اظہار سیاسی نوعیت اور مسلم حکومتوں کے سیاسی وسماجی افکارات اور خواہشات سے ہوتا ہے۔ محض رجعت پسندوں کو الزام دینے سے ذرائع ابلاغ میں عورت کے کمتر وجود کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔

عورتوں کے مرتبے کے حوالے سے تصدیق یا سند حاصل کرنے کے لیے قرونِ وسطیٰ کی مذہبی تاریخ کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ مرنیسی کے مطابق شیخ ابنِ حجر (م۔۱۴۷۴عیسوی)، ابنِ سعد (م۔۸۵۲عیسوی) کی 'الطبقات الکبریٰ' میں جلد ہشتم تو ساری عورتوں ہی پر مرکوز ہے۔ طبری، ابنِ امیر یوسف القرطبی الذہبی اور ابن الطاہر جیسے سوانح نگاروں نے اس اصل دور میں تابعین کی سوانح مرتب کیں۔ اس ضمن میں وہ کم سے کم نو اہم سوانح نگاروں کے بڑے بڑے شہ پاروں کا حوالہ دیتی ہیں۔ 'سیرۃ ابنِ ہشام' میں بھی عورتوں کی زندگیاں اپنے تاریخی تناظرات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ وہ پیغمبرِ اسلام کی تبلیغ، جنگوں اور مکالمات میں سرگرمی سے شریک نظر آتی ہیں۔ اسلام کے پہلے عشرے میں جو مشکلات سے بھرپور تھا، ہر فرد وعورت کا کردار بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق اسلام کے ابتدائی دس سال بہت اہم اور مشکل تھے۔ یہاں عورتیں اسلام کے بڑے معماروں کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ حضرت خدیجہ کا کردار اسلام کے شروع سالوں میں اہم ترین تھا۔ ان سارے حوالوں کے جائزے سے مرنیسی یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ عورتوں کی انفعالیت، علیحدگی اور مسلم معاشرے میں حاشیائی کردار کا تعلق مسلم روایت سے نہیں ہے بلکہ یہ ہم عصر نظریاتی تخلیق ہے۔ اپنی تحقیق کے نتائج کی روشنی میں وہ یہ بھی تجویز کرتی ہیں کہ مسلم دنیا میں موجود مسلم ذخیرے کی بنیاد پر کس طرح عورتوں کے لیے تاریخی تحقیق کا لائحہ عمل بنایا جائے۔ مثلاً اسکالرز کا باہم رابطہ اور میڈیا کے ذریعے معلومات کی تشہیر و اشاعت۔ وہ تین ایسے شعبے تجویز کرتی ہیں کہ جن میں ابتدا میں تحقیق کی جائے:

۱۔ اسلام کے ابتدائی عشرے میں تحقیق اور نامور خواتین کی سوانح لکھنا۔
۲۔ ۲۰ ویں صدی میں مسلم ممالک میں نسائی تحقیق۔
۳۔ خواتین کی غلامی اور جسم فروشی اسلام میں، کے موضوع پر تحقیق۔

مرنیسی نے نہ صرف خود تاریخ نویسی یا تاریخ کی تشریح کے لیے نئے انداز اور نئے نقطۂ نظر کو محنت سے مرتب کیا، نئی راہ نکالی جو مشکل تھی بلکہ اس پر چل کر دکھایا اور نئے آنے والوں کو بڑی محنت سے یہ سمجھایا کہ یہ راستہ کیوں اہم ہے؟ وہ اپنی حاصل شدہ معلومات(findings) کے بارے میں کبھی کچھ چھپاتی نہیں۔ عورتوں کی کمزوریوں کو صاف صاف منظرِعام پر لاتی ہیں خواہ اس سے روایتی اسٹیریوٹائپ کو کتنا ہی دھچکا پہنچتا ہو وہ ترجیحی اعتبار سے چند شعبوں اور موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں کہ جن میں تحقیق سب سے پہلے کی جانی چاہیے اور اس کی تفصیل و مقاصد وغیرہ بھی بیان کرتی ہیں۔ ان تحقیقات کے نتائج کو نشر کرنے کے لیے وہ فیمنسٹ پریس کا ذکر بھی کرتی ہیں۔

۶۔ 'اسلام کی بھولی ہوئی شہزادیاں' *

مرنیسی نے اپنی اس کتاب میں اسلام کی پندرہ صدیوں میں تحقیق کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ بے نظیر بھٹو نہ تو پاکستان/ اسلامی دنیا کی پہلی مسلم سربراہِ حکومت ہیں، نہ ہی ان کے اس انتخاب کو blasphemous قرار دیا جانا چاہیے کیونکہ یہ اسلامی روایات کی خلاف ورزی نہیں ہے اور یہ دعویٰ غلط ہے۔ مرنیسی نے ایسی مسلم خواتین کا سراغ لگایا ہے جنھوں نے نہ صرف عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھی، بلکہ ان کی زندگی، کہانیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، سب پر پردہ ڈال دیا گیا اور وہ گمشدہ تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ مرنیسی نے اس کتاب میں خاص طور پر پندرہ ایسی کوئین یعنی ملکہ عورتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

- ہندوستان میں سلطانہ رضیہ (۱۲۳۶ سے)، مصر میں شجرۃ الدرّ (۱۲۵۰ء)
- مصر اور یمن کی شیعہ حکمران خاندان کی ملکائیں

---

* *The Forgotton Queens of Islam.*

- شیبا کی نوعمر ملکہ، اور
- خیزراں جو بغداد (785-765 عیسوی) میں ہونے والے دو خلفا کی ماں تھی، پردے کے پیچھے رہ کر امورِ مملکت کنٹرول کرتی تھی۔

مرنیسی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ بے نظیر کی وزارتِ عظمیٰ پر پاکستان میں احتجاج اس نظریے سے ہے کہ عورت اسلام کی تاریخ میں کبھی تخت نشین نہیں ہوئی۔ حالانکہ وجہ یہ تھی کہ پاکستانی سیاستدان ہار چکے تھے اس لیے اسلام کی دلیل لا رہے تھے۔ وہ پارلیمانی جمہوریت کا تصور مانتے تھے جو کہ اقوامِ متحدہ کے حقوقِ انسانی کے اعلامیے (UNDHR) سے ماخوذ ہے، جہاں ووٹ سیاسی طاقت کی واحد خودمختار (sovereign) بنیاد ہے۔ اس لیے جمہوری طور پر منتخب شدہ عورت کے لیے وہ ماضی اور روایات کی دلیل کس طرح دے سکتے تھے۔ نہ ہی یہ فرانس، امریکہ یا برطانیہ میں ممکن تھا کہ ایسی دلیل دی جاتی۔ کیونکہ جہاں عورت نظر آتی ہے وہاں ووٹ طاقت کی بنیاد نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا اصل مسئلہ عورت ہونا ہے۔ وہاں عورت کی بجائے مرد ہوتا تو ووٹ کا اصول صحیح سمجھا جاتا۔ اس بنیاد پر مرنیسی ووٹ پر مبنی جمہوریت کے اصول کو جو تاریخی طور پر ارتقا پایا ہے۔ عورت کے انتخاب کے تناظر میں رکھ کر دیکھتی ہیں کہ رویہ عورت کے خلاف ہے لیکن یہ ووٹ کے اصول کے خلاف نہیں ہے۔

اس ضمن میں مرنیسی اپنے آپ کو نجی سراغرساں کہتی ہیں تا کہ وہ ۱۹۸۹-۶۲۲ عیسوی تک کے مسلم عہد میں موجود عورت کو جو ریاست کی نگہبان تھی اس کا سراغ لگا سکے۔ بے شک عورتیں موجود تھیں بطور سربراہ لیکن ان کو تاریخ سے نکال دیا گیا۔ اس اعتبار سے یہ پوچھنا صحیح ہے کہ کیا بے نظیر پہلی مسلم سربراہِ حکومت خاتون ہیں یا یہ کہ دیگر خواتین سربراہ تھیں۔ کیا ہم ان خواتین کا سراغ لگائیں جو کہ خاموشی سے مر گئیں یا غائب ہو گئیں۔ اور پھر مرنیسی کا جواب اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے:

> 'آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مجھے تلاش میں دور نہیں جانا پڑا جیسا کہ پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ متعدد کوئین، ملکائیں اور خاتون پرانی کتابوں کے زرد صفحوں کی ہلکی سی کسک کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے نمودار ہونے لگیں۔ ایک ایک کر کے وہ لائبریریوں کے خاموش کمروں میں

چہل قدمی کرنے لگیں ان کے ہمراہ سازشوں اور لاینحل معموں کا ہجوم تھا۔ کبھی وہ اکٹھے دو یا تین نمودار ہوتیں جب ایشیائی اسلام کے دورافتادہ جزائر میں ماں اپنی بیٹی کو تخت سونپ رہی ہوتی۔ ان کے نام ملکہ اروا، عالم الحرا، سلطانہ رضیہ، شجرۃ الدر، ترکان خاتون تھے، یا پھر زیادہ باحیا انداز میں وہ 'تاج العالم' اور 'نورالعالم' جیسے ناموں سے پکاری جاتی تھیں۔ کچھ کو عنان حکومت وراثت میں ملتی، دوسری اقتدار پر قبضے کے لیے اس کے وارثوں کو قتل کروا دیتی تھیں۔ کچھ کو اپنے قابل وزیروں پر اعتماد بھی ہوتا تھا اور کچھ دوسری محض اپنی ذات پر بھروسہ کرتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا انداز تھا رعایا سے برتاؤ کا، انصاف مہیا کرنے کا اور ٹیکس کے انتظام کا۔ کچھ لمبے عرصے تک تخت پر بیٹھنے میں کامیاب ہوسکیں جبکہ کچھ اور تھیں جنہیں قدم جمانے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ کچھ تو راسخ العقیدہ خلفا، امیوں یا عباسیوں کے سے انداز میں مریں یعنی ان کو زہر دے کر یا خنجر گھونپ کر مارا گیا۔ بہت کم ایسی تھیں کہ جنہیں آرام سے اپنے بستر میں موت نصیب ہوئی۔ [19]

ان کا اگلا سوال یہ ہے کہ 'اسلام میں ''کوئین'' کو کس طرح پکارا جاتا ہے؟'

مرنیسی یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ قرآن میں شیبا کی ملکہ کا ذکر اس کے نام کے بغیر ہے کیا کسی عورت نے اسلام میں امام یا خلیفہ کا لفظ یا لقب اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میرا سوال 'کیا کوئی عورت خلیفہ ہوئی ہے؟' ایک طرح سے کافرانہ گستاخی (blasphemy) کا سوال بن جاتا ہے۔ اس کے بعد منطقی انداز میں ان کا اگلا سوال یہ ہے کہ کیوں کسی عورت نے آج تک امام اور خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی مرنیسی کو اسکی اہمیت کا انداز ہوتا ہے وہ کہتی ہیں کہ ایک عورت ہونے کے ناطے یہ جرأت کرنے کا خیال بھی کہ تاریخ پر انگلی اٹھائی جائے، ایک طرح کی تکلیف پیدا کرنے والی کافرانہ گستاخی تھی۔ 'میرا تجربہ تو ایسا ہی تھا۔' کسی بھی عورت نے جو اقتدار میں آئی ہو خلیفہ/امام کا لقب اختیار نہیں کیا۔ لیکن ہر مسلم حکمران خلیفہ نہ تھا یہ لقب محض چند مردوں تک محدود تھا۔ یہ بہت قیمتی لقب تھا، وہ ابنِ خلدون کے تصورِ خلیفہ کو مستعار لیتی ہیں۔ 'خلیفہ

شریعت کا پابند ہے۔ وہ despot نہیں ہے، شاہ نہیں ہے، خلیفہ اسلام کو خود تبدیل بھی نہیں کر سکتا۔' لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ وضاحت بھی کرتی ہیں کہ مرد حکمرانوں کی بڑی اکثریت نے خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔

خلیفہ کوئی عورت نہ ہوئی۔ خلافت کا مشن الوہی تھا۔ وہ خادمِ عوام تھا خدا کا نائب تھا۔ تاہم سلطان اور ملک کے نام سے خواتین سامنے آئیں۔ ۶۳۴ ہجری بمطابق ۱۲۳۶عیسوی میں برسرِ اقتدار آنے والی سلطانہ رضیہ کا تعلق مملوک خاندان سے تھا۔ دونوں رضیہ سلطان اور شجرۃ الدر ترک النسل خواتین تھیں۔ عرب مؤرخین خواتین کو ملکہ کا خطاب دیتے وقت کسی مشکل کا شکار نہیں ہوتے تھے جیسا کہ آج ہمارے مؤرخین ہوتے ہیں۔

ایک اور لقب 'الحرا' کا ہے (لفظی معنی ہیں 'آزاد عورت') یہ کنیزوں کے بدلے میں آزاد عورت اور حرم کے اندر قانونی بیوی کے لیے استعمال ہوتا تھا جبکہ اس کا جدید آزادی/حقوق کے معنی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اس تاریخی ذخیرے میں موجود اقتدار کے حلقوں میں پائی جانے والی گرچہ ساری عورتیں سربراہِ حکومت نہ تھیں، سربراہِ ریاست نہ تھیں لیکن حکمران عورتوں کو غیر حکمران عورتوں سے ممیّز کرنا بھی مشکل تھا۔ جن سوالوں کو فاطمہ مرنیسی ساتھ لے کر چلتی ہیں وہ ان کی معروضیت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتی ہیں کہ 'اسلام میں تو تاج کی کوئی حیثیت نہیں اور عظمت کا نشان تو انسان کی انکساری ہے۔ پھر محض سربراہِ ریاست کے انتخاب کا معیار ہی کیوں ہو؟[۲۰]

ان کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان عورتوں نے کس طرح سے اقتدار حاصل کرنے کا مرحلہ طے کیا جبکہ اقتدار تو بلاشرکت غیرے مردوں کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ لفظ 'امام' یا 'خلیفہ' کے لیے کوئی مؤنث صیغہ نہیں ہے یہ عربی زبان (قرآن کی زبان) میں قوت کے تصور کو ظاہر کرنے والے دو لفظ ہیں۔ ایسے عالم میں عورتوں کا مسندِ اقتدار تک پہنچنا بذاتِ خود اہم کامیابی تھا جبکہ سارے اصول وقوانین مردوں کو حاکمیت سونپتے ہوں۔

اس ضمن میں جدید عہد میں کئی مسلم ممالک میں ووٹ اسمبلی اور مرد و عورت دونوں کے ووٹ کا اصول موجود ہے۔ لیکن بیشتر ممالک میں اسمبلیاں، پارلیمنٹ یا پیپلز کونسل نامی ادارے 'یک صنفی' ادارے ('حرم') ہیں۔ چنانچہ ایک صنف کے حامل افراد دوسری صنف کی عدم موجودگی میں اس

کے مسائل حل کرتے ہیں۔ بین الاصناف مکالمے کے حامل موضوعات کی تو باری ہی نہیں آتی۔ ملین کی تعداد میں ہم ڈگری یافتہ عورتیں ہیں زیادہ ہوشیار، زیادہ سمجھ دار پھر بھی ہمیں سیاست سے سختی سے دور رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرنیسی یہ نتیجہ نکالتی ہیں کہ یہ مسئلہ تو بنیادی طورر پر جگہ (space) یا 'مکان' کا مسئلہ ہے۔ جہاں عورتوں کی space نہیں اگر وہ وہاں نظر آ جائیں تو انتشار پیدا ہوتا ہے اور جہاں فیصلے ہوتے ہیں وہاں ہمارا نظر آنا غیر متوقع ہوتا ہے۔ اگر پاکستانی انتہا پسند ردِعمل کے حامل افراد طاقت کے حلقوں میں زیادہ عورتوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے تو وہ بے نظیر کو اُفق پر طلوع ہوتے دیکھ کر قدرے زیادہ آمادگی/قبولیت کا اظہار کر سکتے تھے۔

مرنیسی نے مزید یہ بھی نتیجہ نکالا کہ 'اشراف' کا لفظ دراصل 'aristocracy' کے معنی میں ہے۔ 'الحرا' کا لقب اسپین اور شمالی افریقہ کی ملکاؤں نے کافی اختیار کیا عورتیں اکثر آفت و تباہی کے مواقع پر منظرِ عام پر آتی تھیں۔ 'عائشہ الحرا' سقوطِ غرناطہ کے سال (۱۴۹۲ء) میں مسلم دنیا کی ناقابلِ فراموش شکست کے زمانے کی گواہ اور لیڈر تھی۔ اس نے اپنے بیمار خاوند سے اقتدار لے کر اپنے بیٹے کو سونپا اور اس کا بیٹا محمد ابوعبداللہ مسلم اسپین کا آخری بادشاہ بنا۔ چونکہ مسلم بادشاہت کے خاتمے کے آخری سالوں میں 'عائشہ الحرا' کا کردار نظر آتا ہے، مؤرّخین نے اس پر پردہ ڈال دیا۔ صوبے تیتوان کی گورنر ایک مراکشی عورت تھی۔ مسلم مؤرخین نے اس عورت کا سراغ بھی نہیں لگنے دیا۔ یہ ملکہ ۳۱ سال تک (۱۵۴۲ـ۱۵۱۰) اپنے شوہر کے ہمراہ حکومت کرتی رہی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کا اقتدار یا اقتدار کی خواہش کم نہیں ہوئی اس نے مراکش کے بادشاہ سے شادی کر لی اور اسے مجبور کیا کہ وہ شادی کے لیے تیتوان آئے۔

الحرا کا لقب sovereign power کے لیے استعمال ہوتا ہے sitt کا لفظ lady کے لیے مصر میں فاطمی خاندان نے استعمال کیا۔ ترکوں اور تاتاریوں میں عورتیں سیاست میں زیادہ حصہ لیتی تھیں (ابنِ بطوطہ کے لیے تو یہ حیرت کی بات تھی) وہ تو حکم جاری کرتے وقت لکھتے تھے 'سلطان اور خاتون کے حکم سے......' خاتون کا لقب کرمان کی کتلوغ خاندان کی ملکہ وغیرہ کا لقب ہوتا تھا۔

ملکہ خیرزاں (۷۸۵ـ۷۷۵عیسوی) پردے کے اندر رہ کر بیرونی دنیا پر حکومت کرتی تھی۔ اس نے مردوں کے پردے میں حکومت کی کیونکہ بذاتِ خود کرتے وقت اس کے احکامات کو کوئی نہ مانتا تھا۔ ہارون الرشید جو کہ بہت ہی قابل خلیفہ تھا۔ دراصل اپنی ماں کے تجربوں سے براہِ راست

فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس نے ماں کے ساتھ طاقت میں شراکت کی۔ اپنی موت تک خیرزاں نے سلطنت کے حکم ناموں کی مخالفت کی تھی یا اس کے اندازِ حکمرانی کی مخالفت کی تھی۔

حصہ سوئم

فاطمہ مرنیسی بطور نسائی مؤرّخ: ایک تجزیہ

مرنیسی کی تربیت جس انداز سے اور جس ماحول میں ہوئی اس نے زندگی کے ابتدائی چند اہم ترین شخصیت ساز سالوں میں اسے خالصتاً عورت بنانے میں مدد دی۔ (ثبوت کے طور پر ان کی کتاب 'حدود شکنی کے خواب' دیکھیں)۔ عورت ہونے اور عورت کا نقطۂ نظر جاننے کے باعث مرنیسی کو ان حد بندیوں اور محدودیت کا شدید احساس بھی ہے جو عورت پن کے باعث اس کی تربیت، نقل و حرکت، امکانات اور فکر و اظہار پر لگائی گئی۔ وہ شدت سے یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے تجزیے کی صلاحیت اور شناخت بہرحال کچھ بھی ہو نسوانی ہے اس لیے اس کے اندر سے جو جرأتمندانہ سوال اٹھتے ہیں وہ کافرانہ گستاخی کے مترادف ہیں۔ اس کو احساس ہے کہ یہ سوال:

'کیا عورت خلیفہ ہوئی ہے؟'

اگر ایک مرد مؤرّخ پوچھتا تو شاید اتنا گستاخانہ نہ ہوتا۔ ان نسوانی حد بندیوں کے باوجود اس شدید احساس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ جب خواتین کی تاریخ میں سے مقتدر عورتوں، ملکاؤں اور عسکری کردار والی عورتوں کو تلاش کرنے لگتی ہیں تو ان کو ان کی جرأتمندی، کمال ہوشیاری اور خطرات سے بھرپور عوامل و عواقب کا انداز بہت صحیح (precise) ہو جاتا ہے۔

مرنیسی کو مسلم معاشروں، مسلم ذہن (mind)، مسلم نفسیات اور مسلم تصورِ عالم (world view) کا بہت اچھا اندازہ ہے۔ شاید دوسرے مسلم محققین اس تک اس لیے بھی نہیں پہنچ سکے کہ وہ خود تنقیدی سے احتراز کرتے رہے ہیں۔ مثلاً مرنیسی کا یہ کہنا ہے کہ 'مسلمانوں کے لیے آزادی، غلامی کا متضاد ہے۔' لیکن یہ آزادی جدوجہد کے بدلے میں حاصل کردہ آزادی نہیں ہے اس کے پیچھے کوئی قابلِ فخر کوششوں کی تاریخ بھی نہیں ہے، چنانچہ کوئی عورت یا تو آزاد ہے یا غلام۔ لیکن اس عورت کی آزادی کے پیچھے بھی جدوجہد کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔

مسلم شعور (Muslim consciousness) کے اندر موجود عورت کا تصور جس طرح ارتقا پذیر ہوا ہے مرنیسی نے اس کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی اور اپنے کزن سمیر (جو اس کی پیدائش کے دن ہی پیدا ہوا تھا) کے بچپن کے ابتدائی نو سالوں کے عمل سماجیانہ (سوشلائزیشن) اور الگ الگ مردانہ ونسوانی خصوصیات کی حامل شخصیات وکردار بننے کے عمل کا تقابلی مشاہدہ یکجا کر کے یہ بتاتی ہے کہ کس طرح انسانوں کے لیے space اور ان کے نقطۂ نظر کا باہم تعلق بنتا ہے۔ وہ حدود اور تقسیم کے مردانہ اور زنانہ تصورات کا فرق جانتی تھی۔ اس کے گھرانے میں مرد حدود کو مقدس قرار دیتے تھے اور چند عورتیں انہیں غیر مقدس قرار دیتی تھیں۔ اس طرح اس کا تصورِ صنف حدود سے مشروط ہو کر پروان چڑھا ہے اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے اردگرد ایسے نسوانی کردار موجود تھے جن میں اس کی والدہ بھی شامل تھیں جنہوں نے مردانگی اور نسوانیت کے مروجہ معیارات کو سختی سے چیلنج کرنے کی روایت برقرار رکھی تھی۔ یہ کردار یا تو جرأت اور احتجاج کا مظہر ہیں یا پھر جبر کا شکار ہیں لیکن اس پر صبر شکر نہیں کرتے۔ وہ صنفی مساوات کے اصول کی نفی ہونے پر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ مراکشی اور پاکستانی معاشرے کا اگر ہم اس اعتبار سے تقابل کریں تو ہمارے ہاں اب بھی روایتی انداز، مجازی خدا اور ناقص العقل کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے لیے بے لوث اطاعت کے نمونے مستحسن سمجھے جاتے ہیں اس طرح جرأتِ سوال و اظہار پیدا نہیں ہوتی۔

گم شدہ اور بھولی بسری ملکاؤں کی تلاش میں وہ اس امر کا خیال رکھتی ہیں کہ ان کے نتائج پر کیا کیا اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس اعتراض کو ذہن میں رکھتی ہیں کہ عورتیں اپنے حسن و دلربائی سے اقتدار تک جانے کی کوشش کر سکتی ہیں اور اس طرح دیگر اہلیت کے قوانین ان پر لاگو نہیں کیے جا سکتے۔ مرنیسی نے اپنی تحقیق سے جو جواب اخذ کیا ہے وہ تمام عورتوں کے لیے یک گونہ اطمینان کا باعث ہے کہ اصلی انسانی جوہر، ذہانت، معاملہ فہمی، سپاہیانہ صلاحیت، قائدانہ کردار، سیاسی سمجھ بوجھ اور قانون کے علم جیسے عوامل، جو کسی بھی لیڈر کے عروج اور کامیابی کے لیے اہم ہیں، وہ بعینہٖ ان عورتوں کے لیے بھی اہم تھے اور ان ساری خواتین کے لیے جو مقتدر نظر آئیں حسن و نسوانی کشش اہم یا اہم ترین عنصر کبھی نہ بن سکا۔ اس بنیاد پر عورتیں ایک خاص حد سے آگے نہ جا سکیں۔

مرنیسی کے ہاں تاریخی تفصیلات یا تذکرہ محض سرسری نہیں بلکہ جامع انداز کی تشریح وتعبیر کے ساتھ ملتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

خیزراں اپنے بیٹے (خلیفہ الہادی) کوقتل کرنے کا منصوبہ بناتی ہے جو کہ اس کو اقتدار کی عادت پڑ جانے کے بعد واپس حرم میں بھیج دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ عام سپاہیوں کا میری ماں سے بات چیت کرنا عزت کا معاملہ ہے۔ چنانچہ جب ایک جگہ مرنیسی کہتی ہیں کہ 'حرم کے اندر امن ہوتا ہے۔ قتل حرم کے باہر ہوتے ہیں۔' اور پھر جب خیزراں نے بیٹے کے قتل کا منصوبہ بنایا تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ تنازعہ وجود اور مکان کے درمیان ہے۔

اسلام، عورت اور تاریخ کے حوالے سے مرنیسی نے جن امور پر توجہ مرکوز رکھی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- عورت مرد کے تعلق کو پورے مسلم نظامِ معاشرت کے ایک جز کے طور پر دیکھنا۔
- جنسی نظریہ، صنفی تشخص، معاشرتی سیاسی تنظیم اور اسلام میں عورت کے مقام کے مابین تعلق کا تجزیہ کرنا۔
- عورت اور اس کی جنسیت پر وضع کردہ مردوں کے نظریات اور مباحث کو چیلنج کرنا۔
- خاموش عورتوں کو زبان دینا تا کہ وہ اپنی داستان خود بیان کرسکیں۔[۲۱]
- عورت اور جنسیت کی نظریاتی بحث کو پدریت کے چنگل سے نکالنے کی کوشش۔
- اس امر کا تجزیہ کرنا کہ مسلم معاشرے نسوانی صنف سے متعلق اپنے اندازِ فکر کو کس طرح space (مکان/ جگہ) کی ڈیزائننگ کر کے پیش کرتے ہیں تا کہ وہ صنفی امتیاز کو مستحکم کرسکیں۔

اسلامی تعلیمات میں روحانی پہلو کے ساتھ ساتھ اس مادّی ارضی دنیا کا بھی ایک بھرپور مادّی تصور موجود ہے اس لیے مکانیت، زمین پر طاقت واقتدار کا حصول اور مادّی/ ارضی دنیا کی لذتیں بھی اس کا اہم حصہ ہیں ان لذتوں میں دولت، جنس اور اقتدار شامل ہے۔ جبکہ اسلام قرونِ وسطیٰ سے نکل کر آج کی جدید دنیا میں ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے اور بھرپور توانائی ومعنویت کا حامل ہے، اسلامی بنیاد پرستی نوجوانوں اور کامیاب افراد میں ناقابلِ مزاحمت حد تک جڑ پکڑ چکی ہے۔ کیونکہ اسلام کا موضوع قوت واقتدار اور ذاتی طاقت ہے اس کے باوجود مسلم دنیا کے نوآبادیاتی دور سے لے کر آج تک کے مسائل سب حدوں کے مسائل ہیں۔ مرنیسی کا یہ نظریہ آج کے مسائل کی تشریح

میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ وہ اسلام کا بنیادی اصول یہ بتاتی ہیں کہ ہر فرد اپنی مخصوص حدود یا علاقے میں رہے گا۔ یہ مسلم فنِ تعمیر کا اصول بھی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اور جمہوریت کے درمیان تنازعے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ جمہوریت تو ہر فرد کو ہر علاقے تک رسائی دیتی ہے۔ مرنیسی اس کو cosmic conflict in nature and scale کا نام دیتی ہیں۔ وہ ایسے بنیادی سوالات پوچھتی ہیں جو پوچھے نہیں جاتے، لیکن پوچھے جانے چاہئیں، وہ بنیادی تنازعات اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کرتی ہیں اور ان کے تراشے ہوئے تصورات (concepts) اور ان سے منسلکہ معنی جن کی وہ خود تشریح بھی کرتی ہیں، نیز ان کے دلائل بہت باریک بینی اور دقیقہ رسی کے مظہر ہیں۔

مرنیسی کی تحقیق کا ایک اہم پہلو عورت کے استحصال کا ذمہ دار سیاسی ونظریاتی نظام ہے، کیونکہ خاموش، مطیع، مفعول عورت اسلام کے اصل پیغام میں نہیں ملتی بلکہ یہ حضرت محمدؐ کی زندگی کے کئی سو سال بعد کے علما کی تشکیل ہے کہ وہ پدرسری نظام کے تحفظ کی خاطر مذہبی کتابوں کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں جس کے مطابق عورت کو محدود کیا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام کے تصور کے مطابق عورت کی جنسی قوت سرگرم اور جارحانہ حد تک معاشرے میں انتشار پھیلانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ چنانچہ مردوں کی مرضی کا پُرسکون معاشرہ صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ عورتوں کے وجود اور سرگرمیوں کو محدود کر دیا جائے۔

نوآبادیاتی دور میں مغرب سے شکست کھا کر مسلم ممالک مقبوضات بنے تو سامراجیوں نے پورا زور اس بات پر لگایا کہ مسلمانوں کو ان کی کمتری کا قائل کیا جائے۔ مثلاً 'تعددِ ازدواج' پر لعن طعن کی گئی۔ مسلم خواتین کی پسماندگی کا رونا رویا گیا۔ چنانچہ ردِعمل کے طور پر مسلمانوں نے اپنا دفاع اس طرح کیا کہ دونوں کا جواز مہیا کر دیا۔ یہی سامراجی مسلم خواتین کا پدرانہ دفاع کرنا چاہتے تھے اس لیے آزادیٔ نسواں کے تحت ترک پردہ اور مغربی لباس اپنانے کا مطلب مغرب کی برتری تسلیم کرنا قرار پایا چنانچہ آزادیٔ نسواں کا مطلب غیر ملکی اثرات کے سامنے ہتھیار ڈالنا خیال کیا گیا۔

مذہبی اعتبار سے آزادیٔ نسواں کو اسلام کی فتح کے حوالے سے روکا گیا۔ جدید معاشرت میں مرد و عورت کا رشتہ اتنا مکمل اور تشفی بخش نہ ہو جائے کہ انسان کا خدا سے رشتۂ اطاعت ٹوٹ جائے،

حالانکہ جدید غیر ملکی کافر طاقتوں سے نمٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ عورت و مرد دونوں پیداواری عمل میں شریک ہوں۔ مسلم افرادی قوت بھرپور انداز میں استعمال کی جائے اور اس مقصد کے لیے عورتوں کو اب بطور کارکن اور سپاہی آگے لایا جائے جس کے لیے ان کو روایتاً مردوں کے لیے مخصوص حقوق بھی دینے ہوں گے۔ اس طرح مسلم معاشرے کو صنفی عدم مساوات کی جڑیں کاٹنا ہوں گی اور معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں امتیاز و تقسیم ختم کرنا ہوگی۔ لیکن کیا مرد و عورت کو الگ الگ رکھ کر یہ سارے مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

مرنیسی اور زمانہ حال کی عورت، مرد کشمکش

ایک مسلم سماجی محقق اور عورت ہونے کے ناطے سے مرنیسی مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہیں وہ ارتقا کی قوت اور ظہور پر مستحکم یقین رکھتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ 'وقت کے ہاتھوں روایت پرست معاشروں کی شکست وریخت یقینی ہے۔' آج مسلم معاشروں میں غریب طبقے اور کچی آبادیوں کے مکین بھی جدیدیت کے اثرات، تفریحات، نقل و حرکت اور علم و معلومات تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ آج عورتوں پر جو اثرات اہم ترین ہیں ان میں سے ایک مسلم معاشروں میں جاری بنیاد پرستی پر مبنی قدامت پرستی کی لہر ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی طرف لے جانے والی رجعت پسندی نہیں ہے، بلکہ آج مسلم دنیا کا پرانا دفاعی نظام ٹوٹ چکا ہے اور ناقابلِ مزاحمت حیران کن تبدیلیاں آرہی ہیں جو ایک مردانہ معاشرے کے اقتصادی اور منفی تشخص پر اثر انداز ہو رہی ہیں چنانچہ یہ گہری، متنوع تبدیلیاں، گہرے اور غیر منطقی اثرات بھی مرتب کر رہی ہیں، چونکہ معاشرے اپنا تشخص کھو دینے پر مرنے لگتے ہیں۔ اسی لیے تشخص کا احساس ہی دراصل زندگی کا احساس ہے بنیاد پرستوں کی طرف سے عورت سے حجاب کا مطالبہ بھی اسی تشخص کے بحران اور بے یقینی و انتشار کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے جس سے آج مسلمان گذر رہے ہیں۔ آج عورتیں حجاب ترک کر رہی ہیں اس لیے بنیاد پرست اسے اختیار کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ بنیاد پرست مردوں اور غیر بنیاد پرست عورتوں کے درمیان مفادات کی جنگ اسی زمانے میں جاری ہے۔ زیادہ تر یہ بنیاد پرست مرد دیہاتوں سے شہروں میں نقل مکانی کر کے آئے ہیں لیکن بے نقاب عورتیں شہروں کی قدیمی باسی ہیں۔

نسائی تحریک کے زور پکڑنے کے بعد اقوامِ متحدہ کی جانب سے عشرۂ خواتین منانے کے اعلان کے ساتھ عورتوں نے جب ۱۹۷۵ء کے ارد گرد نئے دعوے کرنے شروع کیے تو اس کا لازمی اثر مسلم معاشروں کے مستقبل کو لاحق خطرات کی شکل میں تھا۔ اس سے تمدنی سرحدوں کو بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ مسلم معاشرے خاصی تکنیکی جدتیں اپنے ہاں جذب کر چکے ہیں 'لیکن معاشرتی تانے بانے میں ایسی کسی بھی چیز کا انجذاب مشکل ہو جاتا ہے جس کا تعلق قوتِ مقتدرہ کی حدودِ فاصل میں تبدیلی سے ہو۔ جیسے مقابلے پر آزادانہ اتری بے نقاب عورتیں...... جب کسی بھی جدت کا تعلق فریقین کے آزادانہ چناؤ سے ہو تو سماجی تانا بانا خوفناک طور پر پھٹنے کے خدشے سے دوچار ہوتا ہے۔ لگتا ہے عورتوں کی بے نقابی بھی اسی قبیل کے معاملات میں سے ایک ہے۔'[۲۲]

مسلم دنیا میں آبادیاتی ساخت بدل گئی ہے۔ شہر کاری، دیہی شہری ہجرت، شادی کی بڑھتی ہوئی عمر، تعلیمی مدارج میں اضافہ، تعلیم یافتہ عورتوں کی کم ترین شرح افزائش جیسے یہ عوامل بتاتے ہیں کہ اسلام میں جہاں کنوارپن اور افزائشِ نسل دونوں ہی جنون کی حد تک پسندیدہ ہیں، روایتی صنفی کردار تعلیم نسواں سے متاثر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مسلم دنیا میں عورتوں کے خلاف قدامت پسندی کی لہر اٹھ رہی ہے یہ ایک طرح کا گہری تبدیلیوں کے خلاف دفاعی طریقۂ کار ہے۔ مرنیسی اس بات پر بھی اصرار کرتی ہیں کہ عورتوں کی معاشی آزادی اور فیملی کے جھگڑوں میں بھی کوئی تعلق مثبت پایا جاتا ہے۔ تعلیم عمومی طور پر معاشی حرکت پذیری کا اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہے تاہم آج کی مسلم عورتیں بڑے پیمانے پر اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں لیکن ان کو ابھی بھی منظم انداز میں سیاسی میدان سے دور رکھا جاتا ہے۔

فاطمہ مرنیسی کو عام طور پر فیمنسٹ سوشیالوجسٹ کہا جاتا ہے خود وہ بھی یہی کہتی ہیں۔ میرے خیال میں وہ ایک فیمنسٹ مؤرّخ بھی ہیں کیونکہ وہ نسائی شعور اور تاریخی شعور دونوں میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ فیمنسٹ موضوعات کی تشریح و تجزیے کے لیے تاریخ کے خزانے سے شہادتیں تلاش کرتی ہیں۔ وہ تاریخی اعتبار سے قدیم اور ازمنہ وسطیٰ تک پھیلے مواد کو سامنے رکھتی ہیں اور ایک مؤرّخ کے لیے لازمی خصوصیات کی حامل ہیں۔ مثلاً بطور عورت مرنیسی کو یہ احساس تاریخ نویسی اور تاریخ کی تشریح کرتے وقت ہمیشہ رہتا ہے کہ اسے معروضیت اور سائنسی اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے ورنہ اس پر اپنی ہم جنس مخلوق کی طرفداری کا الزام لگنا فطری اور یقینی

ہے چنانچہ وہ جن نتائج کو پیش کرتی ہیں وہ اس اعتبار کے ساتھ کرتی ہیں کہ ان کو کوئی بھی اور موّرخ و محقق چیلنج کرسکتا ہے اس طرح علمی مباحث اور انکشافات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جو خود فیمنسٹ افراد، فیمنسٹ تحریک بلکہ معاشرے کی مجموعی فلاح کے اعتبار سے بھی مفید ہے۔ بطور فیمنسٹ مرنیسی کے لیے تاریخ کا تجزیہ کرنا ایک شدید ضرورت بھی محسوس ہوتا ہے کیونکہ تاریخی عمل کا شعور، تاریخی تناظرات اور زمانۂ حال میں موجود صنفی حرکیات کی تشریح کے لیے اس نوعیت کی تحقیق لازمی تھی جو مسلم معاشروں کے تناظر میں نہیں کی گئی تھی۔ مرنیسی نے اپنی تحقیق کے ذریعے اس خلا کو پُر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تاریخ نویسی کے عمل پر مردوں کی اجارہ داری کے ساتھ ساتھ علمی تربیت سے عورتوں کو بڑے پیمانے پر محروم رکھنا اور ایک مطیع و فرمانبردار ذہنیت کو فروغ دینا بھی کئی صدیوں سے جاری تھا چنانچہ ان مروجہ خیالات کو چیلنج کرنے کی شدت سے ضرورت تھی۔ تاریخی حقائق کے صحیح شعور سے ہی عمومی طور پر قبول شدہ عورتوں کی محکومیت کو چیلنج کیا جاسکتا تھا کیونکہ معاشرہ مذہب، ریاست اور علمی نظام سب اسی محکومیت کو فروغ دے رہے تھے۔ مرنیسی نے یہ محسوس کیا کہ کئی سوالات جو عورتوں و مردوں کی عدم مساوات سے متعلق ہیں ان سے مردوں نے یا اہلِ علم نے انصاف نہیں کیا۔

یہ بات مرنیسی کی تمام تحریروں میں شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اپنی 'عورت' ہونے کی شناخت بہت اہم محسوس ہوتی ہے۔ گرچہ خود اس کی اور بھی شناختیں ہیں جیسے مسلم، مراکشی، اسکالر...... لیکن بطور ایک فیمنسٹ وہ اپنی 'عورت' ہونے کی شناخت کو جب نقطۂ آغاز بناتی ہے تو اس کا کام بہت واضح ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فیمنسٹ ہونے کے لیے کسی کا عورت یا مرد ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن مرنیسی کو عورت ہونے سے کچھ فوائد ضرور حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً اس نے اپنے شعور کو نسوانی شعور کا روپ دے کر سارے سوالات، ایک عورت کے تصورِ عالم (world view) اور ایک عورت کے سوال پوچھنے کے انداز میں کیے ہیں۔ کیونکہ نسائیت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ 'دنیا کو عورت کی نظر سے دیکھو' ان کی نظر سے دنیا کیسی نظر آتی تھی۔ مرنیسی کی تحریر یہ بتاتی ہے کہ حرم کی چار دیواروں میں جو بہت اونچی تھیں اوپر سے آسمان میں چاند نظر آتا تھا بہت تھوڑی دیر اسی طرح ستارے اور سورج بھی کم نظر آتے تھے۔ اس طرح سے اس سماج کا بیانیہ کتنا مکمل اور متنوع نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت کا تصور، دن رات کی لمبائی، سورج چاند ستاروں

کی روشنی، موسموں کے رنگ و بو، سب حرم کی چار دیواریوں میں گھرے لوگوں کے لیے کتنے مختلف کتنے محدود بلکہ کتنے مفقود معنی رکھتے تھے۔ وہ عورتیں جنھیں جس کا احساس نہ تھا یا اگر تھا تو اس کی تلافی کے لیے ان کی تخلیقی ذہانت کس طرح تصوراتی دنیا اور تخیلاتی کرداروں سے سجے تھیٹر کا سہارا لیتی تھی۔ مزید یہ کہ اس دنیا میں تشخص (identity) کس طرح تشکیل پاتا تھا، جہاں عورتیں مردوں کی واضح حاکمیت کے باوجود دوسری عورتوں اور بیٹیوں کو جبر سے بچانے کا حوصلہ رکھتی تھیں، جنھیں تفریق و امتیاز کے آئینی شکنجے کا اندازہ تھا اور جنھیں اپنی اسی جرأت و امکانات کا بھی اندازہ تھا کہ اس پدری نظام کے خلاف بغاوت بھی کی جاسکتی ہے۔ فلم دیکھنے جاتے وقت حرم سے باہر کی دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرنا اس دنیا میں نقل و حرکت اور اس بیرونی تفریح کو آزادی کا موقع سمجھ کر لباس و تزئین جسم کا خاص اہتمام اس خاص نسوانی فخر (pride) کا بھی اظہار ہے جو کہ بند دیواروں میں بھی انسانی رشتوں کے اندر پنپتا رہتا ہے۔ جہاں مرد و عورت کے رشتے شاید ذاتی سطحوں پر اتنے زیادہ جبر کا نمونہ نہ تھے لیکن جہاں سماج کے ڈھانچے میں عورتیں اجتماعی طور پر بہت جبر کا شکار تھیں۔ جہاں مشترکہ خاندانی نظام اور فیاض پدری شخصیت ساری مسائل زدہ عورتوں کو سائبان اور زندگی کا سامان تو مہیا کرتی تھی لیکن ان کے دکھوں پر مرہم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس روح کے زخموں کا مداوا جبر، بندشوں اور محتاجی پر مبنی نظام کے پاس نہ تھا۔ پدری فیاضی کا یہ نظام اس جابر و مجبور بظاہر متوازن رشتے کو طوالت دینے کا خواہشمند تھا۔

حرفِ آخر

مسلم معاشرے اور تاریخ میں عورت کے کردار کے تجزیے کے ضمن میں مرنیسی اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ: 'علما ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ اسلام اور کچھ نہیں محض حدود کا احترام ہے۔' کم از کم ۳۰۸ ہجری تک عورتوں کا مسجد میں جانا قابلِ قبول اور مروّج تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع کرنے کے رجحان کو تقویت ملتی رہی اور اس ضمن میں صدیوں تک مزاحمت میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مرنیسی کے مطابق اسلام کو محض اس مزاحمت اور جوابی مزاحمت کے حوالے سے سمجھنا اسلام میں بگاڑ پیدا کر دے گا۔ محض آقا ہی غریبوں، غلاموں اور عورتوں کو یہ نہیں بتاتے کہ وہ کمتر ہیں اور وہ محض اسی نظریے کو تسلیم کر کے اس کے مطابق زندہ رہنے پر اکتفا کرتے ہیں، بلکہ کسی

تمدن کی مکمل تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ آقاؤں کی خوشنودی، خواہشات، قوانین اور خیالات کے ساتھ ساتھ ان کی مفروضہ کمزور و بے بس رعایا کی مزاحمت کو بھی سمجھا جائے۔[۲۳] چنانچہ طاقت کے کھیل، کھلاڑیوں کی عدم برابری اور کُل کے بجائے اجزا پر توجہ مرکوز کرنے کی پیڈرسن کی شرائط کا بھی مرنیسی کے ہاں ادراک اور تعمیل پائی جاتی ہے۔

فاطمہ مرنیسی نے اپنی تحریروں میں بہت بنیادی نوعیت کے سوالات اٹھائے ہیں اور بڑی جرأت سے اٹھائے ہیں۔ پھر ان سوالوں کے جوابات کے لیے اس نے تاریخی و سائنسی انداز میں دلائل بھی مہیا کیے ہیں اس نے یہ بات واضح کردی ہے کہ ایک جانا بوجھا پردہ، حجاب یا نقاب ہے جو عورتوں کے وجود، کارکردگی اور کارناموں پر ڈال دیا گیا ہے۔ اس کا پیش کردہ مکانی حدود کا نظریہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اس کے اٹھائے گئے اہم نوعیت کے سوالات آج بھی بہت بامعنی، موزوں (relevant) اور نسائی مباحث (feminist discourse) میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً پردہ، عورتوں کی جنسیت پر کنٹرول، عورتوں کی محکومیت کی حرکیات، عورتوں کا اپنے لیے اطمینان تلاش کرنا وغیرہ۔ مرنیسی نے اسلام اور اس کی فلسفیانہ تعبیرات سے عمومی عدم مساوات بشمول صنفی عدم مساوات کے لیے جواز نہیں بلکہ جواز تلاش کرنے کی کوششوں کو آشکار کیا ہے۔ اس نے جمہوریت اور اسلام کے اندر بنیادی تضادات یا فرق کی نشاندہی کی ہے ماضی سے متعلقہ ریکارڈ کی چھان بین کے ساتھ ساتھ ان کی حالیہ تحقیق کے موضوع زمانۂ حال کے مسائل اور اس ضمن میں مرد وعورت یا اسلام کے ماننے والوں پر عائد ذمہ داریاں بھی ہیں۔ وہ ماضی میں مسلم روایتوں کے اندر مسلم عورت کو یا تو غیر موجود یا محکوم دیکھتی ہیں تو یہ اعلان کرتی ہیں کہ ماڈرن مسلم مردوں کے سامنے اہم نتائج کے حامل دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب ہے کہ یا تو وہ صنفی مساوات کی حمایت کرکے اپنے آباؤ اجداد کی نفی کریں یا کروڑوں مسلمان عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کردیں، کیا کوئی تیسرا راستہ بھی ہے جو کہ ماضی اور جدیدیت کے درمیان سمجھوتے کی طرف لے جاسکے؟[۲۴] انہیں اس مخمصے اور مشکل کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ 'ہمیں اسلام کو کلیشوں سے آزاد کرنا ہوگا' اس ضمن میں وہ حکمران طبقوں کے پیش کردہ نمونوں کو مثالی ماننے سے انکار کرتی ہیں۔ ان کی تجویز ہے کہ ہمیں عورتوں کی جوابی مزاحمت، حاشیائی نوعیت کے کیسوں اور مستثنیات کا مطالعہ کرنا ہوگا کیونکہ صرف اسی طرح اسلام میں عورتوں کی 'تاریخ' کو سمجھا جاسکتا ہے۔[۲۵]

کسی مصنف یا محقق سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے اٹھائے گئے سارے سوالوں کے جواب دے دے گا اور اس طرح سے دے گا کہ ان کو قبولِ عام کی سند حاصل ہو جائے اور ان پر کبھی کوئی تنقید نہ ہو، تحقیق اور علم کی روح کے منافی ہے۔ مرنیسی نے یقیناً بہت ہی موزوں (relevant) سوال اٹھائے ہیں۔ ان کے دیئے گئے جوابات پر کئی اعتراضات ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں، لیکن اس حوالے سے ان کی کاوشیں قابلِ قدر اور نسائی تحریک و نسائی تاریخ نویسی کے لیے اہم ہیں کہ انہوں نے مسلم دنیا میں خود اپنی تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے حال کے سوالوں کے جواب ماضی سے تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور نسائی تاریخ نویسی کی روایات کو آگے بڑھانے کے لیے بے شمار محققین کو مہمیز کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ Gerda Lerner, *The Majority Finds its Past: Placing Women in History,* Oxford University Press, 1981.

۲۔ Kamla Bhasin and Nighat Said Khan, *Some Questions on Feminism and Its Relevance in South Asia,* New Delhi: Kali for Women, 1986, p. 2.

۳۔ نسائی تحریک کے مؤرخین نے اس تحریک کی پہلی لہر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں بیان کی ہے۔ دیکھیے:

Maggie Humm, *The Dictionary of Feminist Theory,* Columbus: Ohio State University Press, 1990, p. 278.

Rebecca Walker, 'Becoming The Third Wave,' *Ms*, January-February, 1992, pp. 39-41.

۴۔ Marie Mies, *Patriarchy and Accumulation on a World Scale, Women In The International Division Of Labour,*

London: Zed Books, 1986, p. 6.

۵۔ ایضاً۔

۶۔ ایضاً،ص ۸

۷۔ Susan Pedersan, The Future of Feminist History, http://www.historians.org/perspectives/issues/2000/0010/0010viel.cfn, posted September 2007, retreived on 17 June 2010.

۸۔ Kumkum Sangari and Sudesh Vaid,*Recasting Women Essays in Colonial History,* New Delhi, Kali for Women, 1989, p. 2.

۹۔ Susan Pedersan, *op.cit.,*

۱۰۔ فاطمہ مرنیسی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ان کی ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے۔www.mernissie.net

۱۱۔ فاطمہ مرنیسی، 'حجاب سے آگے'، ترجمہ: محمد ارشد رازی، لاہور، مشعل، ۲۰۰۱ء۔

۱۲۔ Pinar Ilkkaracan (ed.)*Women and Sexuality in Muslim Societies,* Istanbul: Women For Women's Human Rights, 2000, p. 5.

۱۳۔ ہندوستان میں یہ کتاب اس نام سے چھپی ہے:

Women and Islam: An Historical and Theological Enquiry, Women's Unlimited, 2004.

۱۴۔ فاطمہ مرنیسی، 'حدود شکنی کے خواب'، ترجمہ: یاسمین حسین، سیمرغ، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۱۵۔ مصری مصنف قاسم امین کی مشہور نسائیت کو مہمیز دینے والی کتاب کے عربی متن کا عنوان 'المراۃ الجدیدہ' تھا، جس کا انگریزی ترجمہ *The Liberation Of Women* ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔

۱۶۔ Fatima Mernissie, *Women's Rebellion and Islamic Memory,* London, Zed Books, 1996, p. 92.

۱۷۔ ایضاً،ص ص ۹۵۔۹۴

۱۸۔ ایضاً،ص ۹۵

۱۹۔ Fatima Mernissie, *The Forgotton Queens of Islam,* Translation: Mary Jo Lakeland, Oxford: Polity Press, 1993, p. 3.

۲۰۔ ایضاً،ص ۴

۲۱۔ اس کے ثبوت کے طور پر دیکھیے فاطمہ مرنیسی کی کتاب *Doing Daily Battles,* (1989)، جو کارکن محنت کش مراکشی عورتوں کے انٹرویوز پر مبنی ہے۔تاہم اس کو تاریخی تجزیے پر مبنی اس مضمون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

۲۲۔ فاطمہ مرنیسی، 'حجاب سے آگے'،محولہ بالا،ص ۱۹

۲۳۔ Fatima Mernissie, *The Forgotton Queens of Islam, op.cit.,* p. 84

۲۴۔ Fatima Mernissie, *Women's Rebellion and Islamic Memory, op.cit.,* p. 77

۲۵۔ Fatima Mernissie, *The Forgotton Queens of Islam, op.cit.,* p. 84

پاکستانی عورت، ایک بدلتے ہوئے سماج میں

حمزہ علوی

ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

۱۹۸۰ کی دہائی حقیقی معنوں میں پاکستان میں خواتین کی دہائی کہی جا سکتی ہے۔ خواتین کی ایک بھرپور اور طاقتور تحریک نے پاکستان کے سیاسی منظرنامے پر ایک ڈرامائی اثر ڈالا۔ اس تحریک کی سب سے ٹھوس کامیابی جنرل ضیاء الحق کی ان پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانا تھا جو کہ وہ اسلام کے نام پر اس ملک میں خواتین کے خلاف نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران بہت ساری تنظیموں نے خواتین کے حقوق کی بحالی کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا جس میں وومین ایکشن فورم (Women Action Forum) بھی شامل تھا بلکہ یہ کہنا بیجا نا ہوگا کہ WAF اس تحریک میں کلیدی کردار ادا کر رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ ساتھ ڈیموکریٹک وومن ایسوسی ایشن، سندھیانی تحریک، آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن (APWA) (جس کو قبل ازیں سینئر بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی بیگمات چلاتی آئی تھیں اور جو حکومت کی سرپرستی میں ایک اصلاح پسندآنہ ایجنڈے پر سرکاری سرپرستانہ ماحول میں کام کرتی تھی)۔ یہ تنظیمیں بھی احتجاج میں شریک ہو گئیں۔

۱۹۸۰ کی دہائی پاکستان میں خواتین کی سماجی حیثیت کی تنزلی کی بھی دہائی تھی۔ ضیاء حکومت نے اپنے اقتدار کو جواز فراہم کرنے کے لیے اسلام کے نام پر ایسے اقدامات اٹھانے اور

پروفیسر حمزہ علوی نے یہ مقالہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اواخر میں تحریر کیا تھا۔ ایک اہم سماجی سائنسدان کی تحریر ہونے کے ناطے اس کی جو اہمیت ہے اس کے پیشِ نظر 'تاریخ' کی اس خصوصی اشاعت میں اس کو شامل کیا جا رہا ہے۔

قوانین بنانے کی کوششیں کیں جس کے باعث خواتین کے لیے ان کے قانونی حقوق، تعلیمی سہولیات اور ملازمتوں کے مواقعوں کے ساتھ ان کی آزادی حرکت اور مردوں سے تحفظ جیسے مسائل پیدا ہو گئے۔ ان تمام اقدامات کے باعث خواتین نے اپنے حقوق کے دفاع کے لیے خود کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ مارشل لاء حکومت کے اقدامات، دعووں اور پروپیگنڈے کے نتیجے میں ایک ایسا ماحول ترتیب پایا جس میں انتہا پسندوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے اور خواتین کو اسلامی قوانین کے مطابق لباس نہ پہننے اور سر عام پھرنے پر ہراساں اور پریشان کرنے کی کھلی چھوٹ حاصل ہو گئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کام مذہب کے نام پر ہو رہا تھا۔ یہ قانون شکنی بغیر کسی پریشانی کے جاری تھی۔ خواتین کو نہ صرف اپنے آپ کو ریاستی اقدامات سے بچانا تھا بلکہ ان معاشرتی انتہاپسندوں سے بھی لڑنا تھا۔ ایسے حملے آج بھی جاری ہیں لیکن خواتین ان سے نبرد آزما ہیں۔

اس تبدیلی اور ترقی کو آزادی کے بعد گذشتہ چار دہائیوں کے دوران پاکستانی معاشرے میں آنے والی تبدیلی کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس نے خواتین کے سماجی مقام پر بڑا منفی اثر ڈالا ہے۔ اس مضمون میں ہم ملک کے دیہی اور شہری معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کرینگے لیکن زیادہ توجہ شہری معاشرے پر مرکوز رہے گی جہاں یہ تبدیلی زیادہ واضح تھی اور جہاں ان حکومتی اقدامات کو طاقتور طریقوں سے چیلنج کیا گیا۔

تاہم یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کے چاہے دیہی معاشرہ ہو یا شہری پاکستان میں معاشرتی نظام بڑی سختی سے مردانہ ہے جہاں عورت ایک 'حاصل' (acquired) اور 'دی گئی' (given) نجی ملکیت (chattel) تصور کی جاتی ہے چاہے یہ باقاعدہ شادیوں کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو جہاں عورت کو اپنی بقیہ زندگی مردانہ بالادست معاشرے میں مردوں کی خدمت کرتے گزارنا پڑتی ہے۔ عام طور پر خواتین کی شادی برادری کے اندر ہی کر دی جاتی ہے اور برادری کا نظام ہی عورت کی زندگی کے لیے قاعدے قانون مرتب کرتا ہے۔ باہمی تعاون کے برادری کے نظام میں برادری کی پنچایت بڑا اہم کردار حاصل کر لیتی ہے جو کہ عورت کی شادی اور اس کی بقیہ زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد اکیلے ہی فیصلے نہیں کرتا بلکہ مردوں کے اس معاشرے میں پورا معاشرہ عورت کے مقابل مرد ہی کا ساتھ دیتا ہے۔ کوئی عورت

چاہے وہ شہروں میں کام کرنے والی خود مختار خاتون ہی کیوں نہ ہو اپنے گھر میں اپنی مرضی سے کسی عورت کو تحفظ 'سایہ' بھی فراہم نہیں کرسکتی۔ ایک مطلقہ یا بیوہ عورت کو اپنے تحفظ کے لیے اپنی بقیہ زندگی کے دوران اپنے باپ یا بھائی کی طرف دیکھنا ہوتا ہے سوائے اس صورت میں کہ اس کے بالغ بیٹے ہوں جو اسے تحفظ فراہم کرسکیں اور جن کے ساتھ وہ رہ سکے۔ یہ چیز معاشرے میں عورت کو زیر دست لانے کا ایک انتہائی اہم عنصر ہے۔ عمومی طور پر نہ سہی لیکن پھر بھی کئی مرتبہ معاشرے کے غریب افراد خصوصی طور پر شہروں میں بسنے والے کمّی (kammis) یا 'دیہی ملازمین' اپنی بیٹیوں کو دولت کے عوض فروخت کردیتے ہیں۔ کئی موقعوں پر تو شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر فروخت کردیتے ہیں۔ وہ خواتین جو مردوں کے اس فیصلے سے متفق نہ ہوں اس صورت میں بھی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ انہیں مردوں کے اس فیصلے کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان مردوں کے لیے عورت ایک قیمتی چیز (valued object) ہے۔ وہ ایک قابل فروخت تحفہ ہے۔

آبادی کے شماریات (Demographic Statistics) پاکستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں کے متعلق کافی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ پاکستان شاید دنیا میں وہ منفرد ملک ہو جہاں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد کم ہے۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں ایک ہزار افراد کے مقابلے میں خواتین کی تعداد ۹۰۶ جبکہ بقیہ دنیا میں اوسطا ایک سو مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد ایک سو گیارہ ہے۔ آبادی کے اس گروہ میں جس کی عمر ۴۰۔۱۵ سال کے درمیان ہے۔ اس گروہ میں خواتین کی اموات کی شرح مردوں کے مقابلے میں ۵۷ فیصد زیادہ ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ خواتین کو ملنے والی کم خوراک ہے جو کہ ان کی صحت پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ عام طور پر خواتین کو کھانے کو بہت کم دیا جاتا ہے کہیں تو بچا کچا ہی انکا نصیب ہوتا ہے۔ اس کم خوراکی کی وجہ سے انکا مدافعتی عمل کمزور ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث انکا کئی جان لیوا بیماریوں مثلاً ملیریا، سانس کی تکلیف، ٹی بی، پیٹ کے امراض وغیرہ کا شکار ہوکر بڑی کم عمری میں موت کا شکار ہو جانا عام سی بات ہے۔ حمل کی پیچیدگیوں اور زیادہ بچے کرنے کی وجہ سے خواتین کا مزید بیماریوں کا شکار ہو جانا بھی عام سی بات ہے۔ شہری علاقوں میں نچلے درمیانی طبقوں میں معاشرتی اور نفسیاتی مسائل اور چار دیواری کی قید و بند کی اضافی سختیاں ان خواتین میں

دیگر مسائل کو جنم دینے کا باعث بنتی ہیں۔ ان بند گھروں میں وہ بمشکل سورج کی روشنی اور تازہ ہوا حاصل کر سکتی ہیں اور انہیں تفریح کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا جبکہ ان کے مقابلے میں مردوں کو گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی ہے اور گھروں کی اس خستہ حالی کا مردوں پر شاید ہی اثر ہوتا ہو۔

پاکستان میں جب عورت کے اس استحصال اور ان کے ساتھ رواں رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کی بہتری کے لیے مطالبہ کیا جائے تو پاکستان کے مذہبی انتہا پسند اس پر واضح بات کرنے کے بجائے عورت کے بارے میں اسلام کے مثالی قوانین کی طرف توجہ مرکوز کرانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مثالی نظام کا ذکر دراصل پاکستانی معاشرے کی خواتین کے اصل مسائل سے توجہ ہٹانا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ پاکستان میں خواتین کی سماجی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے حقیقی حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ پاکستانی معاشرے میں کئی قسم کی تبدیلیاں (مثبت و منفی) آ رہی ہے جو ایک طرف جہاں عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر کرنے کا باعث بن رہی ہیں تو دوسری طرف اس کے نتیجے میں ان کی سماجی حیثیت مزید بد سے بدتر بھی ہوتی جا رہی ہے۔

دیہی علاقوں میں عورت کی سماجی حیثیت اور کام کی تقسیم میں اس کا مقام اور کردار مختلف علاقوں اور طبقوں میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہر طرف ان تبدیلیوں کے بڑے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں پر صرف دو مثالیں دی جائیں گی۔ پہلی مثال شمال مغربی پنجاب کا پوٹوہاری علاقہ ہے۔ اس علاقے میں کام کرنے والی عمر کے بیشتر افراد فوج میں ملازمت کے حصول کے باعث اپنے گاؤں چھوڑ چکے ہوتے ہیں یا پھر پاکستان کے مختلف علاقوں میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے باعث علاقے سے دور رہتے ہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ لوگ مشرق وسطیٰ، برطانیہ اور یورپ کے کئی ممالک میں ملازمت کے لیے مصروف عمل ہیں اور ان ممالک کے قوانین یا معاشی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے خاندانوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے خاندان کے افراد اپنے آبائی علاقوں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ جس کے باعث اس علاقے کے کئی دیہاتوں میں تو انتہائی غیر معمولی صورتحال کا سامنا ہے۔ بیشتر افراد یا تو بوڑھے ہو چکے ہیں یا پھر ان افراد میں بچے اور خواتین شامل ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان علاقوں میں خواتین کو دوہرے کام کرنا پڑتے ہیں۔ گھر کے اندرونی کاموں کے علاوہ زمینوں کی

دیکھ بھال اور کسی حد تک معاشی بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

اس کے مقابل پنجاب کے نہری اور نسبتاً خوشحال اضلاع میں زرعی / سبز انقلاب کے نتیجے میں خواتین کھیتی باڑی اور زراعت کے شعبے سے علیحدہ ہو کر پردے میں مقید ہوگئی ہیں۔ اس تبدیلی سے کچھ دہائیوں قبل تک سوائے چند جاگیردار خاندانوں کے، باقی خواتین زراعت کے شعبے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ وہ بیج بونے، فصل کی دیکھ بھال سے لے کر اس کی کٹائی تک کے مراحل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ ان کے کام میں شامل تھا کہ جانوروں کے لیے چارہ کاٹیں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔ اس طرح یہ خواتین پردے میں مقید نہیں ہوتی تھیں بلکہ انہیں کسی حد تک آزادی سے گھومنے پھرنے کی سہولت بھی میسر تھی۔ ایک اور رسم جو کہ انہیں کسی حد تک اقتصادی آزادی مہیا کرتی تھی وہ کپاس کی چنائی تھی لیکن اب ہونے والی ترقی کے نتیجے میں اس کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کام سے منسلک خواتین کو اس کی ادائیگی اجناس کی صورت میں کی جاتی ہے۔ اپنی محنت کے نتیجے میں ان کو ملنے والی کپاس ان کی محنت کا مکمل بدل نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ ان کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے جس پر مرد ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کپاس کی چنائی کے بعد یہ مناظر عام دیکھے جا سکتے ہیں کہ خواتین اپنے سروں پر کپاس کے ٹوکرے اٹھائے مارکیٹوں میں خریداری کے لیے گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کئی مواقع پر اس پر کپاس کے بدلے Barter کے ذریعے اشیاء خریدی جاتی ہیں اور خواتین کے لیے یہ خوشی کا لمحہ ہوتا ہے کے ایسے موقع پر اپنے شوہر کی اجازت کے بنا اپنے اور اپنے بچوں کے لیے پسند کی چیزیں خرید سکتی ہیں۔ سبز انقلاب کے بعد ۱۹۷۰ کی دہائی میں بہت سے نسبتاً خوشحال کسانوں نے اپنی خواتین کو کھیتوں میں کام کرنے سے ہٹا کر انہیں گھر کی چار دیواری میں مقید کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے معاشرے میں اپنے لیے بہتر سماجی رتبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں تحقیق کرتے ہوئے میں اور میری بیگم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ اس تبدیلی نے عورت کو اضافی کام سے آزادی دی ہے لیکن وہ اس تبدیلی سے خوش نہیں ہوئی۔ کئی خواتین نے میری بیوی کو اس نئی صورتحال کو جیل میں قید ہونے کے مترادف قرار دیا۔ ان کے خیال میں اس طرح خواتین کو ان کی تھوڑی سی اقتصادی آزادی اور گھومنے پھرنے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ جب کوئی فرد اس تبدیلی کے اثرات کا جائزہ لینا چاہے تو اس کو عورت کی محنت کے استحصال (Exploitation) اور عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتی

(Oppression) کے درمیان تفریق ضرور کرنا چاہئے۔ یہ بات تو مسلمہ ہے کہ عورت پر سے محنت کا بار (بیشک) بڑی معمولی سطح تک ہی سہی کچھ حد تک کم بہر حال ہوا ہے لیکن ان پر ظلم وزیادتی بڑی حد تک بڑھ گئی ہے۔ خواتین بھی اس تبدیلی کو اپنے حقوق سے محرومی سے تعبیر کرتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں شہری علاقوں میں خاندانی معیشت میں خواتین کا کردار گذشتہ ۴۰ برسوں کے مقابلے میں بڑی حد تک بڑھ چکا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان تبدیلیوں کے اثرات بالائی طبقوں اور محنت کش طبقوں کے مقابلے میں نچلے درمیانی طبقوں کے خاندانوں پر زیادہ گہرے ہیں۔ پاکستان کے شہروں میں محنت کش طبقے کی ایک بڑی تعداد کا تعلق ان مہاجرین محنت کشوں پر مشتمل ہے جو ملک کے شمالی علاقے سے نکل کر اب ملک کے بڑے شہروں میں ذریعۂ معاش سے منسلک ہیں جبکہ ان کے خاندان اب بھی اپنے گاؤں دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم ان محنت کشوں کے متعلق بہت ہی کم جانتے ہیں جو کہ تنہا شہروں میں رہائش پذیر ہیں اور نا ہی ہمیں ان کے خاندانوں سے متعلق کسی قسم کی تفصیلات سے آگاہی حاصل ہے جو کہ اب بھی دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ محنت کش ہیں جو اپنے خاندان کو اپنے ساتھ شہروں میں رکھتے ہیں ان کی خواتین اکثر غیر رسمی معاشی نظام (Informal economy) کے تحت کارخانوں اور فیکٹریوں میں غیر فنی (unskilled) یا پھر غیر رسمی معاشی انتظام کے تحت گھروں میں ملازمت کے پیشے سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر خواتین گھریلو کاموں کے مقابلے میں کارخانوں کی ملازمت کو ترجیح دیتی ہیں جس کی شاید ایک وجہ بہتر تنخواہ ہو۔ اس کے باوجود کہ خواتین دوہرے کام کر کے اپنے خاندان کی معاشی آمدنی میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، حالیہ دنوں میں عدالتوں کے مقدمات میں پیش ہونیوالی گواہیوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت آج بھی مردانہ معاشرے میں استحصال کا بہت بری طرح شکار ہے۔

اس کے مقابلے میں بالائی خوشحال طبقوں کی خواتین کے مسائل بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ ان کے گھروں پر کام کے لیے ملازمین بھی مہیا رہتے ہیں اور ان پر ملازمت کرنے کا کوئی دباؤ بھی نہیں ہوتا اور کئی مراحل پر تو انہیں ملازمت کرنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ ان خواتین کو اپنے شوہروں پر مکمل انحصار کرنا پڑتا ہے اور انہیں اس بات کا بھی خوف لگا رہتا ہے کہ ان کے خوشحال شوہر کسی بھی مرحلے پر دوسری بیوی لا سکتے ہیں۔ اپنی انفرادی حیثیت نہ بنانے کے باعث

اور کوئی ملازمت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے یہ خواتین اپنے لیے کوئی آزادانہ ماحول نہیں بنا سکتیں اور انہیں بیشتر مواقع اپنے خاندان کے سربراہ یا شوہر پر کلی طور پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ان کی حیثیت اس غلام سے زیادہ نہیں ہوتی جسے بہت اچھی طرح کھلایا جائے، نفیس لباس پہنایا جائے اور زروجواہرات سے لاد دیا جائے لیکن ان تمام آسائش کے باوجود وہ کلی طور پر اپنے شوہر کے رحم وکرم پر ہوں۔ جہاں پر شوہر چاہے ان کے ساتھ جتنی بھی زیادتی اور بدتمیزی کرے انہیں ان کے ساتھ ہی رہنا ہوتا ہے۔ سماجی قیدوبند کے باعث بعض اوقات پیشہ ورانہ خواتین کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کے مقابلے میں نو دولتیوں میں برادری کے اندر کی خاتون کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج ہے جو چاہے زیادہ پڑھی لکھی اور فیشن ایبل نہ ہوں۔ اس قسم کی شادیاں کسی حد تک روایتی شادیوں کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ اس روایتی شادی کے ساتھ ساتھ نو دولتیے بعدازاں ایک ایسی پڑھی لکھی مہذب اور خوبصورت خاتون کی تلاش میں رہتے ہیں جو کہ اس کے دوستوں، ساتھیوں، کاروباری افراد اور بیوروکریٹس کے لیے ایک اچھی میزبان اور ان کی بہتر خاطر مدارت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ پہلی بیوی پرانے جوتے کی طرح بے وقعت ہوجاتی ہے۔ وہ طلاق حاصل کرنے کی جرات نہیں کرسکتی کیونکہ وہ کہیں اور جانے کا سوچ ہی نہیں سکتی۔ اس کے پس پشت وہ معاشرتی خوف حائل ہوتا ہے جس میں ایک مطلقہ عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور شادی کی ناکامی کے لیے بھی اسے ہی موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن وہ خواتین خوش نصیب کہی جاسکتی ہیں جن کے جوان بیٹے ہوں اور وہ اپنی ماں کا خیال کرتے ہوئے اس کے لیے علیحدہ گھر اور رہائش کا انتظام کرسکیں لیکن عام بالائی طبقے کی خواتین اپنی زندگیاں پریشانی اور غیر محفوظ ماحول میں گزارتی ہیں۔ یہ صورت حال کتنی عام ہے اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔

مغرب کے بالمقابل پاکستان میں اب بھی خاندانی روایات کی معاشرے پر بڑی گہری گرفت ہے اور ان کی اور خلاف ورزی معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ جس پر بعض اوقات سزا کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے لیکن امراء اور بااثر طبقے جو کہ شہروں کے بلاد العروس (cosmopolitan) ماحول میں رہتے ہیں۔ ان پر پابندیاں کوئی خاص اثر نہیں ڈالتیں۔ عام طور پر خیال یہ کیا جاسکتا ہے کہ نچلے طبقوں کے مرد حضرات دوسری شادی کی طرف کم مائل ہوتے

ہیں لیکن اس کے پس پشت دراصل وہ معاشی مسائل ہوتے ہیں جن کے باعث وہ بیک وقت دو بیویوں کے بوجھ کے متحمل نہیں ہوسکتے اور مزید اپنے لیے الجھنیں پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

نچلے درمیانی طبقے کے خاندانوں میں ہم دو قسم کی تقسیم دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وہ خاندان ہیں جن کی خواتین نسبتاً پڑھی لکھی ہیں اور 'عزت دار' نوکری حاصل کرنے کی بھی اہل ہیں جبکہ دوسری طرف وہ روایتی خاندان ہیں جنکی خواتین نے بہتر تعلیم حاصل نہیں کی اور کوئی 'عزت دار' نوکری حاصل کرنے کے اہل بھی نہیں۔ پہلے قسم کی خواتین اپنی تعلیم کی بنیاد پر ملازمتیں حاصل کرلیتی ہیں جبکہ دوسرے قسم کے کیس میں خواتین گھروں میں کام کرنے یا پھر چھوٹے کارخانوں میں اپنی محنت فروخت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جہاں اکثر و بیشتر ان کی محنت کو بڑے سستے معاوضے کے عوض استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے پاکستانی معاشرے کو اسلامائز کرنے کے عمل سے سب سے زیادہ متاثر پہلی قسم کی خواتین ہوئیں اور بالآخر انہوں نے ہی ان اقدامات کے خلاف ۸۰ کی دہائی میں احتجاجی تحریک شروع کی۔ پاکستانی معاشرے میں آنے والے بحرانات کی بنیادی وجہ گزشتہ ۴۰ برسوں کے دوران نچلے یا نچلے درمیانی طبقے کے بڑھتے ہوئے مسائل ہیں۔ آزادی کے وقت یہ ایک عمومی تاثر تھا کہ مرد خاندان کی کفالت کا کلی طور پر ذمہ دار ہوگا اور مشترکہ خاندانی نظام کو فوقیت دی جاتی تھی جس کی اہم وجوہات اقتصادی تھیں۔ مشترکہ خاندان میں خاندان کا سربراہ اس کے بھائی، بیٹے، پوتے سب ملکر کام کرتے تھے اور خاندان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ اس خاندانی نظام کی عورت گھریلو محنت کے بوجھ تلے دب کر خاندان کی اقتصادی مدد کرنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ شہری نچلے درمیانی طبقے کی خواتین سب سے زیادہ دباؤ کا شکار تھیں۔ یہ خواتین پردے، چادر اور چار دیواری کی پابندی کا بری طرح شکار رہتی ہیں۔ اس کے مقابل گاؤں، دیہاتوں میں رہائش پذیر خواتین جو کہ پردہ نشین ہونے کے باوجود نسبتاً آزادی سے دوسری خواتین سے رابطے کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں اور یقیناً یہ رابطے انہیں کئی مواقعوں پر ضروری مدد بھی فراہم کرتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح قدیم شہروں کے پرانے علاقوں اور محلوں میں رہنے والی خواتین بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھاسکتی تھیں لیکن پاکستان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے شہروں میں پرانا سماجی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ ان حالات میں شہروں کے نچلے درمیانی طبقے کی خواتین حقیقی معنوں میں اپنے گھروں میں مقید ہوکر رہ

گئی ہیں۔ نئے حالات میں انہیں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملاقاتوں کے لیے ذرائع آمدورفت کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاکستان میں پچھلی کئی دہائیوں سے بڑھتے ہوئے افراطِ زر کے باعث روزمرہ کے اخراجات میں بڑی حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں خاندان کے کفیل مردوں کی آمدنی اس رفتار سے نہیں بڑھی۔ اب آمدنی روزمرہ کی ضروریات پورا کرنے کے لیے تقریباً ناکافی ہے اس لیے اس بات کا شدید دباؤ ہے کہ خاندان کی آمدنی کو بڑھانے کے لیے دیگر ذرائع کو مزید وسعت دی جائے جس کی وجہ سے آہستہ اور دھیرے دھیرے زیادہ سے زیادہ خواتین مجبور ہوگئیں کہ وہ ملازمت کے نئے ذرائع تلاش کرتے ہوئے اپنے خاندان کا معاشی بوجھ کم کریں۔ یہ تبدیلی بڑی واضح اور اہم ہے۔ ابتدائی طور پر چند پیشے ہی ایسے 'باعزت' سمجھے گئے جہاں پر یہ خواتین کام کرسکتی تھیں لیکن جلد ہی ملازمتوں کی کمی اور محنت کشوں کی زیادتی کی وجہ سے عزت دار ملازمت کا تصور دھیرے دھیرے وسیع ہوتا چلا گیا اور اب اس میں بہت ساری دیگر ملازمتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ ابتدائی طور پر اعلیٰ پائے کی ملازمتوں خاص طور پر معالج، تدریسی پیشہ (خاص طور پر طالبات کی درسگاہیں وغیرہ ان میں شامل تھیں) انہیں عزت دار ملازمت سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے ڈاکٹر اور اسکول اساتذہ کی ایک تہائی تعداد خواتین ملازمین پر مشتمل تھی لیکن دھیرے دھیرے اس میں تبدیلی آئی اور عزت داری کے دائرے میں کلیریکل ملازمتیں بھی شامل ہوگئیں۔ جہاں خواتین دفاتر میں مردوں کے ساتھ ملازمت کرتی تھیں۔ ان ملازمتوں میں معاونِ خاص (پرائیویٹ سیکریٹری) کی ملازمت کو بڑے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس پیشے سے منسلک خواتین کی تنخواہیں نسبتاً زیادہ بہتر تھیں جس کی وجہ ملازم کا اپنے آجر سے بڑا قریبی ہونا تھا۔ لیکن اس میں بھی اب نسبتاً تبدیلی آگئی ہے۔ آج خواتین کو مختلف شعبوں میں کام کرتے دیکھا جاسکتا ہے جس میں لیبارٹری اسسٹنٹ، ریلوے اسٹیشن کا ٹکٹ کلکیٹر، پوسٹ آفس کے کلرک سے لے کر وکیل، آرکیٹیکٹ، انجینئر، صحافی اور ٹی۔وی اور ریڈیو پر کام کرنے والے شعبے بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کے ان شعبوں میں خواتین کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ تنخواہ دار ملازمتوں میں خواتین کے زیادہ آنے اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔ اب خواتین تیزی سے ملازمتیں حاصل کر رہی ہیں اور بالائی طبقوں کی خواتین صرف اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت حاصل کرنے پر ہی

مجبور نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی انفرادی شناخت کے لیے بھی لڑ رہی ہیں۔

تعلیم عزت دار اور معاشرے کے قابل قبول شعبوں ملازمتوں کے حصول کے لیے بنیادی عنصر ہے۔ نچلے درمیانی طبقے کی ناخواندہ خواتین کے لیے کسی عزت دار ملازمت کا انتظام کیا جانا ناممکن بات میں ہے۔ اس لیے یہ خواتین گھروں یا چھوٹے کارخانوں میں محنت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں اور ان شعبوں سے منسلک خواتین کے لیے بنیادی ضرورت تعلیم نہیں جبکہ اس کے مقابلے میں وہ خاندان جو کہ اپنی خواتین کو درس وتدریس یا دفتری ماحول میں کام کرنے یا دیگر کام کرنے یا بہتر ملازمتوں سے منسلک کرنا چاہتے ہیں اب وہ خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بالکل اسی طرح اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں جیسے کہ اپنے لڑکوں کو۔ ایک وہ بھی وقت تھا جب خواتین کی تعلیم کو وقت اور پیسے کا ضیاع سمجھا جاتا تھا لیکن اب خواتین کی تعلیم کے لیے دباؤ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور کئی پیشہ ور مرد پڑھی لکھی خواتین سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں چاہے وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ایک اور تصور بھی ہے جس کے تحت عورت اپنے شوہر سے زیادہ پڑھی لکھی (Over qualified) ہو بیشتر اوقات وہ ایسے رشتوں میں نقصان میں ہی رہتی ہیں۔ ایسے رشتے اکثر اوقات بعد ازاں ناکام ہو جاتے ہیں خاص طور پر اس ماحول میں جہاں شوہر اور بیوی ایک ہی جگہ کام کر رہے ہوں مثلاً درس وتدریس کا شعبہ اور وہاں بیوی اپنی قابلیت کی بنیاد پر ترقی کرتے ہوئے شوہر سے آگے نکل جائے تو اس صورت میں مرد کی جھوٹی انا کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ اس صورتحال میں عورت اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لیے قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہیں کیونکہ شادی کی ناکامی کی صورت میں اسے بڑے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود کچھ شادیاں بالآخر ناکامی پر ہی اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

اس بدلتی ہوئی سماجی صورتحال اور نچلے درمیانے طبقے کے خاندانوں میں خواتین کی بڑھتی ہوئی خواندگی اور ملازمتوں سے منسلک ہو جانے کے باعث گھریلو اقتصادیات میں خواتین کے بڑھتے ہوئے کردار نیز خاندان کے اقتصادی نظام اور تبدیل ہوتی ہوئی اقدار اور رویوں کو جنرل ضیاء الحق کی اسلامی بنیاد پرستانہ پالیسیوں سے شدید خطرہ لاحق ہو چلا تھا۔ اس لیے اکثر اوقات ان خاندانوں نے اسلام کے جدیدیت اور روشن خیالی کے فلسفے کو اپنانے کو ترجیح دی۔ یہ خاندان بنیاد پرست ملاؤں کے قدامت پرستانہ اسلامی نظریات کے بارے میں شاکی ہو گئے۔ پاکستان میں

سماجی اور سیاسی زندگی میں سیکولر خیالات کے لیے بڑی وسیع گنجائش موجود ہے جس کی عکاسی ۱۹۸۵، ۱۹۸۷ (بلدیاتی انتخابات) اور پھر ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی جیسی بنیاد پرست جماعتوں کی بری طرح شکست تھی۔

اس کے باوجود پاکستان میں ایسے کئی نچلے درمیانی طبقے کے خاندان ہیں جہاں خواتین کو ایسی تعلیم سے آراستہ نہیں کیا گیا جو کہ انھیں 'باعزت' تنخواہ دار ملازمتیں مہیا کر سکے۔ روایتی طور پر ایسی خواتین گھریلو کام کاج سے ہی منسلک رہ جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ خواتین کے لیے روزگار کے دیگر ذرائع کھلتے چلے جارہے ہیں۔ اب ایسی فیکٹریاں بھی ہیں جہاں صرف خواتین ہی مصروف عمل ہیں خاص طور پر تیار شدہ ملبوسات کی تیاری، اسی طرح کپڑوں کی سلائی اور finishing سے منسلک شعبے ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان پیشوں سے وابستہ خواتین کو ان کی اجرت ان کی محنت کے مقابلے میں بڑی کم ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس طبقے کی محنت کش خواتین کا استحصال ان کے گھر یعنی چادر و چار دیواری کو چھوڑے بغیر ایک اور طریقے سے بھی کیا جاتا ہے جس کے تحت انہیں ان کے گھروں پر خام مال پہنچا دیا جاتا ہے اور تیار شدہ مال بعض اوقات ان کے گھروں سے وصول کر لیا جاتا ہے طویل گھنٹوں تک سخت محنت کرنے کے باوجود ان محنت کش خواتین کو اس رقم کا عشر عشیر تک نہیں ملتا جو کہ فیکٹریوں یا کارخانے میں جا کر کام کرنے والی خواتین کو ملتا ہے۔ لیکن وہ خواتین جو کہ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں وہ مجبوراً ہی سہی اسی قسم کے کام کو فوقیت دیتی ہیں۔

ایسے کیسز میں ہمیں دو رجحانات (patterns) دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس اعداد و شمار موجود نہیں جس کی بنیاد پر کسی ایک کی دوسرے پر اہمیت ثابت کر سکیں۔ پہلے طریقہ کار میں خاندان کے مرد سربراہ کارخانے کے مالکان کیساتھ گفت و شنید کر کے مال کی تیاری کے آرڈر گھر لے آتے ہیں اور بعد از محنت تیار مال کارخانے پہنچا کر محنت کش خواتین کا پیسہ خود ہڑپ کر جاتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں اس قسم کی خواتین اپنے شوہروں کے لیے غلام / لونڈی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ خواتین اپنے مردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ وہ ان خواتین کے ساتھ غلاموں جیسا بھیانک سلوک کرتے ہیں اور انہیں اس کام کے لیے دقیانوسی خیالات رکھنے والے تنگ نظر ملاؤں کی مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے دل

کی تسلی کے لیے یہ مرد حضرات ان خواتین کو جو کہ اپنے گھر سے باہر نکل کر کارخانوں اور دیگر جگہوں پر کام کرتی ہیں ان کے بدکردار ہونے اور ان کے اس عمل کو غیر شرعی کہنے سے بھی باز نہیں آتے اور اپنی چار دیواری میں محبوس خواتین کو باکردار اور پاکدامن سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں گھر سے باہر نکل کر 'غیر محرم' افراد سے رابطہ نہیں کرنا پڑتا۔ دیکھا جائے تو نظریاتی طور پر اسلام کی بنیاد پرستانہ تعبیر عورت کے اوپر مرد کی حاکمیت تسلیم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور طریقہ کار بھی رواج پذیر ہے جس کے تحت چھوٹے کارخانوں کی خواتین ایجنٹ کارخانے کے قریبی علاقوں کی کچی آبادیوں میں گھوم پھر کر محنت کے آرڈر اور مال تقسیم کرتی ہیں اور پھر ان تیار شدہ اشیاء کو اکھٹا کر کے یہ خواتین ایجنٹ ان محنت کش خواتین کو انکا معاوضہ براہ راست پہنچا دیتی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے کام پر اب تک کوئی باقاعدہ تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے کسی تصدیق شدہ اعداد و شمار کی عدم دستیابی کے باعث یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کے تعلق سے محنت کش عورت کو کس قدر فائدہ پہنچتا ہے۔ زرینہ بھٹی الہ آباد کی بیڑی بنانے والی خواتین پر ایک تحقیقی کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ خواتین اپنے گھر کا ۴۵ فیصد سے زیادہ بوجھ برداشت کرتی ہیں جس کی وجہ سے خاندانی معاملات میں انکا کردار بڑا اہم ہو جاتا ہے یعنی پیسے کی بنیاد پر ان کی بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بھارت کے ایک مسلمان دیہی معاشرے میں کی گئی تحقیق کا پاکستان کے نچلے درمیانی شہری خاندانوں سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر کئی ایسے مسائل ہیں جو کہ پاکستان کے سماجی تناظر میں مزید سائنسی بنیادوں پر تحقیق کے متقاضی ہیں۔ گھر میں مقید محنت کش خواتین خود کو باہر جا کر کام کرنے والی خواتین کے مقابلے میں اس لیے بہتر سمجھتی ہیں کہ وہ گھر میں رہتے ہوئے کام کرنے کی وجہ سے مذہبی تعلیمات سے انحراف کرنے کا باعث نہیں بنتیں۔ ان کے خیال میں وہ گھر میں رہ کر اخلاقی اقدار کی بہتر طور پر پاسداری کر سکتی ہیں۔ گھروں میں مقید ہونے والی ان خواتین پر مرد حضرات باآسانی اپنا حکم چلا سکتے ہیں بالمقابل ان خواتین کے جو کہ گھروں سے باہر نکل کر محنت کرتی ہیں۔ ان خواتین کو عوامی احتجاجی جلسوں میں بھی شریک کیا جا سکتا ہے لیکن یہ مرد اس موقع پر بھی ان مجبور خواتین کو مکمل طور پر برقعے اور پردے میں باہر نکالتے ہیں اور وہ سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ڈھانپے رکھتی ہیں۔ یہ خواتین مردوں کے ان دقیانوسی خیالات کی مکمل تائید کرتی ہیں کہ خواتین کا گھر سے باہر نکل کر کام کرنا بڑی حد تک شرمناک اور غیر شرعی عمل ہے۔ ان خواتین کے اندر اور وہ

مرد حضرات جو کہ ان خواتین کی زندگیوں پر مکمل بالادستی رکھتے ہیں ان کے ذہن میں یہ خیالات پختہ طور پر گھر کر لیتے ہیں کہ عورت کے لیے سب سے بہتر جگہ اس کے اپنے گھر میں ہے۔

نچلے درمیانی طبقے کی محنت کش خواتین کو تنخواہ دار ملازمتوں کے دوران کئی اقسام کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان محنت کش خواتین کے دن کا آغاز بہت پہلے ہو جاتا ہے۔ ایسی محنت کش خواتین کو کام پر جانے سے پہلے اپنے شوہر کو کھانا کھلا کر اور اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر بڑے قلیل وقت میں بھاگ دوڑ کر اپنے جائے ملازمت تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ملازمت کی جگہ پہنچنا بذات خود ایک جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ خاص کر پاکستان میں جہاں بڑے شہروں میں (مثلاً کراچی، لاہور وغیرہ) جہاں نقل و حرکت میں پبلک ٹرانسپورٹ بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے وہ انتہائی فرسودہ اور تکلیف دہ ہے۔ کئی بڑی کمپنیاں خواتین محنت کشوں کو آمدورفت کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولت فراہم کرتی ہیں لیکن اس معاملے میں بھی وہ خاتون جو کہ سب سے پہلے بس میں سوار ہو اور پھر واپسی پر اسے سب سے آخر میں اتارا جائے اسے اضافی طور پر کئی گھنٹے بلا مقصد ضائع کرنا پڑتے ہیں۔ وہ یقیناً گھر تھک کر ہی پہنچتی ہے جبکہ اس کا شوہر اس وقت پنکھے کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈے مشروب سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کی تھکی ہاری بیوی کو فوراً باورچی خانے میں جا کر خاندان کے افراد کے لیے رات کا کھانا تیار کرنا پڑتا ہے۔ نا صرف یہ بلکہ اسکول سے آئے ہوئے بچوں سے ان کی ضروریات معلوم کرنا اور کھانے کھلانے سے فارغ ہو کر انہیں سلانا بھی ہوتا ہے۔ اس طویل کام کی وجہ سے ان خواتین کو گھر کی صفائی اور کپڑوں کی دھلائی جیسے کام ہفتہ وار چھٹی کے لیے رکھ چھوڑنا پڑتے ہیں اور پھر ان بدقسمت خواتین کی ہفتہ وار چھٹی آرام کرنے کی بجائے ان بچے ہوئے کاموں کو جلد از جلد ختم کرنے پر خرچ ہو جاتی ہے۔ اس قلت وقت کی وجہ سے اکثر محنت کش خواتین کے پاس کسی میٹنگ، جلسے اور مظاہروں میں باوجود خواہش رکھنے کے شرکت کرنے کے مواقع ہی نہیں بچتے۔ حالانکہ یہ خواتین دلی طور پر ان تنظیموں اور ان کے مقاصد کے ساتھ بھرپور ہمدردی رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں چند ایسی خوش قسمت خواتین بھی ہیں جن کے سیاسی نظریات رکھنے والے شوہر یا پھر مثبت رویہ رکھنے والی ساسیں (Mothers in law) انہیں تھوڑی سی آزادی یا سہولتیں فراہم کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور پر صرف وہ خوشحال خواتین جو کہ اپنے گھروں پر ملازمین رکھ سکتی ہوں صرف وہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لے

سکتی ہیں۔اس مرحلے پر ذرائع آمدورفت بھی ایک بہت بڑی رکاو
جو کہ اپنی نجی گاڑیاں رکھتی ہیں وہ باآسانی آجاسکتی ہیں جبکہ وہ خواتیں
خواہشمند ہونے کے باوجود شرکت کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں پا ک
لفٹ لیکر پہنچنا ایک معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔

اپنی کئی مجبوریوں کے باعث نچلے درمیانی طبقے کی ملازمت
بھرپور اور نمایاں کردار ادا نہیں کرسکتیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں
سے عاری ہیں یا پھر پاکستان میں خواتین کے مسائل سے ناواقف
لگانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے ساتھ چند لمحے گذار۔
بات واضح ہوتی ہے کہ یہ محنت کش خواتین ان معاملات میں اپنا بر
حالات میں اکثر تنظیموں کی رہنمائی خوشحال خاندانوں کی ایسی خوا
ملازمین، گاڑی اور دیگر سہولیات رکھ سکتی ہوں اس لیے یہ خوشحال خو
کے رویوں اور ان کے مطالبات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ان خوشحال
کے برابر ہوتی ہے جبکہ ان کی دیگر بہنیں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے کا

چنانچہ پاکستان میں خواتین کی تحریک ان پڑھی لکھی خواتین
ملازمت سے وابستہ ہیں اور ان میں کئی تنخواہ دار ملازمین بھی ہیر
سرکاری طور پر خواتین کی تحریک کو بدنام کرنے کے لیے اس تحریک
بولنے والی بالائی طبقے کی خواتین سے منسلک کردیا گیا جن کے ذ
سے پر ہیں اور جن کا پاکستان کی خواتین سے کوئی حقیقی تعلق نہیں
تحریک سے وابستہ بیشتر کارکن کئی بیوروکریٹس، سیاسی رہنماؤں او
کش خواتین کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان کے ساتھ ا
بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔خواتین کی تحریک میں حصہ لینے والی کئی
کے باوجود اپنے آپ کو بہتر طور پر منظم کرکے اس تحریک میں رہنم
کرتے ہیں۔اس نئے اور غیر مانوس کام کی ذمہ داریاں سنبھالتے
اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کیا۔انہوں نے نا صرف لچکدار اور جدت پسند

کیا۔ یہ آخری خصوصیت خاص طور پر ویمن ایکشن فورم (WAF) کی اراکین میں خصوصی طور پر نظر آتی ہے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت کے اقدامات نے خود وہ حالات پیدا کیے جس کی وجہ سے اس تحریک کو مزید بڑھاوا ملا اور جس کی وجہ سے پاکستان آج بھی کئی دہائیاں گذرنے کے بعد بھی کئی مسائل کا شکار ہے۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں خواتین کی تحریک کے اچانک ابھر کر سامنے آنے کی وجہ جنرل ضیاء الحق کا اسلام کے نام پر اپنے اقتدار کو طول اور اپنی حکمران کو قانونی یا اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات تھے۔ خواتین کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات کا اصل مقصد و منشا پاکستانی معاشرے میں عورت کو بے عزت کرنے اور قانونی حقوق سے محروم کرنے اور عورت کی تعلیم کے حصول، اس کی آزادی حرکت اور پیشہ ورانہ کام میں رکاوٹیں حائل کرنا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں جہاں دیگر قوانین میں تبدیلیاں کی گئیں وہیں ۱۹۸۴ میں اہم تبدیلی قانون شہادت میں تبدیلی تھی جس کا مطلب مروجہ قانون شہادت کو اسلامی قانون کے مطابق بنانا تھا۔ سوائے حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ جو کہ (جو کہ اسلامی سزاؤں کے متعلق تھا) اپنے اندر شہادت کا ایک واضح طریقہ کار متعین کرتا تھا۔ نئے قانون شہادت کے تحت دو مرد گواہوں کی غیر حاضری میں ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جرم ثابت کرنے کے لیے ضروری ہوگی۔ جبکہ اس قانون اور دیگر قانون نے ایک مرد کو دو خواتین کے برابر کر دیا مثلاً قصاص اور دیئت کے قوانین کے تحت قتل یا زخمی کیے جانے کی صورت میں ملزمان زیادتی کا شکار بننے والے فرد یا اس کے خاندان کو معاوضہ ادا کر کے سزا سے بچ سکتے ہیں۔ اس قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا اور ضیاء الحق کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ نے منظور کیا۔ قصاص و دیئت کے معاملے میں بھی عورت کے لیے ادا کیے جانے والا معاوضہ اس رقم کا آدھا تھا جو کہ ایک مرد کے ہلاک یا زخمی ہونے کی صورت میں ادا کیا جاتا۔ ان قوانین نے (جنھوں نے عورت کی حیثیت مرد سے نصف کر دی)۔ ملک میں خواتین کی تحریک کو حرکت میں لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ان متعصبانہ قوانین نے جہاں ایک طرف خواتین کی حیثیت مرد کے مقابلے میں نصف کر دی وہیں اس کے ساتھ ہی جنرل ضیاء کی پالیسیوں نے پیشہ ورانہ شعبوں سے منسلک کام کرنے والی خواتین کی زندگیوں کو بھی پرخطر بنا دیا۔ ایک طرف جہاں ان قوانین کے خلاف خواتین کے پرتشدد مظاہرے اور شدید احتجاج نظر آئے وہیں ایک اہم خطرہ مستقبل میں خواتین کے حصول تعلیم کے

متعلق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ عمومی طور پر جنرل ضیاءالحق کے دور میں بنائے گئے قوانین اس بات پر زور دیتے ہوئے بنائے گئے تھے کہ کسی طرح خواتین کو گھر سے باہر نکل کر کسی بھی سرگرمی میں حصہ لینے سے مختلف حیلوں بہانوں سے روکا جائے اور ان کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع کم سے کم دیے جائیں۔

مثال کے طور پر ایسے منصوبے بھی زیر غور تھے جن کا مقصد خواتین کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مواقع کو مکمل طور پر بند کرنا تھا۔ شاید اس کی سب سے اہم مثال خواتین کو صرف خواتین جامعات کے حدود میں مقید کرنا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے جامعات کو مالی مہیا کرنے والے ادارے University Grants Commission کی طرف دی جانے والی ایک تجویز کے مطابق خواتین کے گھریلو اقتصادیات (Home Economics) پڑھانے کے کراچی، لاہور اور پشاور میں واقع تین کالجز کے رتبوں کو بلند کر کے انہیں خواتین کی یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کیا گیا لیکن جو بات سب سے اہم تھی وہ ان مجوزہ جامعات میں کہ خواتین کو صرف وہی علوم پڑھائے جانے کا منصوبہ تھا جو کہ طالبات کو بہتر مثالی گھریلو عورت (ideal house wife) بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔ تعلیم کا یہ محدود تصور خواتین کو وسیع تر تعلیم کے حصول سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیتا تھا جو کہ انہیں تعلیم، ملازمت، کاروبار یا انڈسٹری میں اپنا کردار ادا کرنے سے روکتا تھا۔ اس سلسلے میں کئی رکاوٹیں مثلاً خواتین کے لیے میڈیکل یا سائنسی مضامین میں داخلے کے لیے مردوں کے مقابلے میں زیادہ نمبروں کا حصول شرط تھی۔

اس کے ساتھ ہی خواتین کے کھیلوں پر حصہ لینے پر بھی قدغن لگائی گئیں۔ پاکستانی خواتین کو ہاکی اور اتھلیٹکس کے تین بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت سے روک دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے وفاقی وزیر برائے کھیل نے اس پابندی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ خواتین کو صرف ان کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے جہاں تماش بین یا تو صرف خواتین ہوں یا پھر ان خواتین کے ان کے 'محرم مرد'۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اخبارات میں اس رپورٹ کو شائع کرتے ہوئے لفظ 'محرم' کو 'خونی رشتہ دار' سے تبدیل کر دیا گیا جو کہ بالکل غلط تشریح تھی۔ اسلامی رشتوں کی تقسیم میں 'محرم' کا مطلب وہ رشتے ہیں جن سے خواتین کو شادی کرنے کی اجازت نہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے 'محرم' کی تعریف میں خاتون کے بچے یا ان کے بچے اور کئی فقہوں میں بہنوں کے شوہر تک شامل ہیں۔ مثلاً چچازاد یا تایازاد بھائی کسی بھی عورت کے لیے 'محرم' نہیں لیکن وہ رشتہ دار ضرور ہے'۔ 'محرم' کی تعریف یقیناً کھیل میں حصہ لینے والی عورت کھلاڑی کے لیے الگ ہے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ تماش بینوں میں کسی بھی صورت مردوں کو شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ جنرل ضیاء الحق کے نئے قوانین کے مطابق عورت کو صرف باپردہ ہو کر کھیلوں میں شریک ہونے کی اجازت دی جا سکتی تھی۔ یہ فضول اور جاہلانہ قوانین مذہب کے نام پر رائج کر کے خواتین کی مثبت صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے مترادف تھے۔ عریانی اور فحاشی کے خلاف جہاد کے نام پر ضیاء الحق حکومت نے سرعام گھومنے والی خواتین کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا اور ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا گیا جس میں خواتین کے خلاف حملے ایک عام بات ہوگئی اور انہیں مذہب کے نام پر جائز بھی قرار دے دیا گیا۔ ان مہموں کو زیادہ تر ملاؤں اور جرائم پیشہ افراد نے بڑے زور و شور سے چلایا جو کہ عورت کو اخلاقیات کے نام پر تکلیف دیکر نفسیاتی تسکین حاصل کرتے تھے۔ ضیاء الحق دور حکومت میں سرکاری ملازمت سے وابستہ اسکولوں اور کالجوں میں کام کرنے والی خواتین اساتذہ کو 'اسلامی' لباس اور پھر برقعہ پہننے کے احکامات جاری کیے گئے۔ ان مہموں کے نتیجے میں ان خواتین کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا جو پاکستان میں اخلاقیات کے نام پر مردوں کی بالادستی کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ اسلام کے نام پر خواتین کے خلاف تشدد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسلام کی حمایت میں لگائے گئے نعروں اور حقیقی صورت حال کی منافقت ان ان گنت واقعات سے بہت جلد عیاں ہوگئی جہاں خواتین کی ناکوں کو کاٹا گیا اور انہیں برہنہ کر کے سرعام پریڈ کرائی گئی تاکہ (سبق سکھایا جا سکے)۔ ان واقعات کے خلاف بڑھتے ہوئے شدید غم و غصے کے باعث ضیاء الحق حکومت نے ان واقعات میں ملوث لوگوں کے خلاف کاروائی کرنے کا اعلان کیا لیکن اس کی نام نہاد 'اسلامی' حکومت نے ان جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ قدم نہ اٹھایا۔ نا ہی حکومت نے عوام میں شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لیے ایسے اقدامات اٹھانے کی زحمت کی جن کے ذریعے انہیں شرم دلائی جا سکے۔ آج بھی خواتین کے خلاف ایسے واقعات اور جرائم جاری ہیں۔

ضیاء الحق حکومت نے حدود آرڈی نینس چند جرائم کی سزا کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے

کے لیے جاری کیا جس میں کئی وحشیانہ سزائیں مثلاً ہاتھوں کا کاٹا جانا اور سنسار کرنا شامل تھا۔ ملک میں یہ بحث اور تکرار جاری رہی کہ یہ سزائیں واقعی اسلام کے اصولوں کے مطابق ہیں حالانکہ ان سزاؤں پر مکمل طور پر عمل تو نہ ہو سکا لیکن یہ بات واضح تھی کہ ایسے احکامات کا جاری کیا جانا بھی علامتی طور پر ناصرف اہم تھا۔ لیکن سرعام کوڑے مارنے والی سزاؤں پر عمل درآمد کیا گیا یہ سزائیں ناصرف کھلے مقامات اور بڑے مجمع کی موجودگی میں دی گئیں بلکہ ان کی سرکاری ٹی وی کے ذریعے تشہیر بھی کی گئی اور ان کے یہ نعرے بھی سنوائے گئے کہ 'حرام زادوں' (Bastard) کو اور زور سے مارو۔ ایسے مناظر یقیناً انتہائی شرمناک اور تذلیلی عمل تھے۔ لیکن جو قانون ہمارے اس عنوان سے براہ راست تعلق رکھتا ہے وہ زنا (حدود کا نفاذ آرڈیننس) تھا جو کہ فروری ۱۹۷۹ء میں نافذ کیا گیا۔ اس آرڈیننس نے رشتہ داروں اور دیگر مردوں کے ہاتھوں خواتین کے خلاف اور خاص طور پر شہری طبقے کی غریب خواتین کے خلاف تشدد اور زیادتیوں کے لیے نئی بنیادیں فراہم کیں۔ حد تو یہ تھی کہ اس آرڈی نینس نے خواتین کو تحفظ دینے کے بجائے انہیں مزید اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ زنا بالجبر کی شکار خاتون بھی اپنے خلاف جنسی تشدد کے خلاف شکایت کرنے سے بھی گھبرانے لگی کیونکہ انہیں خوف تھا کہ بجائے ظلم کرنے والے مرد کو سزا دی جائے، ان مظلوم خواتین کو خود مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

اس آرڈیننس نے خواتین کے خلاف مرد کے ہاتھ میں زنا کے نام پر ایک ایسا ہتھیار فراہم کر دیا جس کے تحت اب زنا بالرضا (adultery) کو ریاست کے خلاف ہونے والے جرائم کی فہرست میں شامل کر دیا گیا جس پر پولیس بلا روک ٹوک خواتین کے خلاف کاروائی کرنے کی مجاز قرار پائی۔ اس سے قبل معاملات ایسے نہ تھے۔ اس وقت جنسی تعلق (adultery) ایک ذاتی جرم تھا جو کہ کسی بھی صورت میں پینل جرم کی تعریف میں نہ آتا تھا۔ اب عورت پر تہمت بازی آسان ہو گئی ہے خاص طور پر ان واقعات میں جہاں خواتین اپنے شوہروں سے کسی بھی وجہ سے علیحدگی چاہتی ہوں۔ ان کیسز میں مرد حضرات کے لیے یہ بات بڑی سہل ہے کہ وہ پولیس میں جا کر اپنی بیوی کے خلاف زنا کے الزامات لگا کر درخواست دے دیں اور پولیس انہیں با آسانی گرفتار کر کے قید کر سکتی ہے۔ پولیس کی بدعنوانی اور عدالتوں میں مقدموں کی طوالت کے باعث ایسے مقدمات کو نمٹانے میں سالوں لگ جاتے ہیں اور اس تمام عرصے میں سب سے زیادہ پریشانی

اور تکلیف کا سامنا عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے جو کہ بعض اوقات قانونی مراحل طے کیے بغیر ہی واجب سزا قرار پاتی ہے۔ ان مقدمات میں بھی شوہر کے پاس یہ حق ہے کہ وہ اپنی بیوہ پر الزام لگانے کے باوجود اس کی ضمانت دے سکتا ہے اور اگر وہ یہ کام کرلے تو پھر وہ خاتون کلی طور پر اپنے شوہر کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ وہ اسے ہر وقت پریشان کرتا رہتا ہے اور اس کی ضمانت واپس لینے کی صورت میں اس کو دوبارہ جیل جانا پڑسکتا ہے۔ درحقیقت ایسے قوانین کے نتیجے میں عورت کی حیثیت ایک غلام سے بھی بدتر ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان کی نامور خاتون قانونی ماہر اور انسانی حقوق کے کمیشن کی سیکریٹری عاصمہ جہانگیر کا خیال ہے کہ اب یہ مرد حضرات کے لیے بڑی آسان بات ہوگئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے خلاف جوان سے علیحدگی چاہتی ہوں زنا کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کروادیں۔ یہ سلسلہ پسند کی شادیوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جہاں والد اپنی بچی کو پسند کی شادی کی اجازت نہیں دینا چاہتے۔ ایسے واقعات میں اکثر لڑکی کے والدین اس کے شوہر پر اغواء کا مقدمہ کرکے انہیں زنا کے جرم کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف ایف آئی آر کٹوادیتے ہیں اور جوڑے کو اس جرم سے بچنے کے لیے قانونی نکاح نامہ پیش کیے بغیر چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہوتا۔ زنا آرڈیننس نے جنسی زیادتی کا شکار بننے والی خواتین کو انتہائی محرومیت * (Catch 22) کی حالت میں لا کر کھڑا کیا ہے۔ جس میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر (rape) دونوں کو ایک ہی قانون کے تحت لا کھڑا کیا ہے۔ اس قانون کی دوسری اہم بات وہ طریقہ شہادت ہے جو اس آرڈیننس میں وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت زنا بالجبر (rape) بھی جنسی عمل قرار دیا گیا ہے جو کہ چاہے اس جرم کا شکار ہونے والے کی رضامندی یا رضامندی کے بغیر (چاہے موت کے خطرے پر) ہی کیوں نہ سرانجام دیا ہو۔ اس قانون میں زنا بالجبر کی سزا سنگسار کرنا یا بعض اوقات اس سے تھوڑی سی کم سزا یعنی تعذیر عائد کرنا ہے۔ اس سزا کے لیے شہادتوں کا ہونا ایک نہایت ضروری عنصر ہے جس کی سب سے پہلی صورت گنہگار کا جرم قبول کرنا ہے (ایک غیر شادی شدہ عورت کا حمل ٹھہر جانا اس کا ایک واضح ثبوت ہے)۔ یا پھر چار بالغ مردوں کا عدالت میں شہادت کے لیے پیش ہونا جن پر عدالت کو یہ اطمینان ہو کہ یہ صادق اشخاص ہیں جو خود گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ان چار افراد کا سزا عائد کرنے کے لیے شہادت دینا ضروری ہے۔ اس قسم کی شہادت کا عام حالات میں پایا جانا تقریباً ناممکن ہے سوائے عرب کے وسیع و عریض صحراؤں میں۔ اس لیے مردوں کو زنا بالجبر کی

صورت میں قابل گرفت لانا نہایت مشکل ہے۔اس لیے ایسے واقعات کی تعداد بھی بہت بڑھ چکی ہے اور جرم کے مرتکب ملزمان بلا خوف وخطر آزادی سے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ظلم تو یہ ہے کہ اس قانون میں عورت کے اپنے ذاتی بیان کی کوئی اہمیت ہی نہیں اور نا ہی اس کی درخواست کی شنوائی۔اگر وہ زنا بالجبر کی شکایت (جس کو قانون کے تحت وہ ثابت ہی نہیں کرسکتی) کرے تو اسی وقت یہ بات تسلیم کرلی جاتی ہے کہ وہ زنا کی مرتکب ہو چکی ہے اس لیے ایسے کیس میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس عورت نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے اور وہ اس جنسی عمل میں کسی بھی مرد کے ساتھ اپنی مرضی سے شریک ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اسے قانون کے تحت بڑی کڑی سزا کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔اس قانون سے عورت کو چھٹکارا تو کیا نصیب ہو وہ مزید مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔
زنا آرڈیننس کے تحت خاتون کئی صورتوں میں ظلم کا شکار ہوسکتی ہے۔خواتین کو اس قانون سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں عاصمہ جہانگیر کے صرف ملتان کی جیل کی قیدی خواتین سے کیے گئے انٹرویوز سے یہ پتا چلتا ہے کہ جیلوں میں ۴۰ فیصد قید خواتین کے مقدمات کا تعلق حدود آرڈیننس سے تھا۔بیشتر خواتین کا تعلق قلیل آمدنی والے غریب خاندانوں سے تھا۔انٹرویو کی گئی ۳۷ خواتین میں سے ۱۶ خواتین کی خاندانی آمدنی صرف ۵۰۰ روپے ماہانہ (جو کہ ایک تنہا محنت کش کی مزدوری کے برابر ہے) اور کسی بھی خاندان کی آمدنی ۳۰۰۰ روپے (دفتر میں کام کرنے والے کلرک کی ماہانہ تنخواہ) سے زیادہ نہ تھی۔اخبارات میں ان واقعات اور مقدمات کی بھی بڑی عجیب طریقے سے تشہیر کی جاتی ہے۔قلت جگہ کی وجہ سے ہم صرف چند مثالوں کا ذکر کرینگے جن میں خواتین کو مختلف طریقوں سے موردالزام ٹھہرایا گیا۔

سب سے بدنام زمانہ کیس ۱۸ سالہ تقریباً نابینا لڑکی صفیہ بی بی کا ہے جو کہ ایک نہایت ہی غریب کسان کی بیٹی تھی جسے اس کے والدین نے ملازمت کی غرض سے ایک مقامی زمیندار کے گھر پر گھریلو کاموں کے لیے رکھوایا تھا۔اس لڑکی کو اس کے آجر کے بیٹے نے زبردستی زیادتی کا نشانا بنایا اور بعد از اں زمیندار نے خود بھی یہی حرکت دوہرائی جس کے نتیجے میں وہ لڑکی حاملہ ہوگئی۔اس کا غیر قانونی پیدا ہونے والا بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد وفات پا گیا۔لڑکی کے والد نے پولیس میں زنا بالجبر کی رپورٹ درج کرائی تو عدالت نے زمیندار اور اس کے بیٹے کو حدود آرڈیننس میں دی گئی طریقہ شہادت کا فائدہ دیتے ہوئے باعزت بری کردیا۔اس قانون کے تحت اپنے ساتھ ہونے

والی زیادتی کو ثابت کرنے کے لیے اس مظلوم لڑکی کو چار پاک دامن مردوں کی گواہی پیش کرنا ضروری تھا جو کہ وہ کسی صورت نہیں کر سکتی تھی۔ اور مزید زیادتی یہ کہ وہ نابینا لڑکی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو ثابت نہ کرنے کی وجہ سے زنا کی مرتکب قرار دی گئی جس کی گواہی اس کا حاملہ ہونا تھا۔ اس جرم کی سزا میں اسے ۳ سال جیل۔ سر عام ۱۵ کوڑوں کی سزا ملی اور ۱۰۰۰ روپے کا جرمانہ بھی عائد کیا گیا اور مزید یہ کہ کورٹ نے یہ سزا دیتے ہوئے لکھا کہ اس کو نرم سزا دینے کی وجہ اس کی کم عمری اور اس کا معذور ہونا تھا۔ اس واقعہ نے WAF کو اپنی مہم کو مزید پر زور طریقے سے شروع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ عوام کے بڑھتے ہوئے احتجاج کے نتیجے میں ضیاء الحق کو اس معاملے میں مداخلت کرنے اور شریعت کورٹ کو اس معاملے کا از خود (suo moto) نوٹس لینا پڑا۔ ایک غیر معمولی روشن خیال اور لبرل جج نے اس بنا پر اس سزا کو کالعدم قرار دیا کہ عدم ثبوت کی بناء پر جب مرد کو شک کا فائدہ دیا جا سکتا ہے تو وہی فائدہ عورت کے لیے بھی ہونا چاہئے لیکن اس کے باوجود اس لڑکی کے ساتھ ظلم کرنے والوں کو عدالت کے کٹہرے میں نہیں لایا جا سکا۔

ایک اور کیس جس میں شوہر یا اس کے رشتہ دار کس طرح قانونی طور پر عورت کو ہراساں اور پریشان کر سکتے ہیں اس کی مثال اس وقت سامنے آئی جب ایک ۲۵ سالہ خاتون شاہدہ نے اپنے شوہر خوشی محمد سے طلاق حاصل کی۔ طلاق نامہ پر شوہر کے دستخط کرنے کے بعد مجسٹریٹ نے بھی تصدیق کر دی۔ قانون کے مطابق یہ کاروائی ہو گئی لیکن اس قانون کی ضروریات کے مطابق مزید یہ کہ طلاق دینے والے شوہر کو ان کاغذات کو مقامی کونسل کے پاس بھی اندراج کرانا ضروری ہے جو کہ اس نے نہیں کیا۔ جس کے پس پشت شعوری کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا مقصد اپنی سابقہ بیوی کو پریشان کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاہدہ نے قانون اور شریعت کے مطابق ۹۰ دن کی عدت گذارنے کے بعد اپنے والدین کی رضامندی سے ایک اور شخص محمد سرور سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا سابقہ شوہر خوشی محمد طلاق دینے کے باوجود اس بات پر بضد ہو گیا کہ وہ شاہدہ سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے انکار پر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اسے کسی اور سے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں دیگا۔ شاہدہ کی دوسری شادی کے بعد اس نے اس کے خلاف عدالت میں زنا کا مقدمہ درج کر دیا۔ عدالت میں پیشی کے دوران شاہدہ نے اپنی طلاق کے کاغذات جس میں خوشی محمد کے دستخط اور مجسٹریٹ کی تصدیق شامل تھی پیش کیے لیکن عدالت نے ان کاغذات کو

ماننے سے انکار کردیا کیونکہ انکا مقامی کونسل میں اندراج نہ ہوسکا تھا۔اس لیے عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ طلاق کا اطلاق نہیں ہوسکتا تھا اس لیے ثانوی شادی غیر قانونی تھی۔

کیونکہ عدالتی کاروائی کے دوران شاہدہ اور اس کا شوہر سرور اس بات کا اقرار کر چکے تھے کہ وہ بطور شوہر بیوی کے طور پر زندگی گزار رہے ہیں اس لیے عدالت نے ان کو حدود آرڈیننس کے تحت زنا بالرضا کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف کاروائی کا حکم دیا اور دونوں کو سنساری کے ذریعے ہلاک کرنے کا حکم دیا۔لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ خواتین کی تحریک کے پرزور احتجاج کے نتیجے میں بالآخر اس بھیانک سزا کے خاتمے کا اعلان کیا گیا لیکن بدقسمتی سے اس بہیمانہ قانون سے ہر ایک کو باآسانی چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا۔کئی والدین پسند کی شادیوں کی مخالفت شائد اس لیے بھی کرتے ہیں کہ اس شادی کے نتیجے میں انہیں اپنی اس حاصل ہونے والی رقم سے محروم ہونے کا خدشہ بھی ہوتا ہے جو وہ اپنی بیٹی کو شادی کی صورت میں فروخت کر کے حاصل کر سکتے ہیں (پاکستان میں لڑکی کی شادی کے عوض رقم وصول کرنا عام روایت نہیں)۔ایسے والدین عام طور پر دولہا کے خلاف اپنی بیٹی کے اغواء کا مقدمہ درج کر دیتے ہیں۔اسی طرح لڑکی کو شادی کے بعد سسرال میں رہنے کے باوجود بھی اس کے والدین اغواء کے مقدمات میں پھانس دیتے ہیں۔ پولیس ایسے مقدمات میں قانونی اور شرعی طور پر شادی شدہ جوڑے کو گرفتار کرنے کے لیے کوششیں شروع کردیتی ہے اور ان کے نہ ملنے کی صورت میں لڑکے کے خاندان کے دیگر افراد کو بطور یرغمال گرفتار کرلیتی ہے۔

ان تمام مقدمات کی وجہ سے نا صرف متعلقہ لوگ جوان معاملات سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، متاثر ہوتے ہیں۔ بلکہ عمومی طور پر پاکستان میں خواتین کی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔اور خواتین اپنے ظالم اور لالچی والدین کی خواہشات کے آگے خوف و قانون کی پابندیوں کے باعث سر جھکا لیتی ہیں۔بدقسمتی سے جنرل ضیاء الحق کے ۱۱ سالہ نام نہاد اسلامائزیشن کے عمل نے پاکستانی معاشرے کو انتہائی عدم برداشت کا معاشرہ بنادیا ہے۔اس ثقافت نے سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت کو قانونی پیچیدگیوں میں الجھانے کے ساتھ ساتھ بے وقعتی اور بے عزتی کا سامنا کرنے پر مجبور کردیا ہے۔حدود آرڈیننس کے باعث اسے غیر انسانی رویوں اور بہیمانہ سلوک کا سامنا ہے۔ حکومت نے ذرائع ابلاغ کو لوگوں کو اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی تبلیغ اور

ترغیب کے لیے استعمال کرانا شروع کیا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان تمام قوانین کی توضیح جنرل ضیاء الحق کے اپنے اور اس کے تنگ نظر ملاؤں کے خیالات کے مطابق تھی۔ ضیاء الحق کے ان اقدامات کا ایک مزید تباہ کن کام اس کی لوگوں سے وہ اپیل تھی کہ نہ صرف وہ زندگی اسلام کے مطابق گزاریں بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنائیں کہ ان کے پڑوس کے لوگ بھی اس بات پر کاربند رہیں اور یہ ذمہ داری ان افراد نے اٹھالی جو کہ نام نہاد مذہب کے حمایتی بن بیٹھے اور کسی بھی بہانے عورت کو بے عزت کرنے سے بعض نہیں رہتے تھے۔ کئی مواقع پر تو یہ کام بالکل انجان لوگوں نے سرانجام دیا۔ مثال کے طور پر خاور ممتاز اور فریدہ شہید ایک ایسے قصہ کا حوالہ دیتی ہیں اور جس میں جب لاہور کے ایک فیشن ایبل علاقے میں بالائی طبقے کی ایک خاتون بیکری میں داخل ہوئی تو ایک انجان شخص نے اس کو اس بات پر تھپڑ رسید کیا کہ وہ اپنا سر ڈھانپے ہوئے نہ تھی۔ اور اس ملک کا سب سے تشہیری اور بھیانک واقعہ وہ تھا جب جمعہ کی نماز ختم کر کے نکلنے والے نمازیوں نے مسجد کی قریبی کچرا دانی میں ایک نومولود زندہ بچے کو اس مسجد کے پیش امام کی قیادت میں سنگ باری کر کے ہلاک کر دیا جو کہ ان کے خیال میں ایک غیر قانونی جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ اس قسم کے بھیانک واقعات کے رونما ہونے کے پس پشت یقیناً جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں ہونے والا پروپگنڈہ تھا جس نے معاشرے میں عدم برداشت اور رجعت پسندی کو فروغ دیا۔

اس تمام صورت حال میں اس بات کی امید تھی کہ بے نظیر بھٹو کی جمہوری حکومت ایسے قوانین کو واپس کر دیگی اور خصوصی طور پر حدود آرڈیننس (بشمول زنا آرڈیننس) کو۔ لیکن ایک سال گذر جانے کے باوجود حکومت نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا ہے کہ وہ ملک میں ان قوانین کی تبدیلی کے لیے کوئی سنجیدہ اقدام اٹھانا چاہتی ہے۔ یقیناً اس کے پس پشت نہایت پیچیدہ سیاسی مسائل بھی ہیں جس کی وجہ سے حکومت مفلوج ہو کر اس معاملے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ ہم اس بات کی تفصیل میں یہاں نہیں جانا چاہتے۔ ان وجوہات کی بناء پر جنرل ضیاء الحق کا بھیانک سیاسی ورثہ (legacy) اسی طرح جاری ہے جس کے باعث پاکستانی عورت کا مستقبل غیر یقینی اور مزید پر خطر نظر آتا ہے۔

کتابیات

1- Ahmad, Shahnaz *'Women's Movement in Pakistan'* 1983.

2- Alavi, Hamza 'Kinship in West Punjab Villages', *Contributions to Indian Sociology,* New Series. 1972, Vol. VI (for a fuller account see Hamza Alavi, 'The Two Biraderis- Kinship in Rural Punjab' in T. N. Madan (ed) *Muslim Societies in South Asia,* 2nd edition, New Delhi 1995)

3- Bhatty, Zarina *The Economic Role and Status of Women in the Beedi Industry in Allahabad, India,* ILO, World Employment Programme 1981, Vol 63

4- Mumtaz, Khawar and Shaheed, Farida *Women of Pakistan*, London, London, Zed Press, 1987, various Pakistan Law Digest

---

(*Catch-22) ایک انتہائی مغربی اور نسبتاً تازہ اصطلاح ہے جس کا استعمال Joseph Heller نے اپنے ناول Catch-22 میں کیا جو کہ ۱۹۶۱ میں شائع ہوا جس کا مفہوم و مطلب انتہائی بے کسی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مترجم)

سرمایہ دار عسکریت پسندی اور خواتین کا ردِ عمل اور مزاحمت:
ایک ہمعصر تاریخی تجزیہ

ڈاکٹر عذرا طلعت سعید

زیرِ نظر تجزیہ دراصل ایک مکمل مکالمہ نہیں بلکہ ایک ایسا ابتدائی عمل سے گزرنے والا مسودہ ہے جس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مطالعہ کو شروع کرنے کی ضرورت اور وجہ ہمارے زمانے میں پائی جانے والی عسکریت پسندی کے فروغ کا رجحان ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ سے عسکریت پسندی کے دامن کو تھامے ہوئے تھا لیکن پچھلے کچھ سالوں میں خصوصاً نو/گیارہ کے واقعہ کے بعد اس میں شدت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ بحث سرمادارانہ عسکریت پسندی کے خلاف خواتین کے جوابات و مزاحمت کا ایک تجزیہ ہے۔

ہم پاکستان کی تاریخ کے جس دوراہے پر کھڑے ہیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ عسکریت پسندی ہماری زندگیوں کا ایک روزمرہ کا عنصر بن چکا ہے۔ اس عمل کی وجوہات کو سمجھنے کے لیے 'دہشت گردی کی جنگ' کو سمجھنا ضروری ہے جس کے نام پر کئی ہزار جانیں پاکستان کی سرزمین پر لی جا چکی ہیں۔ عام سوچ کے مطابق مذہبی انتہا پسندی کو قصوروار ٹھرایا جاتا ہے۔ اگر وسائل اور منافع پر سرمایہ دارانہ قبضے کی جنگ پر نظر دوڑائی جائے تو حقائق شائد کچھ اور ہوں۔

پاکستان اور ایشیا کی سرزمین پر ہونے والی عسکریت پسندی عورتوں کی زندگی پر ایک شدید اثر چھوڑتی ہے۔ یقیناً یہ کوئی حیرت انگیز خبر نہیں کہ عام طور سے جب عسکریت پسندی کا ذکر ہوتا ہے تو سب سے پہلے عورتوں پر تشدد کے اثرات پر بحث و مباحثہ سامنے آتا ہے۔ لیکن یہ مقالہ عورتوں پر تشدد کے اثر سے ہٹ کر یہ جائزہ لینا چاہتا ہے کہ عسکریت پسندی، خاص کر کے سرمایہ دارانہ

عسکریت پسندی کا مقابلہ تحریک نسواں نے کن عمل کاریوں کے ذریعے کیا؟ یا یوں کہہ لیں کہ اس تجزیہ کا مقصد ہے کہ عورتوں نے سرمایہ دارانہ عسکریت پسندی کے جواب میں اپنی اور معاشرے کی بقاء کے لیے کونسے اقدامات اٹھائے؟

اس سے پہلے کے ہم سرمایہ دار عسکریت پسندی کے خلاف عورتوں کے جوابات اور مزاحمت کو سمجھیں یہ ضروری ہے کہ عالمی سطح پر ہونے والی ملٹری جارحیت کو ایک نظر دیکھیں خاص کر کے ستمبر نو گیارہ کی روشنی میں۔ ۲۱ ویں صدی میں سرمایہ دارانہ نظام ایک شدید بحران کا سامنا کر رہا ہے کیونکہ صنعتی پیداواری صلاحیت ایندھن کی محتاج ہے۔ یقیناً جیسے جیسے عالمگیریت کے سائے تلے پہلی دنیا کے منافع خور ممالک اور ان کی بین الاقوامی کمپنیاں اپنے جال پھیلاتی ہیں ویسے ان کی ایندھن کی طلب بڑھتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایندھن اور گیس کے قدرتی وسائل کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جس تیزی سے یہ نظام تیل اور ایندھن کے وسائل کو استعمال کر رہا ہے اسی تیزی سے وہ اپنی محتاجی کو سہارا دینے کے لیے دنیا کے ایندھن کے ذخائر پر قابض ہونے کی کوششیں تیز کر رہا ہے۔ اس عمل میں سرمایہ دارانہ ممالک میں امریکہ سب سے اول ہے۔

عراق جنگ پر آج اس کے علاوہ اور کوئی نقطہ نظر نہیں کہ یقیناً یہ جنگ اس ملک میں پائے جانے والے وسیع اور اعلیٰ معیار کے تیل کے لیے ہی لڑی گئی تھی۔ ابھی حال ہی میں گرین اسپین امریکی سینٹرل بینک کے سابق صدر نے کہا کہ 'عراق کی جنگ زیادہ تر تیل پر تھی'[1]۔ گرین سپین جو کہ سرمایہ داری نظام کا ایک اہم کردار رہا ہے، نے بڑے سہل انداز میں اس کڑوی حقیقت کو قبول کر لیا ہے۔

اگر اسی سوچ کے زاویہ کو ہم آج ایشیاء اور خاص کر پاکستان اور افغانستان میں ہونے والی سرمایہ دارانہ جارحیت کو سمجھنے کے لیے استعمال کریں تو 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ افغانستان کی جغرافیائی حیثیت کو دیکھیں تو یہ سمجھ آتا ہے کہ اس ملک کے شمال میں وسطی ایشیا ہے جو کہ اپنے اندر کیسپین سمندر اور اس میں پائے جانے والے بڑے بڑے تیل اور گیس کے ذخیروں کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۲۰۵۰ تک وسطی ایشیا امریکہ کے ۸۰ فیصد تیل کی ضروریات پوری کر رہا ہوگا۔ ۲۰۰۱ سے امریکی فوجی اڈے وسطی ایشیا کے ممالک کرغستان، ازبکستان اور تاجکستان میں قائم کر دیے گئے ہیں[2]۔ یقیناً ان فوجی اڈوں کا مقصد تیل

کے ذخائر پر قبضہ اوران کی حفاظت ہے۔

امریکہ کی تیل اور گیس کی شدید محتاجی اور حالیہ عراق جنگ میں امریکی سامراجی جارحیت کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوتی کہ افغانستان میں امریکہ کا قبضہ القاعدہ پر حاوی ہونا نہیں بلکہ دراصل کیسپین سمندر کے تیل اور گیس کے ذخائر پر قبضہ ہے۔ کیسپین سمندر کے اردگرد ممالک کی رسائی کسی بحرا لکاہل تک نہیں ہے۔ اس وجہ سے سرمایہ دار ممالک کی تیل نکالنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے اہم ہے کہ وہ پائپ لائن کے ذریعہ تیل اور قدرتی گیس کے ذخائر کو حاصل کر کے نزدیک ترین بندرگاہوں تک پہنچائیں۔ امریکی فوجیوں کی کوشش ہے کہ وہ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کو بہانہ بناتے ہوئے افغانستان اور پاکستان پر نوآبادیاتی قبضہ جما لیں تا کہ ان ممالک سے پائپ لائنیں گزارتے ہوئے پاکستان کی سمندری بندرگاہوں سے تیل اور گیس کو بحری جہازوں کے ذریعے منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'دہشت گردی کی خلاف جنگ' تیل اور قدرتی وسائل پر قبضے کے لیے ملٹری تدبیر ہے جس کے ذریعے امریکہ جیسی سپر پاور اپنی ملٹری اور معاشی سرمایہ داری طاقت کو برقرار رکھ رہا ہے۔

اس پس منظر میں مستقل اسلام کو انتہا پسندی سے جوڑا جا رہا ہے۔ ۲۰۰۱ سے لیکر اب تک امریکہ نے اپنے ملٹری اخراجات کو کئی کروڑ ڈالر سے بڑھا دیا ہے۔ ۲۰۰۲ میں امریکن ملٹری اخراجات ۴۰۰ بلین ڈالرز سے کم تھے جبکہ ۲۰۰۹ کا ملٹری بجٹ دیکھا جائے تو وہ ۵۱۵ بلین ڈالرز ہے۔ اس کے علاوہ عراق اور افغانستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے لیے مزید ۷۰ بلین ڈالرز مانگے گئے ہیں[۳]۔ کیتھرین لوٹز کے مطابق اس وقت امریکہ کے دنیا میں ۹۰۹ فوجی اڈے ہیں۔ جن میں تقریباً ۱۹۰,۰۰۰ فوجی اور ۱۱۵,۰۰۰ شہری ملازم ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں[۴]۔ نا صرف امریکہ نے عراق اور افغانستان میں خود داخل ہو کر فوجی دہشت گردی کا افسوس ناک کردار پیش کیا بلکہ پاکستان میں ایک ڈکٹیٹر فوجی جنرل پرویز مشرف کو کئی بلین ڈالرز ملٹری مدد کے نام پر دیا۔ ایسی مدد ایک اور پاکستانی ملٹری جنرل ضیاء الحق کو ۱۹۸۰ کی دہائی میں سویت یونین سے لڑنے کے لیے 'مجاہدین' کی تربیت کے لیے دیے گئے تھے۔ یہ وہی 'مجاہدین' ہیں جو آج کے دہشت گرد ہیں جو القاعدہ اور طالبان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ۲۰۰۰ کی دہائی میں امریکہ نے تقریباً ۲ء۱ بلین ڈالرز پاکستان کو ان 'دہشت گردوں' کے خلاف جنگ کرنے کے لیے مہیا کیے۔

سرمایہ دار امریکہ نے ہمارے بیچ میں کئی نئی طرح کی اصطلاحات پیش کیں ہیں مثلاً 'روگ اسٹیٹس' یعنی 'بدمعاش ریاستیں،' 'اسلامی انتہائی پسندی' اور 'نیوکلیئر آوٹ لاز' یعنی 'نیوکلیئر باغی'۔ یہ یاد رہے کہ امریکہ اور دیگر جی ۷ ممالک کے پاس تیسری دنیا کی 'نیوکلیئر باغی' ریاستوں سے کئی سو گنا زیادہ ایٹمی ہتھیار و اسلحہ ہے لیکن یہ اپنے آپ کو 'نیوکلیئر باغی' کا 'خطاب' نہیں دیتے۔ یہ بھی یاد رہے کہ انسانی تاریخ میں آج تک صرف امریکہ ہی نے جاپان کی دو آبادیوں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم گرائے ہیں جو کہ یقیناً تاریخ کا سب سے سیاہ عمل ہے۔

یہ اصطلاحات یقینی امریکی سامراجیت کے ارادوں کو کھل کر بیان کرتی ہیں جس میں امریکہ عالمگیریت یا آزاد تجارت کو آگے بڑھانے کے لیے اب فوجی طاقت کے استعمال کو 'جائز' عمل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

جیسے کے پہلے کہا جاچکا ہے کہ اس تجزیے کا مقصد امریکی جنگی اہلیت کا جائزہ نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری عسکریت پسندی اور کارروائیوں کے حوالے سے عورتوں کے جوابات اور مزاحمت کو سمجھنا ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم پہلی اور تیسری دنیا میں تحریک نسواں کا جائزہ لیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں نے امریکی ملٹری سوچ اور عمل کے خلاف ایک مستقل جدوجہد جاری رکھی ہے۔ مثلاً جب امریکہ نے انگلستان کے جنوب میں گرین ہیم کامن میں ایٹمی ہتھیار رکھنے کا فیصلہ کیا تو وہاں کی مقامی عورتوں نے ایک تنظیم 'ویمن فار لائیف آن ارتھ' یعنی 'خواتین برائے زمین پر زندگی' کے نام سے تنظیم بنائی جس نے ۱۹۸۱ سے لیکر ۲۰۰۰ تک مستقل اس ملٹری بیس کے سامنے اس کے خلاف احتجاج جاری رکھا[۵]۔

اسی طرح کی ایک اور تنظیم 'اکیناوا ویمن ایکٹ اگینسٹ ملٹری وائیلنس' ہے۔ یہ عورتوں کی جاپانی تنظیم ہے جو امریکی ملٹری کے خلاف بنی تھی۔ اس تنظیم کا کہنا ہے کہ 'ملٹری ایک تشدد پھیلانے والا ادارہ ہے جس میں جنسی تشدد ایک بنیادی عمل ہے۔ ملٹری طاقتوں میں عورتوں کے خلاف ایک شدید نفرت پائی جاتی ہے'[۶]۔ مزید یہ کہ 'ملٹری ہمیشہ عورت کو ''دوسرے'' کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یعنی وہ ''دوسرا'' جس کے اوپر طاقت کا استعمال کیا جائے۔ عسکریت پسندی عورتوں کے خلاف کئی طرح کے تشدد اختیار کرتی ہے۔ ان میں زناء، جنسی تشدد جیسے ہتھیار ملٹری میں استعمال ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں'[۷]۔ تحریک نسواں کی عسکریت پسندی کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے

عالمی سطح پر فوجی اڈے بنائے جانے کے عمل میں تبدیلی آئی ہے۔ مثلاً لوٹز لکھتی ہیں کہ 'ملٹری تجزیہ نگار اب اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ فوجی اڈوں کے خلاف مظاہرے کی کیا امید ہے اور ان کو قائم کرنے کے لیے ایسے مقامات کی تجویز پیش کرتے ہیں جہاں وہ کم از کم نظروں میں آئیں'[8]۔

آج کے دور میں عورتیں ملٹری فورسز میں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں، خاص کر کے امریکی فوج میں۔ مثلاً اس وقت عراق اور افغانستان میں ۱۱۹,۰۰۰ عورتیں امریکی فوج کا حصہ ہیں۔ بی بی سی کے مطابق حاضر سروس عورتوں میں سے ۳۰ فیصد کے ساتھ جنسی تشدد ہوا ہے جبکہ ۷۱ فیصد جنسی حملے کا شکار ہوئی ہیں۔ لیکن امریکی ڈیپارٹمنٹ آف ڈیفنس، سالانہ رپورٹ ۲۰۰۹ کے مطابق ۸۴ سے ۸۵ فیصد فوجی جن پر جنسی تشدد کے الزامات تھے کو باعزت طور پر برخاست کیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ''عراق کی ۱۳۰ فارن ہائٹ گرمی میں کئی امریکی فوجی عورتیں نمکیات کی کمی کی وجہ سے انتقال کر گئیں کیوں کہ وہ شام کے بعد پانی اس ڈر سے نہیں پیتی تھیں کہ واش روم جانے سے گھبراتی تھیں کہ رات میں ان پر جنسی تشدد کے حملے عام تھے'[9]۔

اس قسم کی کئی شدید زیادتیوں کے جواب میں امریکی فوجی عورتوں نے کئی طرح کی مزاحمتی تدابیر اختیار کی ہیں۔ مثلاً ایک امریکی فوجی عورت فنز سمنسز جو ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۹ تک امریکی ایئر فورس میں حاضر سروس رہیں۔ اس دورانیہ میں وہ جنسی حملوں کا شکار ہوئیں۔ لیکن حاضر سروس میں ہونے کی بنا پر انہوں نے اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں پر خاموشی اختیار رکھی۔ نو/گیارہ کے واقعات کے بعد، خاص کر کے ۱۴ سالہ عراقی لڑکی جو کئی امریکی فوجیوں کے ہاتھوں جنسی تشدد کا شکار ہوئی، فنز سمنسز مزید خاموش نہ رہ سکیں اور انہوں نے سوان (سروس ویمنز ایکشن نیٹ ورک) نامی ایک تنظیم بنائی تا کہ ملٹری کی ان عورتوں کی مدد کی جائے جو جنسی تشدد کا سامنا کر چکی ہوں'[10]۔

نو/گیارہ کے واقعات کے بعد اس طرح کی کئی مثالیں سامنے آتی ہیں جہاں پر امریکہ میں بسنے والی افغانی اور پاکستانی عورتوں نے امریکی سامراج کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ زیادہ تر یہ وہ عورتیں تھیں جن کے شوہر یا گھر کے مردوں کو نو/گیارہ کے واقعات کے بعد غیر قانونی حراست میں لے لیا گیا تھا[11]۔ ارم شیخ کا کہنا ہے کہ کئی خاندانوں میں بیویوں، ماؤں اور بیٹیوں نے اپنے آپ کو انسانی ڈھانچے (شیلڈ) کے طور پر اپنے مردوں کے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہ میڈیا اور کمیونٹیز کے ساتھ مستقل کام کرتی رہیں تا کہ اس مسئلے پر مقامی اور قومی سطح پر آگاہی پھیلا سکیں لیکن افسوس

کے ان عورتوں کی عمل کاریوں پر کوئی توجہ نہیں دی گئی'[12]۔

راوا یا ریولوشنری ایسوسی ایشن آف دی ویمن آف افغانستان ایک ایسی تحریک ہے جس نے افغانستان میں امریکہ کی عسکریت پسندی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی طالبان کی مذہبی انتہا پسندی دونوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ راوا ۱۹۷۷ میں قیام پزیر ہوئی۔ یہ افغانی عورتوں کی سب سے پرانی سیاسی و معاشی تنظیم ہے جو کہ افغان عورت کے لیے امن، آزادی، جمہوریت اور حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کررہی ہے۔ راوا کا کہنا ہے کہ اس نے تین طرح کی جارحانہ طاقتوں کا مقابلہ کیا ہے جن میں افغانستان میں سویت کنٹرول، طالبان حکومت اور امریکی قبضہ شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راوا کی زیادہ امداد مغربی ممالک کی طرف سے حاصل کی گئی۔ راوا کے خلاف کئی طرح کے الزامات درج کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کے وہ ماؤایسٹ رجحان رکھتی ہیں یا پھر پاکستانی انٹیلی جینس ایجنسیوں سے ان کا تعلق ہے۔ راوا کا سب سے زیادہ کام افغان عورتوں پر مذہبی انتہاء پسندی کے اثرات کو اجاگر کرنا ہے۔ اس کے علاوہ راوا زیادہ عورتوں میں تعلیم بالغان اور حقوق نسواں پر جانکاری کے حوالے سے کام کرتی رہی ہے۔ شائد انہی وجوہات کی بناء پر راوا زیادہ روشن خیال سوچ سے نزدیک پائی جاتی ہے بانسبت ترقی پسند سوچ کے۔

اب تک عورتوں اور تحریک نسواں کے پرامن جوابات اور مزاحمت پر ایک نظر ڈالی گئی تھی لیکن دراصل ان تحریکوں کے علاوہ عورتوں کی ترقی پسند مزاحمتی تاریخ بھی موجود ہے۔ اس حوالے سے زیادہ تر نیپال میں تحریک نسواں پر ایک نظر ڈالی جائے گی۔ نیپال کی حالیہ ماؤایسٹ اور دیگر جدوجہد جو کہ بادشاہت کے خلاف لڑی گئی میں عورتوں کی تنظیموں کا بڑا ہاتھ ہے۔

ان تحریکوں میں تین مخصوص رجحانات دیکھے گئے ہیں۔ ان میں روشن خیال تنظیم سازی بھی شامل ہے جو کہ نیپال میں موجود جاگیرداری اور سرمایہ دار طاقتوں کا ساتھ دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی این جی اوز جو کہ سرمایہ درانہ سوچ کی مخالفت کیے بغیر اصلاح پسندی کو فروغ دیتی تھیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ماؤایسٹ پارٹی سے جڑی ہوئی ترقی پسند عورتوں کی تنظیمیں بھی ہیں جو کہ طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ مثلاً انوا (آر) یعنی آل نیپال ویمنز ایسوسی ایشن، ریولوشنری۔

آل نیپال ویمن ایسوسی ایشن (یوایم ایل)، جو کہ انوا (آر) سے مختلف ہے بادشاہی نظام کے

خلاف جدوجہد میں شامل تھی اور عورتوں کو منظّم کرنے میں کوشاں رہی۔ انوا (یوایم ایل) نے انوا (آر) کے مقابل پرامن جدوجہد میں حصہ لینا پسند کیا۔ یہ تنظیم نے ملکی اور غیر ملکی این جی اوز کو اپنی جدوجہد کا حصہ بنایا۔ اس تنظیم پر کئی طرح کی تنقید کی جاتی ہے کیونکہ بادشاہت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے یہ دیکھا گیا کہ وہ ریاست کے اہلکاروں کے ساتھ سمجھوتا کرنے پر راضی نظر آئیں۔

انوا (آر) نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا جس کے تحت بادشاہی نظام جو کہ سرمایہ داری کے سائے تلے پنپ رہا تھا، کے خاتمے کے لیے کئی طرح کے اقدامات اٹھائے۔ انوا (آر) کے نزدیک انقلاب کے لیے اصلحہ آمیز جدوجہد ایک ضروری عمل ہے تاکہ عوام تشدد پسند ریاست کے خلاف جدوجہد کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

انوا (آر) نے عورتوں کو بندشوں سے آزاد کرنے کے لیے کئی طرح کی تحریکیں چلائیں جن میں شراب کی فروخت پر پابندی، مردوں کی ایک سے زیادہ شادی اور فحاشی پر پابندی شامل ہیں۔

انوا (آر) کمیونسٹ پارٹی آف نیپال (ماؤایسٹ) سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس پارٹی کی سینٹرل کمیٹی میں کئی عورتیں موجود ہیں اس کے علاوہ کئی ہزار عورتیں ضلعی اور دیگر سطح پر پارٹی میں شامل ہیں۔ ماؤایسٹ پیپلز لبریشن آرمی میں بھی عورتیں ہر سطح پر پائی جاتی ہیں اس کے علاوہ ان کے الگ عسکری گروہ بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماؤایسٹ آرمی میں کم از کم ۳۰ فیصد عورتیں شامل ہیں۔

پارٹی لیڈرشپ میں کامریڈ پروتی کا کہنا ہے کہ 'انقلاب کے زمانے میں عورتیں تحریک کی نمائندگی میں آگے آگے ہوتی ہیں لیکن جب حالات بہتر ہوتے ہیں تو ان کے کردار کو پھر پیچھے کر دیا جاتا ہے۔ اس رویہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نجی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ جب تک نجی ملکیت کا تصور رہے گا تو عورت کو گھرداری میں ملوث رہنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ مردوں کی نجی ملکیت رہیں گی۔ چاہے جتنی بھی معاشرتی انقلاب آجائے'[۱۳]۔

تحریک نسواں پر دی گئی مثالوں سے نظر آتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عسکریت پسندی کے خلاف عورتوں میں کئی طرح کی جدوجہد ہے۔ ایک طرف وہ گھریلو عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے گھر اور گھر والوں کی حفاظت کے لیے وقتی طور پر سڑک پر آکر ناانصافیوں پر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنھوں نے کسی تنظیم میں شامل ہوئے بغیر وقت پڑنے پر احتجاج کا راستہ اپنایا۔ دوسری طرف عورتوں کی ایسی تنظیم سازی نظر آئی جس میں عورتوں نے منظّم ہو کر پرامن طور پر

عسکریت پسندی کو نشانہ بنایا لیکن شائد وہ سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل پر طور پر نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی پرامن جدوجہد نے سرمایہ داری نظام کو اپنی عسکریت پسند سوچ اور عمل کاری کے زاویوں کو بدلنا پڑا کم ازکم اس حد تک کہ وہ عوام کی نظر سے چھپ کر اپنے کالے دھندوں میں ملوث ہوں۔ ان تحریکوں نے بڑے پیمانے پر عام لوگوں کی سوچ پر اثر چھوڑا۔

تحریک نسواں کا ایک اہم حصہ مسلح جدوجہد بھی ہے۔ اس جدوجہد میں یقیناً ترقی پسند سیاسی پارٹیوں کا بڑا ہاتھ ہے جو سرمایہ داری کے خلاف ٹھوس سیاسی سوچ رکھتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی جدوجہد دونوں میں مسلح جدوجہد کو مقام دیا جاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ داری کے نام نہاد امن پسند تحریکوں کے غلبے کی وجہ سے تحریک نسواں میں مسلح جدوجہد کو ناگوار نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مسلح جدوجہد کو اس نظر سے بھی جانچنے کی ضرورت ہے کہ کیا سرمایہ داری نظام کے تحت جارحانہ عسکریت پسندی کی کیا قبولیت ہے؟ اگر ہم سرمایہ دار ممالک کے بے تحاشہ اسلحے کے ذخائر، ایٹمی اور بایولوجیکل ہتھیار اور کئی ہزار فوجی اڈوں کو اس زمین پر قبول کرتے ہیں تو پھر اس شدید حملے کے خلاف مسلح جدوجہد کیوں غلط ہے؟ اگر ہمیں عورتوں، بچوں اور اس دنیا کے باسیوں کو عسکریت پسندی سے آزاد کرانا ہے تو پہلا عمل سرمایہ داری کے سائے تلے پھلنے پھولنے والے جارحانہ عزائم کو ختم کرنا ہوگا۔ دراصل کوئی بھی جدوجہد ناگوار نہیں اگر وہ قوموں اور انسانیت کو سرمایہ داری کی شدید تباہیوں سے آزادی دلاسکیں۔ دراصل اسی وقت دیرپا امن ممکن ہوگا جب ہم بھوک، غربت، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسی ناانصافیوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیں۔

حوالہ جات

۱۔ ایلین گرین اسپین، دی ایج آف ٹربیولینس ایڈونچر، ان اے نیو ورلڈ، پین گیون ۲۰۰۷، صفحہ نمبر ۴۶۳۔

۲۔ انتونیو جوہاض ''دی ٹائرینسی آف آئل: دی ورلڈز موسٹ پاورفل انڈسٹری۔ اینڈ واک وی مٹ ڈو ٹو اسٹاپ ایٹ'' ہارپر۔ ۲۰۰۹، صفحہ نمبر ۳۲۱۔

۳۔ یوجین جاریکی ''دی امریکن وے آف وار: گائڈیڈ میزائلز مس گائیڈیڈ مین، اینڈ اے ریسک

ان پیرل' فری پریس، ۲۰۰۸، صفحہ نمبر ۹۰۔
۴۔کیتھرین لوٹز''ہوم فرنٹ: اے ملٹری سٹی اینڈ دی امریکن ٹیونٹیتھ سینچری، بیکن پریس، ۲۰۰۲
۵۔کیتھرین لوٹز''بیسیز آف ایمپائر: دی گلوبل اسٹرگل اگینسٹ یو ایس ملٹری پوسٹس'' نیویارک یونیورسٹی پریس ۲۰۰۹۔
۶۔ یوسینڈا مارشل ،''دی کنیکشن بیٹوین ملٹری ازم اینڈ وائیلنس اگینسٹ 'ویمن'' ، ۲۰۰۰، http://www.zmag.org۔
۷۔ یوسینڈا مارشل ،''دی کنیکشن بیٹوین ملٹری ازم اینڈ وائیلنس اگینسٹ 'ویمن'' ، ۲۰۰۰، http://www.zmag.org۔
۸۔کیتھرین لوٹز، امریکن ایتھنولوجسٹ،''ایمپائر از ان دی ڈیٹیلز'' جلد ۳۳ نمبر ۴، نومبر ۲۰۰۶، صفحہ ۶۰۳
۹۔جمائل داہر،''دی ویل ٹو ریزیسٹ''۲۰۰۹، صفحہ ۱۳۳۔
۱۰۔جمائل داہر،''دی ویل ٹو ریزیسٹ''۲۰۰۹، صفحہ ۱۳۳۔
۱۱۔ارم شیخ'' ریڈنگ ٹریسنگ اینڈ لوکیٹنگ جینڈر ان 9/11 ڈی ٹینشنز''، لورا فلینڈرز (ایڈیٹر) ''دی ڈبلیو افیکٹ: بوشیز وار آن ویمن''۔ دی فیمنسٹ پریس، ۲۰۰۴، صفحہ نمبر ۴۳۔
۱۲۔ارم شیخ'' ریڈنگ ٹریسنگ اینڈ لوکیٹنگ جینڈر ان 9/11 ڈی ٹینشنز''، لورا فلینڈرز (ایڈیٹر) ''دی ڈبلیو افیکٹ: بوشیز وار آن ویمن''۔ دی فیمنسٹ پریس، ۲۰۰۴، صفحہ نمبر ۴۳۔
۱۳۔کامریڈ پروتی،''ویمنز لیڈرشپ اینڈ دی ریولوشن آن نیپال''، منتھلی ریویو، فروری ۲۰۰۳۔

فضائی میزبانی کی تاریخ

ثروت رضوی

جیسا کہ آپ کو بتایا گیا آج کی اس کانفرنس میں میرے مقالے کا عنوان ہے 'خواتین فضائی میزبان' میرا تعلق ادب سے ہے اور پروفیشن کے اعتبار سے میں فضائی میزبان کے شعبے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں پاکستان کی قومی فضائی کمپنی PIA سے منسلک ہوں۔

مسافر بردار جہاز کام کرنے والے عملے کو فضائی میزبان، Cabin Crew، Flight Attendent، اسٹیورڈ یا اسٹورڈز کہا جاتا ہے۔ اسٹیورڈ یا اسٹیورڈز کا لفظ ابتدائی طور پر Maritime Transport میں استعمال کیا گیا۔ چودھویں صدی کی بات ہے کہ پہلی بار Maritime Tradation کے مطابق یہ اصطلاح رائج ہوئی جسے انٹرنیشنل کنونشن کے معاہدے کے مطابق American Marine Marchant نے بھی اختیار کرلیا اور اُنہوں نے چیف اسٹیورڈ کے عہدے کا بھی اضافہ کردیا۔

برطانیہ کی Imperial Airways نے ۱۹۲۰ء میں کیبن کریو اور اسٹیورڈز کو ملازمتیں دیں تھیں، جب کہ امریکہ میں Sout Airways پہلی ایئر لائن تھی جس نے ۱۹۲۶ء میں اسٹیورڈ کو ملازمت دی تھی۔ یہ اسٹیورڈز، فورڈ ٹرائی جہازوں پر اپنی خدمات انجام دیتے تھے، اسی دوران ۱۹۲۸ء میں Grant Repids گرانٹ ریپڈز مشی گن، امریکہ ویسٹرن ایئر لائنز نے اور ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ مسافروں کو غذا اور خدمات کی فراہمی کے لیے اسٹورڈز کی تعیناتی کی۔ پین ایم کے پاس اس وقت ۱۰ ارنشستوں والے فوکر طیارے تھے اور Caribbean میں چلائے جاتے تھے۔ جس میں ہوانا، کیوبا، (Key West) اور فلوریڈا شامل تھے۔ ان جہازوں پر اسٹیورڈ کے ساتھ ساتھ چیف اسیٹورڈ بھی تعینات ہوتا تھا۔

دنیا کی پہلی فضائی میزبان ۲۵ سالہ رجسٹرڈ نرس ایلن چرچ Elen Charch تھی۔ جسے United Airline نے ۱۹۰۳ء میں Appoint کیا تھا۔ اُسے فضا میں پہلی نرس ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اس تقرری کے پیچھے یقیناً یہ خیال پوشیدہ تھا کہ ایک تجربہ کار اور پروفیشنل نرس نہ صرف یہ کہ بہتر تعلقاتِ عامہ (Public Relation) کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوگی بلکہ وہ مسافروں کو بہتر طریقے سے دوران پرواز کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی، توجہ اور بہتر برتاؤ کی حامل ہوگی۔ اسی تقرری کے پیچھے یہ خیال بھی حاوی رہا ہوگا کہ ایک عورت اپنی جبلّت اور مزاج میں قدرتی طور پر تواضع، توجہ اور بہتر نگہداشت کی خصوصیات رکھتی ہے اور یہ بات بھی ذہن میں ہوگی کہ خاتون فضائی میزبان نظری جمالیات کے طور پر بھی بہتر ہوگی۔ ابتداء میں اس تقرری کی مخالفت بھی ہوئی۔ لیکن United Airline اور Boing Air Transport کی دیکھا دیکھی دوسری ایئر لائنز نے بھی اسٹیورڈز کی تعیناتی شروع کردی جو کہ پروفیشنل نرس ہوا کرتی تھی۔ یہ فضائی میزبان مخصوص فلائٹس پر بھیجی جاتی تھیں۔ مخالفتوں کے باوجود ۱۹۳۳ء تک ۵۰ کے قریب ہوائی میزبانوں کا تقرر کیا جا چکا تھا اور اُنہیں Sky Girls کے نام سے پکارا جانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم تک نرسوں کا بحثیت فضائی میزبان تقرری کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر جنگ میں زخمیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر نرسوں کی ضروریات بڑھ گئیں اور ان کی زیادہ تر تعیناتی جنگی محاذ پر کی جانے لگی۔ یہاں سے پروفیشنل خواتین فضائی میزبانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس شعبے میں خواتین کی آمد بہت تیزی کے ساتھ ہوئی اور خاص طور پر امریکہ میں ان خواتین کو بہترین تہذیبی اور تمدنی شخصیت قرار دیا جانے لگا۔ ۱۹۳۳ء کی ابتداء میں جب کہ خواتین فضائی میزبانوں کی تقرری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان مسافروں میں جو غیر ہموار پروازوں سے خوفزدہ ہو جاتے تھے آہستہ آہستہ نفسیاتی اطمینان نے جگہ بنانی شروع کردی کہ اگر ایک نوجوان لڑکی دورانِ پرواز اپنی خدمات خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے تو اُن کو محض اپنی نشستوں پر سکون سے بیٹھ کر پرواز کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں خود ایسے Frequent Flayer کو جانتی ہوں کہ وہ بوجوہ دورانِ پرواز خوفزدہ رہتے ہیں اور نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں، ان کا اپنا کہنا یہ ہے کہ اگر انہیں ہوائی جہاز کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل میسر آجائے تو وہ اُس متبادل سفر کو ترجیح دیں گے۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ دنیا میں آج سب سے محفوظ اور آرام دہ سفر ہوائی سفر ہی ہے۔

وہ خود دورانِ پرواز فضائی میز بانوں کا چہرہ دیکھ کر تمام سفر سکون کے ساتھ کاٹ لیتے ہیں اور مستقل فضائی میز بانوں کے چہرے اور خدمات انجام دیتے ہوئے مصروفِ عمل عملے کو دیکھ کر اطمینان سے اپنا سفر تمام کرتے ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد Orient Airline نے پاکستان کی پہلی ائیرلائن کے طور پر کام کرنے کا آغاز کیا تھا جب کہ ۱۹۵۵ء میں Pakistan International میں Orient Airline کو ضم کر دیا گیا اور یوں پاکستان کی قومی فضائی کمپنی PIA کا قیام عمل میں لایا گیا۔ PIA کو اس برس ایشیاء کی پہلی ائیرلائن کی حیثیت سے London کے روٹ پر اپنی پرواز شروع کرنے کا آغاز حاصل ہوا۔ پاکستان کی قومی فضائی کمپنی کے لیے جہاں تکنیکی سہولیات اور جہازوں کے بیڑے کی ضرورت تھی وہیں ہوائی میز بانوں کے لیے ایک ایسے یونیفارم کا انتخاب بھی ضروری تھا جو قومی شناخت کا بھی عکس ہو۔ اس حوالے سے PANAM کی طرف سے پی۔ آئی۔ اے میں کام کرنے والے Mr. Chausee نے فضائی میز بانوں کے لیے پہلا سبز رنگ کا یونیفارم تیار کیا جو پاکستانی پہناوے سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہ یونیفارم ۱۹۶۰ء تک چلتا رہا اور پھر فیشن کی تبدیلی کے پیشِ نظر پیرس کے یونیفارم ڈیزائنر Mr. Cardin کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنہوں نے سرد اور گرم موسم کو سامنے رکھتے ہوئے Fawn اور Green رنگوں میں پائجامے اور شرٹ کے ساتھ فضائی میز بانوں کا نیا یونیفارم تیار کیا۔

یونیفارم میں جدتوں اور تبدیلیوں کے سلسلے کے ساتھ ساتھ قومی فضائی کمپنی پی۔ آئی۔ اے میں فضائی میز بانوں کی تربیت اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا اور PIA Training Centre سے فضائی میز بان تربیت حاصل کرتے رہے۔

جہاز کے کیبن میں کام کا آغاز شروع کرنے والی کسی بھی فضائی میز بان کے لیے صاف ستھری یونیفارم، بہتر طریقے سے سنوارے یا تراشے ہوئے بال، ضروری میک اپ اور چہرے پر شادابی عام طور پر اس کی ذمے داری کی بنیادی ضروریات تصور کیے جاتے ہیں۔

ہنستی مسکراتی اور خوش گوار انداز سے ہر عمر اور ہر سطح کے مسافروں پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے فضائی میز بانوں کو انتہائی شائستگی اور بعض اوقات بردباری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ محض خاتون فضائی میز بان پر ہی موقوف نہیں بلکہ مرد فضائی میز بانوں پر بھی یہی کچھ لاگو ہوتا ہے۔ مگر دنیا بھر

میں عمومی طور پر مرد وزن کی نگاہ خواتین فضائی میزبانوں پر ہوتی ہے اور میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ دورانِ پرواز مسافر اپنی زیادہ تر ضروریات، شکایات کا اظہار خاتون فضائی میزبانوں سے ہی کرتے ہیں۔

'فضائی میزبان' کسی بھی ایئر لائن کا چہرہ ہوتے ہیں، ایسے حالات میں بھی کہ جب جہاز فضا میں کسی مشکل میں آجائے، ان فضائی میزبانوں کو پر سکون اور حد سے زیادہ احتیاط پسند اور چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

یہاں میں اس بات کی وضاحت انتہائی ضروری سمجھتی ہوں کہ فضائی میزبانوں کو محض مسافروں کی نگہداشت، اُن کو بہتر سروس اور شائستہ گفتگو کے حوالے سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ بلکہ فضائی میزبانوں کا سب سے بنیادی اور کلیدی کردار تحفظ ہے۔ تحفظ یعنی Safety of the Passenger اور Safety of the Aircraft فضائی میزبانوں کی Primerary Job ہے اور Comfort Secondry Job ہے اور Safety کے لیے ان کو بھرپور تربیت دی جاتی ہے۔

مطلوبہ تعلیمی معیار، شکل صورت وقامت Personal Grooming اور انٹرویو کے مراحل سے گزر کر تحریری ٹیسٹ دینے کے بعد اُنہیں Appoint کیا جاتا ہے۔ اور ۳ ماہ کی مینڈیٹری ٹریننگ دی جاتی ہے۔ جس میں دورانِ پرواز ہر طرح کے ہنگامی حالات مثلاً First Aid، Fire Decompration، ابنارمل ٹیک آف اور لینڈنگ وغیرہ کے حالات سے نمٹنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ جب کہ Dangers Goods، Hijacking کے بارے میں بھی پڑھایا اور آگاہ کیا جاتا ہے۔ Ditching یعنی پانی پر Emergency Landing کے بعد کی صورت حال سے نمٹنا بھی سکھایا جاتا ہے۔

First Aid کی بنیادی ٹریننگ، بینڈیج، آرٹی فیشل Ventilater، CPR، Child Birth وغیرہ بھی تربیت کا حصہ ہیں۔ جب کہ ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے عملی تجربات بھی کرائے جاتے ہیں۔ ۳ ماہ کی اس سخت اور بامشقت ٹریننگ کے بعد فضائی میزبانوں کا سیفٹی کلیئرنس سرٹیفکیٹ بنتا ہے جو ایک سال کے لیے Valid ہوتا ہے۔ ایک سال بعد انہیں ۵ روزہ Refresher کرنا پڑتا ہے جس میں ان تمام چیزوں کا اعادہ کرایا جاتا ہے۔

اس ٹریننگ میں ہی Grooming کی کلاسز بھی دی جاتی ہیں اور Standard Operating Procedures اور Infligit سروسز کا تعلق غذا اور آرام، آسائش کی فراہمی کو ہر ممکنہ حد تک میسر بنانا ہے سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔ ASF، FIA، سول ایوی ایشن، کسٹمز، ایاٹا اور اکاؤ کے قوانین سے بھی خاطر خواہ آگاہ کیا جاتا ہے۔

کسی بھی پرواز کی روانگی سے تین یا ڈھائی گھنٹے پہلے ان کا Pickup ہوتا ہے اور پرواز سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے Reporting ٹائم۔ پرواز سے پہلے تمام فضائی میزبانوں کی کپتان یا سینئر پر سر بریفنگ کرتا ہے۔ جس کا مقصد پرواز سے متعلق ضروری معلومات کی فراہمی اور فضائی میزبانوں کو دورانِ پرواز ان کی ڈیوٹی اسائن کرنا ہوتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ متعلقہ کرو ممبز نے اُس جہاز پر متعدد بار سفر کیا ہو۔ اُس کے ہنگامی آلات، اُس کی سیفٹی پر بریفنگ دی جاتی ہے اور یہ بھی دُہرایا جاتا ہے کہ جہاز پر کون کون سے ہنگامی حالات ہو سکتے ہیں بالخصوص ۴ کی Emergency فرسٹ ایڈ (Emergencies)، فائر، (Abordent Takoff)، ابنارمل لینڈنگ (Rejected Take Off) کے بارے میں خصوصی بریفنگ دی جاتی ہے۔

بریفنگ روم سے نکلنے کے بعد یہ مستعد عملا ایک ٹیم کی صورت میں سیکورٹی اور کسٹم و ایف۔آئی۔اے کے کاؤنٹر سے گذرنے کے بعد جہاز پر پہنچتا ہے۔

جہاز میں داخلے کے بعد فضائی میزبان سب سے پہلے Safety Cheek کرتے ہیں اور تمام ہنگامی آلات کو جہاز کے دروازوں کے خودکار نظام کو نیز ایمرجنسی لائٹنگ سسٹم، فائر الارم، ویڈیو سسٹم اور آکسیجن کی فراہمی کے نظام کو بھی چیک کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کو اطمینان بخش قرار دیے جانے کے بعد غذا اور مسافروں کی دیگر آرام و آسائش کے سامان کا Charge کیٹرنگ اور متعلقہ عملے سے لیا جاتا ہے جو اس وقت وہاں آ موجود ہوتے ہیں۔ ان تمام امور سے کپتان کو مطلع کیا جاتا ہے اور کپتان اپنے اطمینان کے بعد بورڈنگ کلیرنس دیتا ہے۔

مسافروں کو مسکراتے ہوئے، دروازے پر خوش آمدید کہنا بالخصوص خاتون فضائی میزبان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ لیکن مرد فضائی میزبان بھی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اوّلیت خواتین کو دی جاتی ہے۔ مسافروں کو ان کی مقررہ نشست تک پہنچانا، خوشگوار اور اطمینان بخش رویے کے ساتھ بورڈنگ کارڈ دیکھتے ہوئے ان کی مناسب رہنمائی کے ساتھ مقررہ نشستوں پر بٹھانا بھی ایک مرحلہ

ہوتا ہے۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے۔ مگر بیرونِ ملک ناخواندہ پاکستانیوں کی بڑی تعداد سفر کرتی ہے۔ یہ ہمارے مسافر اکثر اپنی کم علمی کی بنا پر اپنی نشستوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر ایک ہی جگہ پر جمع ہوجاتے ہیں اور غیر ضروری یا اضافی سامان کو جو کہ مقررہ سائز سے زیادہ ہوتا ہے کیبن میں لے آتے ہیں۔ ان کے سامان کو ایڈجسٹ کرنا اور تمام معاملات کو خوش اسلوبی سے نبھانا بھی فضائی میزبان کا ہی کام ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ان مسائل میں سب سے زیادہ دقت کا سامنا خواتین میزبانوں کو ہوتا ہے۔ کیوں کہ مسافروں کا سامان اٹھانا یا رکھنا فضائی میزبانوں کے فرائض منصبی میں شامل نہیں ہے۔ تاہم پاکستانی فضائی میزبان اپنے فرائض کے برخلاف یہ کام فقط اپنے ماحول، تہذیب اور بودوباش کے پیش نظر کردیتے ہیں۔

جہاز میں تمام مسافروں کے بیٹھنے کے بعد جب دروازہ بند ہوجاتا ہے تو مسافروں کو روانگی کی Announcement کے بعد Safety Demostrater کے ذریعے ہنگامی حالات کے مطابق ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ جس میں سیٹ بیلٹ، آکسیجن ماسک اور اگر ضرورت ہوتو لائف جیکٹ کی Demostration شامل ہے۔ جسے ہمارے بعض مسافر حضرات غیر اہم سمجھتے ہیں۔ Demo کے بعد فضائی میزبان تمام مسافروں کا Safety Check کرتے ہیں۔ یعنی سیٹ بیلٹ، سیٹ بیک Close Table وغیرہ Check کرتے ہیں اور پھر Cockpit سے Command مل جانے کے بعد اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

Take off کے بعد سروس وغیرہ کے مراحل کے علاوہ لمبی فلائٹوں پر ہر ۲۰ سے ۳۰ منٹ کے دوران Cabin کا Check ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر رات کی فلائٹوں پر یہ ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔

فضائی میزبان فقط ٹرے سجانے اور خاطر تواضع کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ ان کا پہلا اور بنیادی فرض یعنی بنیادی ڈیوٹی تحفظ کی فراہمی ہے۔ نہ ہی فضائی میزبان کا مخصوص خواتین کوئی Entertainmen کا ذریعہ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا اپنے کام میں پروفیشنل ہونا اور ان کی وسیع نالج ہے۔

'مسافروں کو باحفاظت، آرام کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانا' ایک فضائی میزبان کا Moto ہے۔ میں اپنے تجربے اور مشاہدے کے سبب اور تحفظ کی اوّلیت کی بنا پر اس شعبے میں کام کرنے والوں کو فضائی پاسبان قرار دیتی ہوں۔

لیکن سوال یہاں میرے قرار دینے کا نہیں ہے سوال یہ ہے کہ اس حوالے سے خود فضائی ادارے، ذرائع ابلاغ اور مسافر کیا رائے رکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات میں فضائی میزبان اپنے مضبوط اعصاب کے ساتھ اپنے مسافروں کو اطمینان کے ساتھ رکھتے ہیں اور ہر قسم کی صورت حال کو Control میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی کپتان اس وقت تک فلائٹ نہیں کر سکتا جب تک اس کا Cabin Crew مسافروں کو سکون اور تحفظ نہ فراہم کر سکے۔ گویا فضائی میزبانوں کا بنیادی کام تحفظ دینا اور تحفظ کا احساس دلانا ہے۔ احساس تحفظ محض پروازوں پر ہی نہیں بلکہ سفر کے تمام ذرائع تحفظ کے ساتھ آرام، نگہداشت اور بہترین ماکولات کے متقاضی ہیں۔ اسی لیے اب تو زمینی سفر میں بھی خواتین میزبان کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے۔

یہ پہلو اپنی جگہ کہ: 'وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ' لیکن عورت محض معاشرے میں رنگ آمیزی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ معاشرے کے ایک فعال رکن کے طور پر اپنا ضروری کردار ادا کرتی ہے۔

فضائی میزبان اپنے شعبے میں انتہائی محنت سے کام کرتی ہیں اور فضائی میزبان جنہیں ایئر لائن کا چہرہ بھی کہا جاتا ہے لیل و نہار کی گردشوں سے آزاد ہو کر قریب دور کی پروازوں پر اپنی ڈیوٹی انجام دیتی ہیں۔ جہاں انہیں نہ صرف مسافروں کے تحفظ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اسے ایک پر تکلف، محفوظ اور آرام دہ فلائٹ بنانا ہوتا ہے۔ وہاں اپنے افسران، اپنے عملے اور ادارے کے معیارات کی بھی فکر ہوتی ہے۔ کیوں کہ جہاز کے Cabin میں ہونے والی کوئی بھی ناخوشگواریت مثلاً غذا کی فراہمی، نشست کی بے آرامی، پرواز کی تاخیر۔ جیسے مسائل کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ جنہیں وہ بخوبی حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب ہم دیگر ممالک کی ایئر لائن کو دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں مختلف النسل عملے کی تعیناتی کا رجحان نظر آتا ہے۔ مثلاً سعودیہ، گلف، قطر، امارات اور برٹش ایئرویز وغیر مختلف ممالک سے اپنا

Crew ہائر کرتے ہیں۔ جنہیں Language Speakers کہا جاتا ہے اور وہ عملاً بالخصوص ان Roats کی فلائٹیں کرتا ہے جہاں سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ ہر سعودی ایئر لائن کی ہر پاکستان آنے والی فلائٹ پر دو پاکستانی ائیر ہوسٹس اور اسی طرح انڈیا جانے والی پروازوں پر انڈین جس کا مقصد فلائٹ کو مزید آرام دہ اور مسافروں کے لیے آسان بنانا ہے تاکہ وہ اپنی ضروریات کا اردو اور انگریزی زبان کے علاوہ مختلف زبانوں پر عبور ایک اضافی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کے پاس بھی تھائی لینڈ، جاپان، چائنا اور فلپائن کے لیے مقامی کرو موجود ہے۔ جب کہ اس سے پہلے Greek اور African کرو بھی تعینات کیا جا چکا ہے۔

اپنے ہم زبان یا ہم وطن عملے کی موجودگی نفسیاتی طور پر مسافروں میں اپنائیت اور تحفظ کے احساس کو مزید مضبوط کرتی ہے۔ ہماری قومی ائیر لائن سے ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب امریکا تشریف لے جا رہے تھے اور امریکا جاتے ہوئے جہاز کو تقریباً ۵ گھنٹے سمندر کے اوپر سے پرواز کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے عملے کے ایک فرد کو آٹو گراف میں جو شعر لکھ کر دیا وہ اس احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔

میں تھا ہوا میں اور سمندر سفر میں تھا
اپنے تھے ساتھ اس لیے میں اپنے گھر میں تھا

اب تک ہم بین الاقوامی تناظر میں بات کر رہے تھے جہاں فضائی میزبانی جیسے اہم اور مشکل کام کے لیے میچورڈ، ذہنی طور پر بالغ، سمجھدار اور ذمے دار پروفیشنل کرو کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس انتخاب میں بنیادی وجہ تقرر خوبصورتی یا کم عمری مس ہوتا بلکہ پروفیشنل ہوتا ہے۔

جب کہ ہمارے یہاں عمومی معیار تا حال ۵ فٹ دو انچ قد وزن مناسبت کے ساتھ، خوبصورت، جس کے معیارات ہر کسی کے مختلف ہوتے ہیں اور تعلیمی قابلیت انٹرمیڈیٹ (زیادہ ہو تو مضائقہ نہیں) اور انٹرمیڈیٹ سے پہلے میٹرک بھی تقرر کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ملازمت کے لیے ایئر لائن جوائن کرنے والی متوسط طبقے کی پاکستانی لڑکی جس کا تعلق پاکستان کے کسی انٹریر کے دور افتادہ علاقے سے بھی ہوسکتا ہے۔ وہ کنوئیں سے نکل کر جب فضاؤں اور شہروں شہروں سفر کرے گی تو لغزشوں پر آمادہ کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کیوں کہ ہمارا معاشرہ بدقسمتی سے اب تک اسی طور پر بلوغت کی اس سطح پر نہیں پہنچا جہاں

اسے ہونا چاہیے۔

دنیا کے تمام معاشرے چاہے وہ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر عورت کو مرد کے مقابلے میں قدرے کم طاقتور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے جیسے معاشرے میں تو عورت یوں بھی محکومیت کی انتہائی سطح میں ہے۔ لڑکیوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ غیر محفوظ ہیں اور یہ احساس اس حد تک دلایا جاتا ہے کہ مخالف جنس کی نظریں بھی مشکوک قرار دی جاتی ہیں۔ بچی ابھی ۱۰ رسال کی بھی نہیں ہوتی کہ اس پر مختلف قسم کی روک ٹوک شروع ہو جاتی ہے اور بہت ساری باتیں جو اس پر لاگو کی جاتی ہیں وہ اپنی جگہ درست ہونے کے باوجود ان کا طریقہ اور ابلاغ غلط ہوتا ہے۔ جو بچی سے عورت بننے والی کے ذہن میں نفسیاتی الجھاوے پیدا کر دیتا ہے اور قدرے احساسِ کمتری اور محکومی بھی جاگ اٹھتا ہے اور وہ رسالوں، کہانیوں اور ڈراموں میں پناہ لیتی ہیں۔ ہمارے متوسط طبقے کی لڑکیاں تو ویسے بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ آج تو میڈیا اور خاص طور پر پڑوسی ملک کے میڈیا اور ثقافت کی یلغار نے تو سب کچھ ہی فینٹسی میں بدل دیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں زیبائش کے ساتھ نکلنے والی ہر عورت کو ایک خاص نکتہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مخصوص طبقہ اسے مشکوک قرار دیتا ہے۔ کوئی زمانہ تھا جب ۸۰ کی دھائی تک ٹی۔وی اور ریڈیو پر آنے والی خواتین کو بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آج کہ میڈیا آزاد ہے اور ہم پڑوسی ملکوں سے مستعار لی ہوئی ثقافت کی اندھی دوڑ میں بھی شامل ہیں ہمارے معاشرے کی اکثریت شوبزنس، نرسنگ اور ائیر لائن کی خواتین کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی۔

کسی فرد کا کہا ہوا ایک جملہ دہرا رہی ہوں کہ 'ان لڑکیوں کو ہوٹلوں، ریسٹورنٹوں اور تفریح گاہوں تک تو ساتھ لایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ساتھ گھر کی دہلیز پار نہیں کی جا سکتی' جب کہ ترقی یافتہ ممالک کی سوچ ہمارے معاشرے سے قطعاً مختلف ہے۔ وہاں لوگ فضائی میزبانوں کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

کسی ایک فرد کے کہے ہوئے اس جملے سے معاشرے کے ایک طبقے کی خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو کمتر سوچ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے معاشرے کے مزاج اور طرزِ فکر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ یہ فضائی میزبان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے مسافروں کو تحفظ اور خدمات فراہم کرتے ہیں۔

۱۹۸۵ء میں سلام اللہ ٹیپو نے جب پی۔آئی۔اے کے جہاز کو ہائی جیک کیا تھا اور اپنے ۹۲ سیاسی ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ۱۳/دن تک یہ جہاز ہائی جیکرز کے قبضے میں رہا۔ وہ جہاز کا عملہ ہی تھا جس نے حکمت عملی اور اپنے پروفیشنل برتاؤ سے ہائی جیکرز کو پُرسکون رکھا اور مسافروں کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ بالخصوص پی۔آئی کی قابل فخر ایئر ہوسٹس نائلہ نذیر جس نے اس پورے آپریشن میں جو کہ ۱۳/دن جاری رہا۔ ہائی جیکرز کے ساتھ اپنی حکمت کے سبب مسافروں کو محفوظ رکھا اور اس کارنامہ پر انہیں فائٹ سیفٹی فاؤنڈیشن کی طرف سے ایوارڈ بھی ملا۔ نائلہ نذیر نے اور ان کے ساتھیوں نے اپنی پرائمری ڈیوٹی فضائی پاسبانی کو ثابت کر دکھایا۔

یہ تو ایک مشہور واقعہ تھا لیکن ایسے کئی واقعات جو فلائٹ سیفٹی سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کرو نے غیر معمولی ذہانت اور ذمے داری کا ثبوت دیا پی۔آئی۔اے کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

خواتین فضائی میزبانوں کے حوالے سے عمومی تاثر یہ ہے خاص طور پر ہمارے معاشرے میں کہ وہ بہت آزاد خیال اور رساکشوں کی متمنی ہوتی ہیں جب کہ صورتِ حال اس حد تک تو درست ہے کہ جو مواقع فضائی میزبانوں کو میسر آتے ہیں۔ مثلاً دنیا بھر میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام، طعام، آسائشوں کی مسہری، عالمی معلومات، وہ ان کی شخصیت کو دیگر شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کے مقابلے میں منفرد کر دیتے ہیں مگر یہ معاملے کا صرف ایک پہلو ہے بظاہر گلمرس میں نظر آنے والا یہ شعبہ بے انتہا محنت اور جانفشانی کا حامل ہے۔ خاص طور پر خواتین کے لیے کیوں کہ ان کی ذمے داری تقسیم ہو جاتی ہے۔ وہ گھر بھی دیکھتی ہیں۔ اسی حوالے سے یہ بات بھی پیش نظر ہونی چاہیے کہ پہلے خواتین فضائی میزبانوں کے لیے کڑی شرائط تھیں کہ وہ شادی شدہ نہ ہوں اور نہ ہی دوران ملازمت شادی کریں بعد ازاں یہ پابندی خواتین کی جدوجہد کے بعد ہٹا دی گئی جب کہ دیگر کئی ایئر لائنز میں آج بھی یہ پابندی موجود ہے۔ ہماری یہاں صنفی تعصب کا معاملہ بھی ہے۔ خواتین فضائی میزبانوں پر انتظامی حوالے سے ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے خانگی مسائل کی بنا پر حد سے زیادہ چھٹیاں کرتی ہیں۔

اس حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ ایسا کہنا درست نہیں ہے۔ بعض حالات میں اگر کسی کے ساتھ ایسا ہو بھی جائے تو اسے محض خواتین کے ساتھ منسوب کرنا غلط ہے اور پھر یہ بات پیش نظر رہے کہ لمبی چھٹیاں بغیر تنخواہ کے ملتی ہیں۔ اور مرد حضرات بھی کرتے ہیں۔

خواتین اور مرد دونوں کو اپنے وزن پر کنٹرول رکھنا از حد ضروری ہے۔ انڈیا میں زائد وزن کی بنا پر فلائٹ سے محروم کر دی جانے والی ایک فضائی میزبان نے ائیر لائن پر مقدمہ کر دیا تھا اور اس کا کہنا یہ تھا کہ زائد وزن کے حامل مرد فضائی میزبان فلائٹ کر سکتے ہیں تو عورتوں کے ساتھ یہ تعصب کیوں؟

پاکستان میں بھی ایک ایسا وقت آیا کہ جب ۴۵ سال سے زائد عمر کی فضائی میزبان کو گراؤنڈ کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو ان خواتین نے نہ صرف اس تفریق کے خلاف آواز بلند کی بلکہ صدائے احتجاج کرتے ہوئے عدالت میں جا پہنچی جہاں ایک طویل قانونی جنگ کے بعد وہ کامیاب ہوئیں اور مردوں کے مساوی استحقاق کی حامل قرار پائیں۔

ایک بہت اہم پہلو خواتین فضائی میزبانوں کے خاندانی اور سماجی معاملات کا بھی ہے۔ خواتین فضائی میزبانوں کی خانگی زندگی عام خواتین کے معاملے میں غیر فطری ہوتی ہے۔ اکثر خواتین فضائی میزبان سے شادی کرنے والے بھی خوش شکلی، مالی وسائل کی بہتر دستیابی کی بنا پر شادی کرتے ہیں۔ یہاں جب گھر بنایا جاتا ہے تو فریقین کے درمیان تضادات اُبھر آتے ہیں۔ شک کا عنصر بھی در آتا ہے اور حرص بھی حاوی آتی چلی جاتی ہے۔ خاتون فضائی میزبان کے معمولات بھی تنازعہ کا باعث بنتے ہیں۔ بعض معاملات میں ضرورت مند والدین اور دیگر افراد فضائی میزبانی کرنے اور جاری رکھنے کا شعوری عمل اس لیے رکھتے ہیں کہ ان کے لیے تعیشات اور وسائل کا بندوبست ہوتا رہے۔ اس کے باوجود فضائی میزبان حتی المقدور اپنی خانگی زندگی کو پرسکون رکھنے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے اپنا مشفق کردار جاری رکھتی ہیں اور ایک مکتبۂ فکر جو عورت کو مغلوب رکھنے اور محکوم رکھنے میں بہت پیش پیش رہتا ہے اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ خاتون فضائی میزبان کے ساتھ ہونے والی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں، ان میں طلاق کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ طلاق کا تناسب تو یوں بھی بہت بڑھ چکا ہے۔ میڈیا کا پھیلاؤ اس کی اثر پذیری، سرگرمیوں کا زیادہ تعلیم یافتہ ہونا اور عورت کے شعور کی بیداری اور انکار کی جرأت ہے۔

خواتین فضائی میزبان کے فرائضِ منصبی اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ لینے کے بعد

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ مختلف النوع قسم کی مزاحمتیں رہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے کے خیالات میں مذہب اور رسومات کا اس طرح کا اُلجھاؤ ہے جس نے عورت کی حسیت اور شخصیت کو انتہائی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ عورت بنیادی طور پر انسانی تاریخ کا ایک تخلیقی حوالہ ہے۔ یہ تربیت نگہداشت اور تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھتی ہے۔ پیدا ہونے والے بچے کو سب سے پہلا تاثر محبت کا ملتا ہے اور وہ سب سے پہلے آغوشِ مادر میں آتا ہے۔ عورت کا صرف یہی ایک کردار تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ بدقسمتی سے عورت کو محض جاذبیت کا ذریعہ سمجھنا ہمارے معاشرے میں عام بات ہے اور یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر فضائی میزبان اور اسی طرح سے دیگر ایسے شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کی ملازمتوں اور ان کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں پر مضحکہ خیز قسم کی رائے بنائی جاتی ہے۔ فضائی میزبان کے شعبے کو بعض کم علم افراد انتہائی سہل شعبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ شعبہ سیر وتفریح، سیر سپاٹے اور تعیّشات سے آلودہ ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اسی شعبے میں کام کرنے والی خواتین دن اور رات سے ماورا اپنی ذمے داریاں انتہائی مشقت اور دیانتداری سے انجام دیتی ہیں۔ پاکستان میں جہاں دیگر شعبوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے اور خاص طور پر خواتین کے وہاں امکانات کم سے کم کردیے جاتے ہیں فضائی میزبانی کے شعبے میں بھی خواتین کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

سہ ماہی 'تاریخ' لاہور غالباً پاکستان کا پہلا ادارہ ہے جس نے خاتون فضائی میزبان کے موضوع پر مجھ سے یہ مقالہ لکھنے کی خواہش کی۔ وقت کی تنگی بھی شامل تھی مگر اس معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں اس موضوع پر تاحال کوئی مواد میسر نہیں تھا۔

تلاشِ بسیار کے بعد جو کچھ میسر آسکا اور جو کچھ ذہن نے ساتھ دیا وہ مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پاکستان اسٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر جعفر احمد کی نہ صرف کوششوں کا اعتراف کرتی ہوں جو اہم موضوعات اور شخصیات پر پاکستان اسٹڈی سینٹر سے نادر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ اس ایک روزہ کانفرنس میں جو مضامین پڑھے گئے وہ سوچ کے نئے زاویوں کو وا کرتے ہیں۔ میں خود چوں کہ ایک شاعرہ ہوں اور چار شعری مجموعوں کی خالق ہوں جن سے ایک مجموعے 'دوہا جل' کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ پاک و

ہند میں کسی بھی شاعرہ کا دوہے پر پہلا مکمل مجموعہ کلام ہے۔

اگر اسے خودستائی کہا جائے تو میں یہ بھی کہنا چاہوں گی جب میں نے اپنی فضائی میزبان کی سخت ملازمت کے باوجود طویل منقطع تعلیمی سلسلے کے بعد اور اپنے پہلے مجموعہ کلام 'ہاتھوں میں چاند' کی تقریب اجرا کے بعد اپنے تعلیمی سلسلے کو دوبارہ جوڑا تو شاید اشتیاق و تحریک تھی کہ میں نے کراچی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور جب اس سے آگے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ڈاکٹر جعفر احمد سے بھی موضوعات کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر جعفر کی ایک تجویز تھی کہ پاکستان میں فضائی میزبانی پر کوئی ڈاکومنٹ نہیں ہے اس پر تحقیق کرنے کے لیے اُنہوں نے مجھے آمادہ کیا اور ابتدائی کام بھی اس حوالے سے ڈاکٹر جعفر نے کیا۔ کچھ میری اپنی مصروفیات اور کچھ ڈاکٹر صاحب کی کہ یہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ میری خواہش ہوگی کہ اس مضمون کے بعد اگر ڈاکٹر صاحب مناسب سمجھیں تو یہ کام دوبارہ شروع کیا جاسکتا ہے تاکہ اگلے کسی وقت میں کوئی فضائی میزبان اور مصنف اس شعبے پر تحقیق کرنا چاہے تو اس کو کوئی مکمل دستاویز کتابی صورت میں دستیاب ہوسکے اور جو تہی دامنی کا سامنا مجھے کرنا پڑا، آئندہ کسی اور طالب علم کو نہ ہو۔ شاید آپ لوگوں کو بھی اس مضمون میں تشنگی محسوس ہوئی ہو۔ میں شکر گزار ہوں کہ منتظمین نے مجھے اس اِخفا موضوع پر مضمون تحریر کرنے کی تحریک دی۔ آخر میں سہ ماہی 'تاریخ' کے ڈاکٹر مبارک علی اور جناح میڈیکل کالج کی انتظامیہ کا شکریہ۔

اینجیلا ڈے وِس کی آپ بیتی *

ترجمہ: سید سبطِ حسن

اینجیلا ڈیوس نئی نسل کی مشہور انقلابی رہنما ہے۔ وہ ۱۹۴۴ء میں ریاست الآباما کے شہر برمنگھم میں پیدا ہوئی۔ برنیڈس یونیورسٹی اور جرمنی میں فلسفے کی تعلیم پائی اور لاس اینجلز یونیورسٹی میں فلسفے کی اُستاد مقرر ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں اپنی انقلابی سرگرمیوں کے باعث گرفتار ہوئی مگر عالمی احتجاج سے دب کر امریکی حکومت نے اس کو سولہ ماہ بعد رہا کر دیا۔

نقلی بالوں کے گچھے سہمے ہوئے خرگوش کی طرح میرے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے۔ میں ہیلن کے ساتھ اکیلی تھی، پولیس سے روپوش اور اُس شخص کی موت سے مغموم ___ جس کو میں چاہتی تھی۔ دو ہی دن پہلے مجھ کو عدالت کے کمرے میں ہونے والے بلوے اور اپنی دوست جوناتھن جیکسن کی ہلاکت کی خبر ملی تھی۔ اس ہنگامے میں دو قیدی اور مارے گئے تھے مگر اُس دن سے پہلے تک میں نے اُن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ البتہ اُس شام مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اُن کو برسوں سے جانتی تھی۔

میں غسل خانے میں گھس گئی اور بالوں کو جو پلاسٹک کے فیتے میں پروئے ہوئے تھے سر پر جمانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر میرے خیالات کہیں اور تھے اور میرے ہاتھ یوں کانپ رہے تھے

* معروف ترقی پسند ادیب اور دانشور سیّد سبطِ حسن نے انجیلا ڈے وِس کی آپ بیتی کا ترجمہ اپنے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی جریدے 'پاکستانی ادب' کے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ اس یادگار آپ بیتی کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر اور امریکی معاشرے میں نسلی و صنفی امتیاز پر مبنی تاریخ سے نئی نسل کی آگاہی کی خاطر، 'تاریخ' کی اس خصوصی اشاعت میں اس کو شامل کیا جا رہا ہے۔

جیسے کسی پرند کے ٹوٹے ہوئے پنکھ۔ میں نے آئینہ دیکھا تو میرے چہرے پر اتنا تناؤ اور اتنی بے یقینی، اتنا تردد تھا کہ میں اپنی شکل نہ پہچان سکی۔ میری آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں اور کالے نقلی بالوں کے حلقے میرے جھریوں پڑے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن بھیس بدلنا ضروری تھا اور وہ بھی اس ہوشیاری سے کہ کسی کو شبہ نہ ہونے پائے کہ یہ عورت لاس اینجلز کی عام عورتوں سے مختلف ہے۔

میں نے ہیلن سے کہا تھا کہ ہم کو اندھیرا ہوتے ہی روانہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن دن تھا کہ رات کا دامن چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور اُس کے پلّو سے مسلسل چمٹا ہوا تھا۔ ہم خاموشی سے اندھیرے کا انتظار کرتے رہے۔ اور پردوں کی آڑ میں چھپے ہوئے سڑک کے شور کو کان لگا کر سنتے رہے۔ کسی موٹر کی رفتار دھیمی ہو جاتی یا فٹ پاتھ پر کسی راہ گیر کے قدموں کی آواز تیز ہو جاتی تو میرا سانس رُک جاتا۔

ہیلن چپ بیٹھی تھی۔ اُس نے موقع کی نزاکت پر خواہ مخواہ کی بکواس سے پردہ ڈالنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر تک نیم تاریک کمرے میں یوں ہی بیٹھے رہے۔ آخر ہیلن نے کہا اب اس سے زیادہ اندھیرا نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہم کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ جب سے پولیس نے میرا پیچھا شروع کیا تھا میں پہلی بار گھر سے باہر نکل رہی تھی۔ اور میرے غم و غصے میں خوف بھی شامل تھا۔ بالکل ویسا ہی خوف جیسا میں بچپن میں اندھیرے کی تنہائی میں محسوس کیا کرتی تھی۔ وہ بھیانک بھوت جو مجھے چھوتا نہ تھا مگر جو ہر وقت میری پیٹھ کے پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ میرے ماں باپ جب پوچھتے کہ تمھیں کس چیز سے ڈر لگتا ہے تو میں کچھ نہ بتا پاتی۔ لیکن اُس وقت تو ہر قدم کے ساتھ کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا اور میں اُس کا حلیہ آسانی سے بیان کر سکتی تھی۔

لاس اینجلز کے جس نیگرو علاقے سے ہم گذر رہے تھے وہ میرا جانا پہچانا تھا۔ میں وہاں کئی بار جا چکی تھی۔ مگر اُس رات مجھے ہر چیز اجنبی اور نامانوس دکھائی دیتی تھی اور ہر سمت خوف کے ڈراونے سائے چھپے نظر آتے تھے۔ لیکن میں نے عہد کر لیا تھا کہ مجھے ان تمام خطرات کا جو کچھ تو خیالی تھے اور کچھ حقیقی نہایت جرأت اور خود اعتمادی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

وہ حالات جن کے باعث میں ایک مفرور کی زندگی گذارنے پر مجبور کی گئی تھی پیچیدہ تو تھے لیکن دوسروں سے مختلف نہ تھے۔ دو سال پہلے چندہ جمع کرنے کی خاطر لاس اینجلز میں ایک کاک ٹیل

پارٹی ہوئی تھی۔ پارٹی کے بعد پولیس نے ہمارے ایک دوست فرینکلن الیگزانڈر اور اُن کی بیوی کنیڈرا کے گھر پر چھاپا مارا تھا۔ اور وہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان کی تلاشی میں جو رقمیں اور ریوالور ملے سب ضبط کر لیے تھے اور سب کو مسلح ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ جب پولیس کو پتہ چلا کہ ایک ریوالور میرے نام پر رجسٹر ہے تو انہوں نے مجھے بھی پوچھ گچھ کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر عدالت میں جرم ثابت نہیں ہوا اور سب لوگ چند راتیں جیل میں گذار کر رہا ہو گئے اور ہمارے ریوالور بھی واپس مل گئے۔ لیکن میرا ہی ریوالور عدالت کے کمرے میں جو بلوہ ہوا تھا اُس میں استعمال کیا گیا تھا اور پولیس کے قبضے میں تھا۔ اس بلوے میں عدالت کا جج مارا گیا تھا اور وکیل سرکار زخمی ہوا تھا۔ لہٰذا مجھے معلوم تھا کہ ریوالور پر قبضہ کرنے کے بعد پولیس ضرور مجھے گرفتار کرے گی۔ یوں بھی پولیس میری برابر نگرانی کر رہی تھی اس لیے کہ سولیداد جیل میں محبوس چند نیگرو قیدیوں پر قتل کا جو جھوٹا مقدمہ چل رہا تھا اور اُن کو آزاد کرانے کی جو عوامی تحریک اُٹھی تھی میں اپنا سارا وقت اس میں صرف کر رہی تھی۔ چنانچہ اسی جرم کی پاداش میں کیلیفورنیا کے گورنر رونلڈ ریگن نے مجھے کیلیفورنیا یونیورسٹی کے فلسفہ کے شعبہ سے برطرف کر دیا تھا۔

ہمارا ایک رفیق ڈیوڈ شکاگو میں رہتا تھا میں بہت دن سے اس سے نہیں ملی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میری مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھے گا۔ لہٰذا میں ہیلن کے ہمراہ پہلے تو لاس اینجلز کی نیگرو بستی میں تحریک کے ایک ہمدرد جانؔ کے گھر گئی اور دو، تین روز وہاں پناہ لینے کے بعد موٹر کے ذریعے شکاگو روانہ ہو گئی۔ میں تنہا ہونا چاہتی تھی لیکن جانؔ نے اصرار کیا اور اپنی بیوی ہیٹی کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم نے تقریباً ایک ہزار میل کا یہ سفر بڑی احتیاط سے لیکن بلا کسی حادثے کے طے کر لیا۔ گاڑی چلاتے چلاتے میں جب بھی خبروں کے لیے ریڈیو کھولتی تو یہ اعلان ضرور سنائی دیتا کہ 'اینجیلا ڈیوس نامی ایک خطرناک مجرم مفرور ہے اور پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔' رات کے وقت جب ہم کسی چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرتے اور ٹی۔ وی۔ چلاتے تو وہاں بھی اسی قسم کی خبریں سننے میں آتیں۔

ہیٹی کی وجہ سے مجھے بڑا سہارا تھا کیونکہ وہ بڑی ہنس مکھ اور زندہ دل عورت ہے۔ مگر جب ہم رخصتی کے وقت گلے مل رہے تھے تو میں اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ کیونکہ ایک ایسے شخص کا شکریہ ادا کرنا جس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر میری جان بچانے کی کوشش کی تھی کوئی معنی نہیں

رکھتا تھا۔

کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ شکاگو میں زیادہ دن تک پناہ لینا ناممکن ہو گیا اور ایک رات جب کہ بارش موسلا دھار برس رہی تھی ڈیوڈ مجھے ساتھ لے کر فلوریڈا روانہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کا سفر بے حد خطرناک تھا اس لیے کہ ہر ائیر پورٹ پر پولیس کے آدمی چوبیس گھنٹے نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارا منصوبہ تھا کہ شکاگو سے نیویارک تک موٹر میں جائیں گے اور وہاں سے میامی تک ٹرین میں۔ راستے میں ایک جگہ ہم نے ایک ہوٹل میں ٹی۔ وی۔ کھولا تو اعلان ہو رہا تھا کہ 'اینجیلا ڈیوس جس پر قتل، اغوا اور سازش کا الزام ہے آج برمنگھم میں اپنے والدین کے گھر سے نکلتی ہوئی دیکھی گئی۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ Black Panther Party کے ایک جلسے میں شریک ہونے گئی تھی۔ برمنگھم کی پولیس نے اس کا بہت پیچھا کیا لیکن وہ جُل دے گئی۔ وہ نیلے رنگ کی ایک کار چلا رہی تھی'۔ یہ خبر سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ کیا پولیس نے میری بہن کا پیچھا کیا تھا۔ مگر وہ تو کیوبا گئی ہوئی تھی رہی میری کار سو وہ تو ہفتوں سے فرینکلین کے فلیٹ کے سامنے لاس اینجلز میں کھڑی ہے۔ مجھے اپنے والدین کا خیال آیا کہ پولیس اُن بیچاروں کو خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہو گی۔ میں انہیں ٹیلیفون بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ ٹیلیفون لائن ٹیپ ہو رہی ہے۔

راستے میں ایک جگہ میں نے عینک خریدی اور ایک دو جوڑے کپڑے بھی کیونکہ لاس اینجلز سے چلتے وقت میرے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ اور میں پچھلے تقریباً ایک ہفتے سے ایک ہی پوشاک پہنے ہوئے تھی۔ نیویارک ہم خیریت سے پہنچ گئے اور دو، تین دن کے بعد ٹرین سے میامی کے لیے روانہ ہو گئے۔ مگر روپوشی کی یہ زندگی مجھ پر اب گراں گذرنے لگی تھی۔ ساری دنیا سے کٹ کر اپنی ذات کے خول میں پناہ لینا ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا اور مجھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ جیل میں ہوتی تو کم از کم اپنے ساتھیوں کے حالات تو پتہ چلتے رہتے۔ اور باہر کی تحریک سے رابطہ رہتا۔ ایک بار یہ بھی سوچا کہ ملک سے باہر چلی جاؤں لیکن ضمیر نے اس کی اجازت نہ دی۔ البتہ یہ فیصلہ ضرور کیا کہ کسی طرح پولیس کو یقین ہو جائے کہ میں اب امریکہ میں نہیں ہوں۔ چنانچہ میامی میں میں نے پریس کے لیے ایک بیان تیار کیا جس میں اُن بے انصافیوں اور سختیوں کا ذکر تھا جو جواں مرگ جوناتھن کو جیل میں برداشت کرنی پڑی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ عدالتی کمرے کے بلوانے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نہ وہاں موجود تھی اور نہ مجھے پہلے سے اس کا کوئی علم تھا۔

آخر میں نے اشاروں اشاروں میں یہ جتا دیا تھا کہ اب میں ملک کے باہر ہوں اور یہ وعدہ کیا تھا کہ کیلیفورنیا کی سیاسی فضا جب بہتر ہو جائے گی تو میں واپس آ کر عدالت کے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کروں گی۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ہم نیویارک واپس آ گئے۔ میری روپوشی کو اب تقریباً دو مہینے ہو چکے تھے۔ ہماری پونجی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہمارا ہر جاننے والا پولیس کی نگرانی میں تھا۔ آخر ایک دن ہوٹل کی گھٹن سے تنگ آ کر ہم دونوں نیویارک کی پرہجوم سڑکوں پر گھومنے نکل پڑے۔ سہ پہر کا وقت ہم نے ایک سینما گھر میں گذارا لیکن مجھے بالکل یاد نہیں کہ ہم نے کون سی فلم دیکھی۔ میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال تھا اور وہ تھا پولیس سے بچنے کا اور میں برابر یہی سوچتی رہی کہ یہ تنہائی میں کب تک برداشت کر سکوں گی۔

فلم تقریباً چھ بجے ختم ہوئی اور ڈیوڈ اور میں ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہوا کہ پولیس کے آدمی ہمارا تعاقب کر رہے ہیں لیکن جب کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو میں مطمئن ہو گئی۔ مگر ہوٹل کے دروازے پر میں پھر اسی وہم میں مبتلا ہو گئی اور گوری کھال کا ہر مرد مجھے پولیس کا آدمی نظر آنے لگا۔ ایک بار تو میں نے سوچا کہ بھاگ کر راہ گیروں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں لیکن پھر مجھے یاد آ گیا کہ ہمارے ساتھی بوبی ہٹن کو پولیس والوں نے پیٹھ پر گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ میں یوں آسانی سے مرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

مگر ہوٹل کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے یقین آ گیا کہ میرا اندیشہ درست تھا۔ ہال میں درجنوں گورے امریکی ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اب میں گرفتاری کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار تھی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ مگر ہم لفٹ میں سوار ہونے لگے۔ تو ایک گورا امریکی ہمارے ساتھ لفٹ میں داخل ہو گیا۔ میرے ذہن میں پھر گرفتاری کے اندیشے اُبھرنے لگے اور ساتویں منزل تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ لفٹ سے اُتر کر ڈیوڈ تو کمرہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا اور میں عادتاً پیچھے رہ گئی۔ اتنے میں ہمارے کمرے کے سامنے والا دروازہ کھلا اور چھوٹے قد کا ایک آدمی باہر جھانکنے لگا۔ لفٹ والا امریکی بھی اب میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور جونہی میں اپنے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مڑی چھوٹے قد والے امریکی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور پھر درجنوں پولیس والے اِدھر اُدھر کے کمروں سے نکل آئے اور اُنہوں نے مجھے گھیر لیا۔ 'اینجیلا ڈیوس؟۔ کیا تم اینجیلا ڈیوس

ہوٗاور سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

میرے اور ڈیوڈ دونوں میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہ تھے۔لیکن پولیس کا ہر سپاہی ریوالور ہاتھ میں لیے موقعہ کا منتظر تھا۔وہ بار بار مجھ سے یہی پوچھ رہے تھے کہ کیا تم اینجیلا ڈیوس ہو، کیا تم اینجیلا ڈیوس ہو۔مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تب انہوں نے میری انگلیوں کا نشان لیا اور جب یقین ہوگیا کہ میں اینجیلا ڈیوس ہوں تو انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے ہتھکڑیاں لگادیں۔

موٹر میں انہوں نے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور ہمارا کارواں جس میں درجنوں موٹریں شامل تھیں، روانہ ہوگیا۔راستے میں ایک پولیس والے نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا مس ڈیوس آپ سگریٹ پیئں گی۔'نہیں تمہارے ہاتھ سے نہیں' گرفتاری کے بعد میرے منہ سے یہ پہلا فقرہ نکلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑی اینٹوں کی ایک پرانی عمارت کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔یہ نیویارک کی زنانہ حوالات تھی۔جن دنوں میں ایلزبتھ ہائی اسکول میں پڑھتی تھی تو قریب قریب روزانہ اسی پراسرار عمارت کے سامنے سے گذرنا ہوتا تھا اس لیے کہ ہمارا اسکول قریب ہی تھا۔اس حوالات میں مجھے ایک بھی گوری چمڑی کی عورت نظر نہیں آئی۔بس کالی نیگرو عورتیں تھیں یا پورٹو ریکو کی رہنے والیاں۔سیکنڈری اسکول میں داخلے سے پہلے میں نے کئی مہینے مارگریٹ برنہم Margarette Burnham کے گھر والوں کے ساتھ نیویارک میں گذارے تھے۔برمنگھم شہر کے مقابلے میں نیویارک جنت سے کم نہ تھا۔مارگریٹ اُس کی بڑی بہن کلاڈیا اور اُن کے دوست جو کالے بھی تھے اور گورے بھی مجھے ساتھ لیے بڑی آزادی سے گھومتے پھرتے۔چڑیا گھر، پارک، سمندر کا ساحل، سینما ہاؤس، ریسٹورنٹ، غرضیکہ کہیں بھی کوئی ممانعت نہیں تھی۔میں اپنی ایلزبتھ کے ساتھ جب بس میں سفر کرتی تو ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر جا کر بیٹھ جاتی اور کوئی مجھے نہ اُٹھاتا۔

نیویارک کے قیام کی وجہ سے نسل و رنگ کے فرق کا احساس مجھے میں اور شدید ہوگیا۔میں برمنگھم واپس آئی تو ایک دن اپنی چچازاد بہن اسنو کی مجھے بس میں لے گئی۔وہ تو پچھلی سیٹ پر جابیٹھی لیکن میں بھاگ کر ڈرائیور کے پاس کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔اِسنوکی ہنس ہنس کر مجھے وہاں سے

اُٹھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں نہ مانی۔ البتہ جب اُس نے مجھے ڈانٹا تو مجھے اُٹھنا پڑا۔ مگر اُٹھتے اُٹھتے میں نے اُونچی آواز میں اُس سے پوچھا کہ تم مجھے یہاں کیوں نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اسنوکی سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ اور آس پاس بیٹھے ہوئے گورے مسافر اسنوکی کی گھبراہٹ پر مسکرا رہے تھے۔

میرے باپ کے پیٹرول پمپ کے پاس ہی ایک سینما ہاؤس تھا جو دن رات نیون لائٹ کی روشنی سے جگمگاتا رہتا۔ سنیچر اور اتوار کو اُس میں بچوں کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ہم اُدھر سے گذرتے تو سنہرے بالوں والے بچوں اور اُن کی ماؤں کو بڑی للچائی نظروں سے دیکھتے لیکن کالے بچوں کو اِس سینما گھر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور میں اکثر سوچتی کہ کاش ہم نیویارک میں رہتے ہوتے۔ جب بھی ہم برمنگھم کے تفریحی پارک 'پری میدان' کے سامنے سے گذرتے جہاں صرف گورے بچے جا سکتے تھے تو مجھے نیویارک کے تفریحی پارک یاد آنے لگتے۔ برمنگھم میں ہمیں اگر بھوک لگتی تو کالوں کی بستی کے کسی ریسٹوران میں جانا پڑتا۔ کیونکہ عام ریسٹورنٹوں میں فقط گوری چمڑی کے لوگ داخل ہو سکتے تھے۔ برمنگھم میں تو پانی کے ایک گلاس کے لیے یا میونسپلٹی کے پیشاب گھر کے لیے بھی ہمیں وہ سائن بورڈ تلاش کرنا پڑتا جس پر 'کالوں کے لیے' لکھا ہوتا۔ میری نسل کے کالے بچوں نے عام لفظوں سے پہلے 'کالا' اور 'گورا' پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

لیکن نیویارک کی خیالی جنت کی اصل حقیقت بھی مجھ پر جلد ہی روشن ہوگئی۔ چھ سال اور دس سال کی عمر میں مجھے کئی بار نیویارک جانا پڑا جہاں میری ماں نیویارک یونیورسٹی سے ایم۔اے کر رہی تھی۔ میری ماں کے دوستوں میں ایک جوڑا تھا جس کے پاس رہنے کے لیے معقول جگہ نہ تھی۔ وہ ہفتوں کوشش کرتے رہے کہ کوئی صاف ستھرا فلیٹ مل جائے لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک روز یہ لوگ میری ماں سے گفتگو کر رہے تھے۔ تو میں نے اُن کی باتیں سن لیں اور تب پتہ چلا کہ مسئلہ وہی کالی اور سفید کھال کا تھا۔ ایک حادثہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز جو اِن دنوں پیش آیا جب میں آٹھ برس کی تھی اور سینٹر میکارتھی کی کمیونسٹ دشمنی اپنے عروج پر ہی تھی۔ میرے والدین کے ایک دوست جیمس جیکسن تھے۔ وہ اور اُن کے بیوی بچے برمنگھم میں رہ چکے تھے۔ جیکسن کمیونسٹ تھے لہٰذا اُن دنوں روپوش تھے۔ مجھ میں سیاسی باتوں کی تو سمجھ نہ تھی البتہ اتنا جانتی تھی کہ پولیس میری دوست ہیریٹ کے باپ کی تلاش میں ہے۔ میں جب بھی جیکسن کے بچوں

کے ساتھ کھیلتی تو وہ انگلیوں کے اشارے سے بتاتے کہ دیکھو وہ پولیس کے جاسوس کھڑے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ میرے باپ کے دوست کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُنہوں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ بس یہی نا کہ اُن کا رنگ کالا تھا۔ اُس وقت تک میں یہ نہیں جانتی تھی کہ کمیونسٹ کیا ہوتا ہے اور میکارتھی کیا چاہتا ہے۔

برسوں بعد جب میں چودہ، پندرہ برس کی ہوئی تو ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ میں اور فاؔنیا برمنگھم کے سفید علاقے سے گذر رہے تھے تو میں نے فاؔنیا سے کہا کہ آؤ ان گوروں کو غیر ملکی افریقی بن کر ستائیں۔ لہٰذا ہم دونوں فرانسیسی زبان بولتے ہوئے جوتوں کی ایک بڑی اعلیٰ دکان میں گھس گئے۔ دو کالی لڑکیوں کو غیر ملکی زبان بولتے سن کر دکان کے ملازمین ہماری طرف لپکے۔ اور ہم کو اسٹور کے پچھلے حصے میں لے جانے کے بجائے جہاں ایک کالا ملازم چھپ کر بیٹھتا اور کالوں کو جوتے پہناتا تھا بالکل سامنے کی اچھی سیٹوں پر بٹھایا۔ میں نے یوں ظاہر کیا گویا مجھ کو انگریزی بالکل نہیں آتی۔ اور فاؔنیا بھی بن بن کر اتنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگی کہ گوروں کے لیے اُس کی بات سمجھنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے ملازمین غیر ملکی کالی لڑکیوں کو دیکھ کر آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ لیکن زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے بے بس تھے۔ لہٰذا انہوں نے مینیجر سے مدد مانگی۔ مینیجر صاحب اپنے بند دفتر سے نکلے دو غیر ملکی جوان لڑکیوں کو دیکھ کر اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ آتے ہی انہوں نے بڑے رومانوی لہجے میں کہا۔ ’خوبصورت خواتین! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔‘ مگر وہ ہمیں دیکھ کر کچھ ایسا مسحور ہوئے تھے کہ جوتوں کا ذکر چھوڑ کر ہمارے بارے میں پوچھنے لگے۔ ’آپ کس ملک کی رہنے والی ہیں۔ اور یہاں برمنگھم جیسے شہر میں کیسے آنا ہوا۔ آپ جیسے لوگوں کی تو شاز و نادر ہی زیارت ہوتی ہے۔‘ فاؔنیا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مینیجر کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہم لوگ افریقہ کے شہر مارتی نک سے آئے ہیں اور امریکہ کی سیاحت کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ مینیجر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ’زہے نصیب‘ اُس نے عاشقانہ انداز میں کہا۔ دکان میں بیٹھے ہوئے دوسرے گورے اِس بات پر حیرت کر رہے تھے کہ یہ کالی عورتیں اُس جگہ بیٹھی ہیں جو گوروں کے لیے مخصوص ہے لیکن جب اُنہوں نے ہمیں فرانسیسی بولتے سنا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے کہ دو کالی عورتیں ہزاروں میل دور سے ہمارے شہر میں آئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان غیر ملکی کالوں سے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

آخرکار، میں نے فاآنیا کو اشارہ کیا کہ بس اب مذاق ختم۔تب ہم نے مینیجر کی طرف غور سے دیکھا اور زور زور سے ہنسنے لگے۔وہ بھی ہنسنے لگا لیکن ذرا ہچکچا ہچکچا کر جیسے وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میرا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔

'کیا بات ہے۔آپ ہنس کیوں رہی ہیں۔'اُس نے آہستہ سے کہا۔تب میں انگریزی بولنے لگی۔'ہمیں تم پر ہنسی آ رہی ہے۔'میں نے کہا۔'کالے امریکی اگر کسی صورت سے تم لوگوں کو یہ باور کروا دیں کہ وہ پردیسی ہیں تو تم اُن کو VIP سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھاؤ گے۔'ہم ہنستے ہوئے دکان سے باہر آ گئے۔

ہمارا گھر ایک پہاڑی پر تھا۔یہ جگہ نیگرو بستی سے زیادہ دور نہیں تھی۔مکان اگرچہ پرانا تھا لیکن اس کا احاطہ بہت بڑا تھا۔اور درخت بھی بے شمار تھے۔سامنے پکی سڑک تھی اور سڑک کے اُس پار گوری چمڑی والوں کی آبادی__ میں ابھی چار برس کی تھی کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ سڑک کے اُس پار رہنے والے ہم سے بہت مختلف ہیں۔اس احساس کی وجہ اُن کی کھال کا رنگ نہ تھا۔بلکہ اُن کے چڑھے ہوئے تیور تھے۔وہ دور کھڑے ہم کو بڑی نفرت سے گھورتے رہتے۔ہم سے کبھی بات نہ کرتے اور اگر ہم سلام کرتے تو ہمارے سلام کا جواب تک نہ دیتے تھے۔ہمارے اِس گھر میں منتقل ہونے کے فوراً ہی بعد انہوں نے ہمیں جتا دیا کہ سڑک ہماری سرحد ہے۔سڑک کے اس پار ہی رہنے میں ہماری عافیت ہے لہٰذا ہمیں کبھی بھولے سے بھی اُن کے علاقے میں نہ جانا چاہیے۔

نفرت سے پچاس گز کے فاصلے پر ہماری زندگی معمول کے مطابق گذرتی رہی۔میری ماں ایک مقامی نیگرو اسکول میں پڑھاتی تھی۔اور چھٹی پر تھی۔اُن کے بچہ ہونے والا تھا۔میرا بھائی بنی Benny مجھ سے چھوٹا تھا۔میرے باپ نے بڑی غربت میں بی۔اے کیا تھا اور پارکر ہائی اسکول میں تاریخ پڑھاتے تھے۔اُن کی تنخواہ بہت کم تھی پھر بھی میاں بیوی نے نہ جانے کس طرح پیٹ کاٹ کر یہ گھر قسطوں پر لیا تھا اور ایک پیٹرول پمپ بھی خریدا تھا۔وہ روز صبح کام پر جاتے ہوئے مجھے اپنی نارنجی رنگ کی وین میں اسکول چھوڑ دیتے تھے۔اسی اثناء میں میری چھوٹی بہن فاآنیا پیدا ہوئی۔کچھ عرصے کے بعد ہمارے اکثر گورے پڑوسیوں نے اپنے مکان کالوں کے ہاتھ بیچ دیے اور خود دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔

بہار کی ایک شام تھی۔میں غسل خانے میں اپنے سفید جوتے دھو رہی تھی کہ ایک دم سے

زبردست دھماکہ ہوا اور سارا گھر ہلنے لگا۔ دوا کی بوتلیں فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئیں۔ اور میں ڈر کے مارے کانپتی ہوئی باورچی خانے میں ماں سے لپٹ گئی۔ آس پاس کے نیگرو جوانوں کا ہجوم جمع ہوگیا اور وہ لوگ رات گئے تک زور زور سے بولتے رہے اور گوری چمڑی، کالی چمڑی، موت اور خون خرابے کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد بم کے دھماکے معمول بن گئے۔ اس کے باوجود میری ماں مجھے ہمیشہ یہی سمجھاتی رہی کہ کالے اور گورے کی لڑائی قدرتی بات نہیں ہے۔ خدا نے ہم کو محبت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور گوروں کی نفرت چند دنوں کی بات ہے۔ میری ماں خاص طور پر مجھے ہمیشہ یہی تعلیم دیتی کہ کسی کو اُس کی کھال کے رنگ کی وجہ سے اچھا یا بُرا نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر چند کہ وہ الاباما کے دیہات میں پلی بڑھی تھی لیکن کالج کے دنوں میں وہ طالب علم کی حیثیت سے ایسی تحریکوں میں شریک ہو چکی تھی جو نسل اور رنگ کے خلاف چلائی جاتی تھیں۔ اور جن میں کالوں کے علاوہ کچھ گورے بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے ذاتی تجربے سے اُس کو یقین ہوگیا تھا کہ گوری چمڑی والے اگر کوشش کریں تو وہ اپنی کھال سے الگ ہو کر سوچ سکتے ہیں اور انسان کو انسان سمجھ سکتے ہیں۔ وہ برابر یہی کوشش کرتی رہی کہ مجھ میں انسانوں سے نفرت نہ پیدا ہونے پائے۔

میں بارہ برس کی تھی کہ دادی کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی اپنی زمین تھی اور کبھی کبھی ہم لوگ چھٹیاں گذارنے اُن کے گھر جایا کرتے تھے۔ جب وہ بہت بوڑھی ہوگئیں تو ہمارے ساتھ آ کر رہنے لگیں۔ البتہ کبھی کبھار اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے ملنے کیلیفورنیا چلی جاتی تھیں۔ جہاں بہت سے نیگرو گھرانے جنوب کی نیگرو دشمنی سے تنگ آ کر منتقل ہوگئے تھے۔ دادی ہمیں غلامی کے دنوں کے قصے بہت شوق سے سنایا کرتی تھیں۔ وہ اعلانِ آزادی ۱۸۶۲ء کے چند ہی سال بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اور اُن کے والدین غلام تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہم لوگ اس چیز کو بھول جائیں۔

جن دنوں میں ہائی اسکول میں تھی تو ریاست الاباما کے نیگروؤں میں بھی شہری حقوق کی تحریک آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی تھی۔ مگر غفلت کی نیند اتنی گہری تھی کہ ہم میں سے کسی کو یہ بھی خبر نہیں ہوئی کہ ۴ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو شہر منٹگمری میں روزا پارک نامی ایک نیگرو لڑکی نے بس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور مارٹن لوتھر کنگ بسوں کے مکمل بائیکاٹ کی تحریک چلا رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹگمری ہمارے شہر سے فقط سو میل دور تھا۔

کچھ عرصے کے بعد بسوں کے بائیکاٹ کی تحریک الاباما میں بھی شروع ہوئی مگر منظم نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی دب گئی۔ انتہا پسند گوروں نے پادری شٹل ورتھ کا گھر بموں سے اُڑا دیا لیکن وہ ایک پڑوسی کو ہسپتال لے گئے اس لیے بچ گئے تھے۔ اسی اثناء میں 'کالوں کی ترقی کی قومی انجمن (NAACP) ہماری ریاست میں خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی اور سینکڑوں نیگرو گرفتار کر لیے گئے۔

ایک روز میں اپنے دوستوں کے ساتھ سینما دیکھ کر لوٹ رہی تھی۔ میر سہیلی پیگی بھی موٹر میں تھی۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ بال سنہری تھے اور آنکھیں سبز۔ چنانچہ اکثر ناواقف لوگ اُس کو گورا ہی سمجھتے تھے۔ میں گھر کے سامنے پہنچ کر موٹر سے اُترنے ہی والی تھی کہ ایک گورے سپاہی نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اور پوچھنے لگا کہ تم نیگرو ایک گوری لڑکی کو کہاں لے جارہے ہو۔ اُس نے ہم سب کو موٹر سے اُترنے کا حکم دیا اور پیگی کے علاوہ سب کی تلاشی لینے لگا۔ اُس وقت تک ریاست الاباما میں کالوں اور گوروں کو آپس میں ملنے کی اجازت نہ تھی۔ سپاہی نے ہم سب کو جیل میں بند کردینے کی دھمکی دی اور پیگی کو بھی نیگروں سے دوستی کرنے پر خوب بُرا بھلا کہا۔

جب پیگی نے سپاہی کو بتایا کہ میں بھی نیگرو ہوں تو وہ بہت سٹپٹایا اور اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے لڑکوں کی پہلے پٹائی کی پھر موٹر کی خوب تلاشی لی تاکہ کوئی چیز ایسی مل جائے کہ اُس کو ہمیں جیل بھیجنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔ اس قسم کے واقعات کالوں کی زندگی کا معمول بن چکے تھے۔

میں چودہ برس کی ہوئی تو برمنگھم کی قصباتی زندگی کی سخت گیریاں میرے لیے ناقابل برداشت ہوگئیں۔ میں اپنی ناآسودگیوں کا اصل سبب سمجھنے سے قاصر تھی۔ شہری حقوق کی تحریک کا بھی اُس وقت تک مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا کہ میں اپنی بے چینوں کو کسی اُصول کی شکل دے سکتی۔ مجھے تو بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا دم گھٹا جا رہا ہے لہٰذا مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ درمیانہ طبقے کے نیگرو گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی نسلی تذلیل کو چھپانے کی خاطر ناچ، گانے، سینما اور دوسرے بے ضرر مشغلوں میں پناہ لیتے تھے مگر مجھ کو ان چیزوں سے سخت نفرت تھی۔

میرے والدین نے خوشی خوشی مجھے نیویارک جانے کی اجازت دے دی اور میرا داخلہ ایلز بتھ اروِن ہائی اسکول میں ہوگیا۔

نیویارک روانہ ہونے کے لیے ٹرین کے 'کالے' کمپارٹمنٹ میں بیٹھی تو ڈبہ نیگرو لڑکوں اور

لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جو مختلف کالے اسکولوں اور کالجوں میں داخلے کے لیے جا رہے تھے۔ مگر یہ لوگ راستے میں اُترتے گئے اور واشنگٹن پہنچتے پہنچتے ڈبہ بالکل خالی ہو گیا۔ واشنگٹن میں گورے مسافروں کی یلغار شروع ہوئی۔ لیکن اُنھوں نے میری طرف توجہ نہیں کی اور نہ اس بات کی پرواہ کی کہ کمپارٹمنٹ کالوں کا تھا۔ جوں جوں نیویارک قریب آتا گیا میرا اعصابی تناؤ بڑھتا گیا۔ میں کچھ یہ سوچ کر خوش ہوتی کہ نیویارک میں کالے گورے کے ہر وقت کے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی مگر دوسرے ہی لمحے یہ خوف ستانے لگتا کہ اگر میں اُس بدگمانی پر قابو نہ پا سکی جو نسلی نفرتوں میں پرورش پانے کے سبب سے روشن خیال گوروں کے خلاف پیدا ہو جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا۔

پادری میلش اور اُن کی بیوی نیویارک کے ریلوے اسٹیشن پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ گورے تھے لیکن میکارتھی کے زمانے میں اپنی نیگرو دوستی کے کارن بڑی سختیاں جھیل چکے تھے۔ پادری میلش گرجا گھر میں میکارتھی کے طرزِ عمل پر کڑی نکتہ چینی کرتے اور برملا کہتے کہ سچا عیسائی وہ ہے جو ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف صف آرا ہو جائے وہ 'سویٹ امریکہ دوستی' کی انجمن کے رُکن بھی تھے اور کمیونسٹوں اور دوسرے مظلوموں میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ان جرائم کی پاداش میں پادریوں نے اُن پر مقدمہ چلایا اور گرجا گھر اُن سے چھین لیا جہاں وہ برسوں سے وعظ کہا کرتے تھے۔ لیکن پادری میلش نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے ایلزبتھ ارون ہائی اسکول کے نام سے نیویارک میں ایک اسکول قائم کر لیا۔

پادری میلش اور ان کی بیوی نے مجھے اپنی اولاد کی طرح رکھا۔ البتہ مجھے اسکول کے نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں تھوڑا وقت لگا۔ اس لیے کہ ایلزبتھ ہائی اسکول میں وہ تکلفات نہ تھے جس کی میں عادی تھی۔ استاد پھٹے پرانے کپڑوں میں آتے۔ اور طالب علموں سے برابر کے دوستوں کی طرح ملتے۔

اسی اسکول میں میں نے پہلی بار سوشلزم کا نام سنا۔ تاریخ کے استاد نے جب سوشلزم کے ابتدائی اُصول بیان کیے تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی ایسا معاشرہ بھی ہوگا جس میں ہر شخص کو اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق سوسائٹی کی خدمت کا موقع ملے گا۔ اور سوسائٹی اُس کی مادی اور روحانی ضرورتیں پوری کرنے کی ذمے دار ہوگی۔ سائنسی سوشلزم کی باریکیاں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ البتہ ان تجربوں کا مجھ پر بہت اثر ہوا جو خیالی سوشلسٹوں نے

برطانیہ اور امریکہ میں کیے تھے۔ اِن تجربوں کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے میں نے لائبریری سے رابرٹ اونز(Robert Owens) اور دوسرے سوشلسٹ رہنماؤں کے سوشلسٹ تجربوں کے بارے میں کئی کتابیں حاصل کیں اور بڑے شوق سے پڑھیں۔

اسی اثناء میں میں نے کمیونسٹ مینی فیسٹو کا بھی بغور مطالعہ کیا اور تب مجھ کو کئی ایسے سوالوں کے جواب ہاتھ آ گئے جو مجھے عرصے سے پریشان کر رہے تھے۔ نیگرو مسائل کا کوئی واضح حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مینی فیسٹو کو کئی بار پڑھنے کے بعد میں کالے امریکیوں کے مسئلے کا رشتہ امریکہ کے عام محنت کاروں کے مسئلے سے جوڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ مجھے مینی فیسٹو کے ایک ٹکڑے نے جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ پرولیتاریہ تمام مظلوم لوگوں کا نجات دہندہ ہے بہت متاثر کیا 'اب تک تمام تاریخی تحریکیں اقلیتوں کی تحریکیں رہی ہیں یا وہ اقلیتوں کے مفاد میں تھیں۔ پرولیتاری تحریک غالب اکثریت کی آزادی اور باشعور تحریک ہے اور اکثریت کے فائدے میں ہے۔ پرولیتاریہ جو ہماری موجودہ سوسائٹی کا سب سے نچلا طبقہ ہے اُس وقت تک نہ حرکت میں آ سکتا ہے اور نہ سربلند ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ سرکاری معاشرے کے بالائی ڈھانچہ کو تہہ و بالا نہ کر دے۔' یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ اگر پرولیتاریہ کو آزادی حاصل ہوگئی تو پھر معاشرے کے دوسرے مظلوم حلقوں کی آزادی بھی یقینی ہو جائے گی۔ میری نظر میں برمنگھم کے اُن نیگرو مزدوروں کی شکلیں گھومنے لگیں جو ہر صبح لوہے کے کارخانوں یا کوئلے کی کانوں کی سمت قطار در قطار چلے جاتے ہیں۔ اور نفرت سے بوجھل آنکھیں، بموں کے دھماکے، چھپی ہوئی بندوقیں، خوف کے مہیب سائے، روتی ہوئی نیگرو عورتیں، بھوکے بچے، نسلی بلوے، درمیانہ طبقے کے نیگرو گھرانوں کے تفریحی مشغلے، بس کی آخری سیٹیں، پولیس کی تلاشیاں سب کی اصل حقیقت میری سمجھ میں آنے لگی۔ اب تک میں نسلی نفرتوں کو ذاتی مسئلہ خیال کرتی تھی اور میں کالوں کی اطاعت گذاریوں پر اندر ہی اندر کھولتی رہتی تھی، سوشلسٹ لٹریچر کے مطالعے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ ان نفرتوں کا تعلق سرمایہ داری نظام کے سود و زیاں سے ہے۔

اتفاق سے اُنہیں دنوں میری ملاقات کئی کمیونسٹ گھرانوں سے ہوئی اور (Bettina Aptheker) جو مشہور کمیونسٹ مؤرخ (Herbert Apthekr) کی بیٹی تھی میری دوست بن گئی۔

امریکہ میں کروڑ پتیوں کی ایک فرم وول ورتھ (Wool Worth) ہے۔ وول ورتھ کے جنرل اسٹور امریکہ کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں درجنوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نسلی امتیاز ان اسٹوروں میں بھی برتا جاتا ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۶۰ء میں ایک تحریک چلی کہ ان دوکانوں پر بھی نیگرو کلرک ملازم رکھے جائیں۔ میں اور میرے کئی ساتھی چھٹی کے وقت نیویارک میں وول ورتھ کے سب سے بڑے اسٹور کے سامنے پکٹنگ (Picketing) کرتے اور گاہکوں سے درخواست کرتے کہ وول ورتھ میں سامان نہ خریدو ـــ یہ میرا پہلا 'انقلابی' بپتسمہ تھا۔

دو سال کے بعد مجھے برنیڈس یونیورسٹی (Brandeis) میں اسکالرشپ مل گیا۔ یہ درس گاہ نیویارک سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع ہے۔ یونیورسٹی میں گنتی کے فقط تین کالے طالب علم تھے اور وہ بھی لڑکیاں ـــ ابتدائی چند مہینوں میں میں نے کی کتابوں پر بہت کم توجہ دی البتہ ادبی کتابیں زیادہ پڑھیں۔ اور کامیو اور سارتر کے ذریعے وجودیت کے فلسفے سے بھی واقفیت حاصل کی۔ میں کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ مگر یونیورسٹی میں ترقی پسند طلباء کی جو چھوٹی سی تحریک تھی اُس سے ربط ضبط بڑھانے کی خواہش مند نہ تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ بھی مجھے نیگرو سمجھ کر میری سرپرستی نہ کرنے لگیں۔

اسی اثناء میں ایک دن خبر ملی کی مشہور نیگرو ادیب جیمس بالڈوین ادب پر لیکچر دینے والے ہیں۔ مجھے اُن کا ناول 'پہاڑ کی چوٹی سے پکا(Go tell It on the Mountain) بہت اچھا لگا تھا۔ اور میں نے اُن کی سب تحریریں پڑھیں تھیں۔ وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو میں ہال کی پہلی صف میں جا کر بیٹھ گئی مگر ابھی وہ تھوڑی دیر ہی بولے تھے۔ کہ خبر آئی کہ کیوبا اور امریکہ کے درمیان سوویٹ اسلحوں کی وجہ سے ٹھن گئی ہے اور تیسری عالمگیر جنگ بس چھڑنے ہی والی ہے۔ اس خبر سے جلسے میں ہل چل مچ گئی۔ اور بالڈوین نے لیکچر ختم کر دیا۔

اس بحران کا ردِعمل طالب علموں میں بے حد خود غرضانہ تھا۔ جس کو دیکھو کینیڈا بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کو یہ خیال نہ تھا کہ اگر ایٹمی جنگ چھڑی تو لاکھوں کروڑوں آدمی ہلاک ہو جائیں گے۔ اور کیوبا کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا۔ بس تھوڑے سے طالب علم تھے جنہوں نے بڑی ثابت قدمی سے اس بحران کا مقابلہ کیا۔ اور امریکی حکومت کی جارحانہ پالیسی کے خلاف احتجاجی جلسوں اور جلوسوں میں پیش پیش رہے۔ ان جلسوں میں جیمس بالڈوین اور پروفیسر ہربرٹ مارکوس

نے بڑی پُر جوش تقریریں کیں۔اور طلبہ سے اپیل کی کہ وہ ڈریں نہیں اور نہ مایوس ہوں بلکہ امریکی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ دھونس اور دھمکی سے باز آئے۔ پروفیسر مارکوس نے ہٹلر کے زمانے میں جرمنی سے بھاگ کر امریکہ میں پناہ لی تھی اور اُن کا شمار دنیا کے چوٹی کے فلسفیوں میں ہوتا ہے۔

یونیورسٹی میں میری دوستی زیادہ تر غیر ملکی طلبا سے تھی۔اُن میں کوئی ہندوستانی تھا کوئی ویت نامی اور کوئی جرمن مجھے یہ تو یاد نہیں کہ تجویز کس کی تھی۔لیکن میں نے ہیلسنکی (Helsinki) میں ہونے والے نوجوانوں کے عالمی میلے میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔اس لیے کہ میری بڑی آرزو تھی کہ دوسرے ملکوں کے انقلابی نوجوانوں سے ملوں۔میرے پاس کوئی پونجی نہ تھی۔لہٰذا میں نے یونیورسٹی کی لائبیری میں، کافی ہاؤس میں، یونیورسٹی کے باہر کی ایک چھوٹی سی دوکان میں کام کر کے سفر خرچ جمع کیا۔

آخر میلے کے دن آگئے اور ہماری ٹولی ہیلسنکی روانہ ہوگئی۔یورپ میں میں نے کئی ہفتے فرانس اور سویزرلینڈ میں بھی گذارے۔

ہیلسنکی کا تیوہار دو ہفتے جاری رہا۔اس سلسلے میں وہاں بڑے دلکش تہذیبی پروگرام ہوئے، سیاسی جلوس نکلے، اور افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا اور مشرق وسطیٰ پر بے شمار سیمینار منعقد ہوئے۔ مگر میری رائے میں سب سے دلچسپ وہ میٹنگیں تھیں جن میں دو دو ملکوں کے نوجوان نمائندے بڑی بے تکلفی سے آپس میں تبادلہ خیال کرتے تھے۔

میں میلے سے امریکہ واپس لوٹی تو سی۔آئی۔ڈی والے میرے منتظر تھے۔'تم کیونسٹوں کے میلے میں کیا کرنے گئی تھیں؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ کیونسٹوں کے بارے میں ہماری رائے کیا ہے اور ہم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟'

۱۹۶۳ء کے موسم خزاں میں مجھ کو برنیڈیز یونیورسٹی کی طرف سے فرانس جا کر فرانسیسی زبان و ادب پڑھنے کے لیے ایک سال کا وظیفہ مل گیا۔ میں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی اور فلابیئر، بالزاک، باڈلیئر، رمبا، پروسٹ اور سارتر کی کتابیں فرانسیسی زبان میں پڑھ چکی تھی۔حتیٰ کہ سارتر کی فلسفیانہ تصنیف 'وجود و عدم' (Being and Nothingness) کو سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ فرانسیسی زبان اور تہذیب سے آشنا ہونے کے لیے ہم کو ابتدا میں پیرس سے دور خلیج بسکے کے ساحل پر ایک چھوٹی سی تفریح گاہ بیاریز میں قیام کرنا پڑا۔جگہ سنسان تھی کیونکہ دولت مند سیاح گرمیاں

گذار کر واپس جا چکے تھے۔ دکانیں اُجاڑ تھیں اور اُونگھتے ہوئے دکاندار راہ چلتوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے تھے۔ وہاں سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگتا تھا گویا بدمست شرابیوں کی محفل ابھی ابھی درہم برہم ہوئی ہے۔ اور کسی کو چیزوں کو طریقے سے رکھنے اور جھاڑ پونچھ کرنے کی فرصت نہیں ملی ہے۔

ایک دن میں اپنے تین چار ہم سبقوں کے ساتھ کلاس سے لوٹ رہی تھی راستے میں میں نے نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کا پیرس ایڈیشن خریدا اور یوں ہی چلتے چلتے سرخیوں پر نگاہ ڈالی تو ایک جگہ لکھا ہوا تھا 'چار لڑکیوں پر گرجا گر میں بم کا دھماکہ۔' میں نے رُک کر خبر کو غور سے پڑھا تو سناٹے میں آ گئی۔ برمنگھم میں سولھویں سڑک بپٹسٹ گرجا گھر ___ اور نام؟ کیرول، سنتھیا، ایڈی، ڈنسی، میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ انہوں نے تم کو قتل کر دیا؟ میرے ساتھی حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے مگر میں نے اخبار ان کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولی 'میں ان کو جانتی تھی وہ میری سہیلیاں تھیں۔' انہوں نے افسوس کا اظہار بڑے خلوص سے کیا اور مجھ سے یوں ہمدردی کرنے لگیں گویا ان لڑکیوں کی موت کوئی اتفاقی حادثہ تھا۔ اُن بے چاریوں کے لیے یہ سمجھنا محال تھا کہ امریکہ کے سفید فام نسل پرستوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نیگرو گرجا گھر پر بم پھینکا تھا۔ وہ چند دیوانے انتہا پسندوں کی حرکت نہ تھی بلکہ صورت حال کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھی۔ بم پھینکنے والے ذہنی مریض نہ تھے بلکہ اپنے سماجی ماحول کی قدرتی پیداوار تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس حادثے کے بنیادی اسباب سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ بات اُن کے دماغ میں کسی طرح نہ گھستی تھی کہ پورا امریکی معاشرہ اس قتل میں ملوث ہے۔ اور میں کیوں ان کے محبوب کینیڈی کو، پورے حکمران طبقے کو نسل پرستی کا مجرم اور اس قتل کا ملزم ٹھہرا رہی تھی۔

ان نسل پرستوں نے یہ بم خاص طور سے میری چاروں سہیلیوں کو مارنے کے لیے نہیں پھینکا تھا۔ ان کو تو شاید یہ احساس بھی نہ تھا کہ گرجا گھر کے تہہ خانے میں بم رکھنے سے کوئی شخص ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔ وہ تو برمنگھم کے کالے باشندوں میں خوف اور دہشت پھیلانا چاہتے تھے جو اچانک نیگرووں کی آزادی کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ وہ آزادی کی تحریک کو قبل اس کے کہ وہ ہمارے ذہنوں اور ہماری زندگیوں میں جڑ پکڑے نیست و نابود کرنے کے درپے تھے۔ اب اگر کسی بے گناہ کی جان چلی جائے تو ان کی بلا سے۔

نومبر ۱۹۶۳ء میں ہماری ٹولی پیرس سے واپس آ گئی اور میں سار بون یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔اس کی عمارتیں صدیوں پرانی تھیں۔اونچے اونچے کھمبے اوراونچی اونچی چھتیں جن کے نقش و نگار مٹتے جارہے تھے۔وہاں کچھ ایسا تقدس چھایا رہتا تھا کہ طلبا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے لامحالہ خاموش رہتے تھے۔قدامت کی اس فضا میں میرا جدید فرانسیسی ادب پڑھنا بڑا بے جوڑ لگتا تھا۔

پیرس میں جب کینڈی کے قتل کی خبر پھیلی تو ہر شخص نے امریکی سفارت خانے کا رخ کیا۔ کینڈی کی موت میرے لیے خوشی کا باعث ہرگز نہ تھی حالانکہ ان کا دامن پاک نہ تھا۔(مجھے کیوبا پر امریکی حملہ بار بار یاد آرہا تھا) لیکن ان کے قتل سے کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہ تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ ٹیکساس نژاد نائب صدر جانسن اور اس کی پشت پناہی کرنے والے تیل کے مالک میرے ہم قوموں کے لیے جینا اور دوبھر کردیں گے۔پھر بھی سفارت خانے کے ماحول میں میں اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کررہی تھی۔امریکی میرے چاروں طرف کھڑے آنسو بہا رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ ہرلڈ ٹریبون میں چار نیگرو لڑکیوں کے بہیمانہ قتل پر ان میں سے کتنوں نے افسوس کیا ہوگا۔

اگلے مہینے میں ایک دوست کے ہمراہ جو مدعو تھی ویت نام کا سال نو کا سالانہ تیوہار دیکھنے گئی۔ یہ تیوہار جنوبی اور شمالی ویت نامی الگ الگ جگہوں پر منا رہے تھے۔میں شمالی ویت نام کی تقریب میں شریک ہوئی جو پیرس کے مزدور علاقے میں بہت وسیع اسٹیڈیم میں منعقد ہوئی تھی۔یہ شاندار تقریب سات گھنٹے جاری رہی جس میں بے شمار گیت گائے گئے۔مزاحیہ کھیل کھیلے گئے اور جسمانی کرتب دکھائے گئے۔

یہ فنی مظاہرے ویت نامیوں کے عزم اور حوصلے کی بھرپور ترجمانی کررہے تھے مگر ان کے پیغام کو سمجھنے کے لیے ویت نامی زبان سے واقفیت بالکل ضروری نہ تھی۔البتہ جب کبھی امریکی حکومت یا امریکی فوج پر طنز کا اظہار ہوتا تو امریکی حملہ آوروں کی پیدا کردہ گھناؤنی حقیقتیں مجھے نغمہ و رقص کی رومانی دنیا سے جھنجوڑ کر اصلی دنیا میں واپس لے آتیں۔

مجھ کو فرانسیسی ادب میں تو ڈگری ملنے ہی والی تھی لیکن میں دراصل فلسفہ پڑھنا چاہتی تھی۔ بالخصوص مارکس اور اس کے پیش رووں اور جانشینوں سے مجھ کو بڑی دلچسپی تھی چنانچہ جب کبھی موقع ملتا میں فلسفہ کی کتابیں پڑھا کرتی۔اس مطالعے کا مقصد میرے ذہن میں واضح نہ تھا البتہ کائنات، تاریخ، انسانی وجود اور شعور کے بارے میں فلسفیوں کے خیالات معلوم کرکے مجھے بڑا سکون ملتا تھا۔

برنیڈس یونیورسٹی میں دوسرے سال کے دوران مجھ کو پروفیسر ہربرٹ مارکوس کی کتاب Erosand Civilisation پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سال وہ ساربون میں لیکچر دے رہے تھے لیکن جب میں پیرس پہنچی تو وہ برنیڈس واپس جا چکے تھے البتہ طلبا میں ان کے لیکچروں کا بڑا شہرہ تھا۔ برنیڈس واپس آ کر مجھ کو پروفیسر مارکوس کے سبقوں میں سرکاری طور پر تو داخلہ نہ مل سکا لیکن میں ان کے ہر لیکچر میں باقاعدگی سے شریک ہوتی تھی۔ طلبا ان کے علم و فضل کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کے کلاس میں داخل ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا تھا اور طلبا گوش بر آواز ہو جاتے تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی پروقار اور دلکش تھی۔

ایک دن میں نے ہمت کر کے پروفیسر مارکوس سے ملاقات کی درخواست کی۔ میں چاہتی تھی کہ فلسفے کے مطالعے کے لیے کتابوں کی فہرست تیار کرنے میں وہ میری رہنمائی کر دیں ___ وہ بادی النظر میں بہت کم آمیز اور نارسا دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے قد و قامت اور سفید بالوں سے اور پھر ان کے بھاری لہجے، غیر معمولی خود اعتمادی اور علم کی فراوانی سے بھی یہی گمان ہوتا تھا لیکن قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ تو بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان تھے اور ان کی متلاشی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

میں نے وجہ ملاقات کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ میں فلسفہ میں اعلیٰ سند حاصل کرنا چاہتی ہوں لیکن میں نے اب تک فلسفہ بڑے بے ڈھنگے پن سے پڑھا ہے لہٰذا میری آپ سے استدعا ہے کہ مجھے کتابوں کی ایک سلسلہ وار فہرست بنا دیں۔ تاکہ میں فلسفہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر سکوں۔ دوسرے یہ کہ فلسفی کانٹ کی تصنیف Critique of Pure Reason پر آپ جو لیکچر دے رہے ہیں اُن میں میرا داخلہ ہو جائے۔

'کیا تم واقعی فلسفہ پڑھنا چاہتی ہو' انہوں نے بے حد سنجیدگی سے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ میں میرے منہ سے بس اتنا نکلا کہ 'جی ہاں ___ میں کم سے کم یہ ضرور معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آیا مجھ میں اس کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں'۔

'تو پھر تم سب سے پہلے قبل سقراط کے فلسفیوں کو پڑھو اور ان کے بعد افلاطون اور ارسطو کو ___ اگلے ہفتے مجھ سے ملو تو ہم قبل سقراط فلسفیوں پر غور کریں گے۔' اُس وقت مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری اس چھوٹی سی درخواست کا نتیجہ نہایت خرد افروز ہفتہ وار بحثوں کی شکل میں برآمد ہو گا۔

ہٹلر سے قبل فرینک فرٹ یونیورسٹی کا شعبہ فلسفہ اپنے 'تنقیدی نظریہ' کے لیے سارے یورپ میں مشہور تھا۔ اس کے روح رواں پروفیسر مارکوس، پروفیسر ادارنو اور پروفیسر میکس ہور خائمر تھے۔ نازیوں کے برسراقتدار آنے پر یہ تینوں فلسفی ترک وطن کر کے امریکہ چلے آئے۔ نازیوں کی شکست کے بعد ادارنو اور میکس ہورخائمر تو فرینک فرٹ واپس چلے گئے البتہ مارکوس نے امریکی شہریت اختیار کر لی۔ میں جن دنوں فرانس میں زیرتعلیم تھی تو میں نے چند ہفتے فرینک فرٹ یونیورسٹی میں بھی گزارے تھے اور ادارنو کے لیکچروں میں شریک ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے جرمن زبان بہت کم آتی تھی۔ لیکن میرے دوست لیکچروں کا مفہوم سمجھنے میں میری مدد کرتے رہتے تھے۔ بعد میں میں نے ان تینوں جرمن فلسفیوں کی وہ کتابیں پڑھ ڈالیں جو انگریزی یا فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔

برینڈز یونیورسٹی کے آخری سال میں میں نے فرینک یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنے کی غرض سے وظیفہ کی درخواست دے دی۔ پروفیسر مارکوس کی بھی یہی رائے تھی۔ اُن کے خیال میں ہیگل اور مارکس کے مطالعے کے لیے سب سے موزوں جگہ وہی تھی۔ اسی اثنا میں بی۔ اے کا امتحان سر پر آ گیا اور میں پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔

میرے والدین میرے ملک سے دوبارہ باہر جانے پر چنداں خوش نہ تھے۔ البتہ تقسیم اسناد کے جلسے میں شریک ہو کر جب انہوں نے یہ سنا کہ بیٹی اول آئی اور اُس کو کئی انعام اور تمغے بھی ملے تو ان کی فخریہ مسرت کی انتہا نہ رہی۔ تقریب ختم ہوئی تو میں نے اپنا سامان باندھا اور ان کے ہمراہ برمنگھم روانہ ہو گئی۔ راستے میں میرے والد نے ایک دکان سے بوربن وہسکی کی کئی بوتلیں خریدیں اس لیے کہ ریاست الاباما میں دکانوں پر وہی وہسکی ملتی ہے جو وہاں کے سفید فام گورنر والیس کے رشتہ داروں کی فیکٹری میں بنتی ہے۔

ریاست ٹینسی کی سرحد میں ہم بہت رات گئے داخل ہوئے مگر ہم جانتے تھے کہ راستے میں ہم کو کوئی ایسا ہوٹل (سرائے) نہیں ملے گا جس کو نیگرو چلاتے ہوں لہٰذا یہی طے پایا کہ سیدھے برمنگھم کا رُخ کیا جائے۔ رات کے دو بجے ہوں گے اور ہم لوگ ٹینسی کے کسی قصبے سے گزر رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے پولیس کی موٹر کار کا سائرن زور زور سے بجنے لگا۔ میرے باپ نے موٹر روک لی اور ہم پولیس کا انتظار کرنے لگے۔ پولیس کی گاڑی ہمارے پاس آ کر رُک گئی۔ اور ایک موٹا سا تمبا کو چباتا ہوا گورا سپاہی بڑی نفرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میرے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا 'کیا

تمہیں خبر نہیں کہ تم گاڑی بہت تیز چلا رہے تھے۔ نیچے اترو' اس کی انگلیاں پیٹی سے لٹکے ہوئے پستول پر تھیں۔ اور مجھ کو معاً وہ نیگرو یاد آ گئے جو ہمارے قصباتی جیلوں میں ہفتوں بلکہ بعض اوقات ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ سپاہی نے پہلے ہماری گاڑی کی اندر سے تلاشی لی پھر میرے باپ سے ڈکی کھولنے کو کہا مگر ہمارے سوٹ کیس دیکھ کر اس کو بڑی حیرت ہوئی اور جب میرے والد نے بتایا کہ ہم لوگ اپنی بیٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے سے واپس آ رہے ہیں تو اس کی رعونت تھوڑی دھیمی پڑی مگر اس کا لہجہ سرکاری ہو گیا۔ البتہ وہسکی کی بوتلیں دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

'تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں شراب ممنوع ہے۔ اس علاقے میں شراب رکھنا جرم ہے۔'

'لیکن یہ بوتلیں بند ہیں اور ہم اس علاقے سے فقط گزر رہے ہیں۔'

'اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس ضلعے میں شراب نوشی جرم ہے اور شراب کی درآمد برآمد ممنوع ہے۔ تم کو تیس دن کے لیے جیل میں بند کیا جا سکتا ہے۔ جج صاحب باہر گئے ہوئے ہیں اور اگلے ہفتے واپس آئیں گے۔ شاید تم کو اس وقت تک حوالات ہی میں رہنا پڑے۔'

جب میرے باپ نے اپنے وکیل سے فون پر گفتگو کرنے کی بات کی تو سپاہی کہنے لگا اچھا چلو میں تمہارے سات وہی رعایت کرتا ہوں جو اپنے چھوکروں سے کرتا ہوں۔ موٹر میں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اس نے وہسکی کی بوتلیں اپنی کار میں رکھ لیں۔

بھاگنا نہایت خطرناک تھا لہٰذا یہ سمجھ کر کہ پولیس والا ہم کو تھانے لے جا رہا ہے ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ لیکن اس کی موٹر رکی تو وہاں تھانے کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ ہم ایک کچی گلی میں تھے۔ اور پولیس والا موٹر خانے کا پھاٹک کھول رہا تھا۔

میری ماں نے گھبرا کر کہا 'ڈیوس! تم کو اندر نہیں جانا چاہیے نہ جانے وہ کیا کرے۔' لیکن میرے باپ کے چہرے پر خوف کا نام و نشان تک نہ تھا وہ اندر چلے گئے اور ہم بڑی بے چینی سے گاڑی میں ان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ باہر آئے تو ان کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ موٹر چلاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اس بے ایمان کو بوتلوں سمیت بیس ڈالر کی طلب تھی سو پوری ہو گئی۔

فرینک فرٹ میں میرا ماہانہ وظیفہ سو ڈالر تھا۔ وہاں پہلا مسئلہ رہائش کا تھا مگر میں جس ایجنسی کے پاس جاتی یہی جواب ملتا کہ ہمارے پاس غیر ملکیوں کے لیے کوئی کمرہ نہیں ہے لیکن ان کے

چہرے بشرے سے صاف عیاں ہوتا کہ کمرے تو ہیں مگر خالص آریاؤں کے لیے۔

تاریخ میں بیس سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ شہر کی پچاس فیصد آبادی کو ہٹلری دور کا تجربہ تھا۔ اور مشرقی جرمنی کے برعکس مغربی جرمنی میں فاشزم اور نسلی امتیاز کے خلاف کبھی کوئی منظم مہم نہیں چلائی گئی تھی لہٰذا نسلی نفرت لوگوں کی رگ و پے میں بدستور موجود تھی۔

بارہ ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد مجھ کو ایک گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر مل گئی۔ یہ کمرہ جس فلیٹ سے وابستہ تھا اس میں رہنے والے مغربی جرمنی کے عام لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ ان کو امریکی نیگروں سے ہمدردی تھی اور وہ ہمارے ہم قوموں کے مسائل پر گفتگو کرتے وقت ہم پر توڑے جانے والے مظالم کا موازنہ نازی جرمنی میں یہودیوں پر ہونے والے مظالم سے ضرور کرتے تھے۔ وہ اکثر مجھے کھانے پر بلاتے اور گھنٹوں باتیں کرتے۔ اس میل جول اور بات چیت سے مجھے جرمن زبان سیکھنے میں بڑی مدد ملی۔

فرینک فرٹ میں طلبا کی سوشل ڈیموکریٹک لیگ بہت فعال جماعت تھی۔ میں ان کے جلسے جلوسوں میں شریک ہوتی رہتی تھی البتہ ہم غیر ملکی طلبا پولیس کی گرفت میں آنے سے بچتے تھے اس لیے کہ پردیسیوں کو ملکی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ اور اگر وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے پکڑے جاتے تو ان کو فوراً ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔ پھر بھی میں ویت نام پر امریکی حملے کے خلاف مظاہروں میں ضرور شریک ہوتی تھی۔

میں نے ۱۹۶۴ء میں جب فرینک فرٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا تو امریکہ میں سیاسی اعتبار سے نسبتاً سکون تھا۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی گرمیوں میں جب میں وطن واپس آئی تو حالات بدل چکے تھے۔ میرے ہزاروں بھائی بہن لاس اینجلز کی سڑکوں پر چیخ رہے تھے کہ ہم نے بہت دن صبر کیا، بہت دن تماشا دیکھا اور اب مزید صبر ناممکن ہے۔

جن دنوں میں مغربی جرمنی میں چھپی بیٹھی تھی تو کالوں کی تحریکِ آزادی چولا بدل رہی تھی۔ بلیک پاور (Black Power) کا نعرہ پہلی بار ریاست مسی سی۔ پی کے ایک مظاہرے میں بلند ہوا تھا۔ اور نیگرو تنظیموں کی سوچ میں بنیادی تبدیلی آ رہی تھی۔ نیگرو طلبا کی رابطہ کمیٹی عدم تشدد جس کے نام کا جزو تھا بلیک پاور کی وکالت میں پیش پیش تھی۔ یہ رابطہ کمیٹی شہری حقوق کی سب سے مضبوط تنظیم تھی۔ نسلی مساوات کی کانگریس (Congress for Rocial Equality) میں بھی اسی قسم کی

تبدیلی آرہی تھی۔ شہر نیویارک میں ایک قومی بلیک پاور کانفرنس بھی ہو چکی تھی۔ اور سیاسی حلقوں، ٹریڈ یونینوں، گرجا گھروں اور دوسری تنظیموں میں کالوں کے مفاد کی حفاظت کی خاطر کالوں کے سیل بن رہے تھے۔ ہر طرف سخت ہیجان اور اُبال تھا۔

اُدھر میں فرنیک فرٹ میں فلسفہ پڑھ رہی تھی اور سوشل ڈیموکریٹک لیگ کی تحریکوں میں شرکت کر رہی تھی۔ ادھر ریاست کیلی فورنیا کے شہر اوک لینڈ میں کالے نوجوان کالے باشندوں پر پولیس کے سفاکانہ مظالم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا عہد کر رہے تھے۔ ایک روز میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ہوئی نیوٹن، بابی سیل اور بابی ہٹن نامی نیگرو نوجوان شہر سیکرامنٹو میں کیلی فورنیا کی قانون ساز اسمبلی میں اسلحہ لیکر داخل ہو گئے (گوروں کو یہ حق حاصل تھا) ان کی تنظیم کا نام تحفظِ ذات کی خاطر بلیک پینتھر پارٹی (Black Panther Party for Self Defence) تھا۔

یہ تحریک جیوں جیوں شدت اختیار کرتی جاتی تیوں تیوں اپنی بے بسی پر میرا غصہ بھی بڑھتا جاتا۔ ہر چند کہ میں فلسفہ کی گہرائیوں میں اُترتی جارہی تھی اور میرا شعور پختہ ہوتا جارہا تھا لیکن تحریک سے دوری اور تنہائی کا احساس بھی تیز ہوتا جارہا تھا۔ میں میدان کارزار سے اتنی دور تھی کہ میں جدو جہد کے واقعات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ میں تو یہ تصفیہ بھی نہ کرسکتی کہ تحریک کے کون سے دھارے سچے ہیں اور کون سے جھوٹے۔

میں عجیب تذبذب میں مبتلا تھی۔ ایک طرف وطن کی بڑھتی ہوئی جدو جہد دوسری طرف فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری کی تحصیل۔ یہ تضاد ہر روز زیادہ اذیت ناک ہوتا جاتا تھا۔ اور مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو رہی تھی کہ میری تحصیل علم کی صلاحیت براہ راست اسی بات پر منحصر ہے کہ میں نیگرو جدو جہد میں کوئی ٹھوس خدمت سرانجام دوں۔

میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام کے نگراں پروفیسر اَدورنو تھے لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ اب میں جرمنی میں زیادہ نہیں رہ سکتی۔ بس دو سال کافی تھے۔ میں نے پروفیسر اَدورنو کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور وطن واپس جانے کا اصل سبب اُن پر واضح کر دیا۔ اسی اثنا میں پروفیسر مارکوس کو سیاسی اسباب کی بنا پر برینڈز یونیورسٹی سے علیحدہ ہونا پڑا تھا اور اب وہ سین دیگو میں واقع کیلیفورنیا یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ میری اُن سے خط و کتابت تھی۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ کیلیفورنیا جا کر تعلیمی مشغلہ بھی جاری رکھوں گی۔ اور عملی جدو جہد میں بھی شامل رہوں گی۔ میں وطن روانہ ہوگئی۔

تاریخ سے مکالمہ

ہم سب منافق بن رہے ہیں: امرتا پریتم

انٹرویو: زمان خان

امرتا پریتم، شاعر، ناول نگار اور عورتوں کے حقوق کی علمبردار، پنجابی کی سب سے عظیم لکھاری تھیں۔ وہ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں جب سکول میں تھیں تو لکھنا شروع کیا۔ ان کی ۷۵ کتابیں شائع ہوئیں، جن میں ۳۰ ناول، ۱۸ شاعری کے مجموعے اور ان گنت افسانے شامل ہیں۔ وہ صرف پنجابی میں ہی لکھتی تھیں مگر ان کی تحریروں کے تراجم دنیا کی ۳۴ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

وہ برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان ہجرت کر گئیں اور دلی میں آباد ہو گئیں۔ انہوں نے دس سال تک پانچ روپیہ روزانہ پر آل انڈیا ریڈیو پر کام کیا۔ امرتا پریتم کی ادبی خدمات کے صلے میں ان کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والی وہ ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں، انہیں ہندوستان کے صدر نے 'پدما شری' کا ٹائٹل بھی دیا۔ امرتا نے ساری عمر سماجی گھٹن کے خلاف آواز اٹھائی اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں جدوجہد کی۔ آپ کو ادیبوں کی سیٹ پر راجیہ سبھا کا ممبر بھی نامزد کیا گیا۔

امرتا پریتم نے اپنے انٹرویو میں ہندوستان میں پنجابی کے مستقبل، فیض احمد فیض اور منٹو کے بارے میں بات کی۔ اس کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی میں آنے والے دو کرداروں امروز اور ساحر کے ساتھ تعلقات پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ انٹرویو ان کے گھر دلی میں کیا گیا اور اس میں امروز بھی موجود تھے وہ وقتاً فوقتاً بات چیت میں حصہ بھی لیتے رہے۔ پنجابی کی اس عظیم ادیبہ کا چند سال پہلے دلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک لمبا عرصہ امروز کے ساتھ رہیں جو ان کی وفات کے بعد آج بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں جہاں وہ امرتا کی زندگی میں رہتے تھے۔

سوال: آپ نے تعلیم ادھوری کیوں چھوڑ دی؟

جواب: میں بی اے میں پڑھتی تھی۔ میں نے بی اے کے امتحان کا پہلا پرچہ بھی دے دیا تھا۔ پھر مجھے ایک دن خیال آیا امتحان تو صرف آپ کی یادداشت کا امتحان ہے۔ میں دوسرے لوگوں کی نظمیں زبانی کیوں یاد کروں جب کہ میں خود نظمیں لکھ سکتی ہوں۔ میں بہت غصہ

میں تھی سو میں نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا۔

سوال: آپ نے کب لکھنا شروع کیا؟

جواب: بہت چھوٹی عمر میں۔ غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بچے چاند سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ میں نے چاند پر کچھ نشان دیکھے اور سوچا کہ یہ کچھ لفظ ہیں۔ میں نے چاند پر لفظ 'راج' لکھا ہوا دیکھا۔ میری والدہ جن کا پہلے انتقال ہو چکا تھا ان کو راج کہا جاتا تھا۔ پھر میں نے کچھ اور الفاظ دیکھے اور یہ سب مل کر 'راجن' بن گئے۔ پھر میں نے راجن پر ایک نظم لکھی۔ ایک دن کیا ہوا جب میں سکول جا رہی تھی تو میرے والد نے میری جیب میں کچھ پیسے ڈالنے کیلئے ہاتھ ڈالا تو انہیں ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا جس پر ایک نظم لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے نظم نکال کر پڑھی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ نظم تم نے لکھی ہے۔ میں نے جواب دیا نہیں۔ میرے خیال میں، میں نے ساری عمر میں صرف یہ ہی ایک جھوٹ بولا۔ کیونکہ میں نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا۔ میرے والد نے میرے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور کہا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ راجن کون ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ میرے ذہن کی اختراع ہے۔ یہ خیالی کردار ہے اس دفعہ میں سچ بول رہی تھی۔

میرے والد سردار کرتار سنگھ پنجابی کے اچھے شاعر تھے۔ میں نے اپنے والد سے شاعری کے کافیے ردیف اور تکنیکی باتیں سیکھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے ثقافتی ورثہ کے بارے میں بھی بہت کچھ سکھایا۔

سوال: آپ کی نظم 'اج آکھاں وارث شاہ نوں' ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہوئی۔ مگر اس کے بعد آپ کی کوئی نظم یا شاعری پاکستان میں نہیں چھپی، کیا آپ نے شاعری لکھنا بند کر دی؟ یا کم کر دی؟

جواب: تقسیم سے پہلے میری شاعری کی کتاب 'چھ رتن' لاہور سے شائع ہوئی تھی اس کے بعد میری کوئی شاعری کی کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے شعر کہنا کبھی نہیں چھوڑا بلکہ میں نے پہلے کی نسبت بہت پختہ نظمیں لکھیں۔ میں نے اپنی تحریروں کی ایک کتاب انگریزی میں چھاپی ہے۔ میری ایک کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی ہو رہا

ہے جو اس ماہ کے آخر تک مارکیٹ میں آ جائے گا۔

سوال: آپ کی بہت ساری کتابیں بمع آپ کی آپ بیتی 'رسیدی ٹکٹ'، پاکستان میں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی نثر پاکستان میں نظم سے زیادہ مقبول ہے۔

جواب: مگر تراجم بہت برے ہیں۔ مثال کے طور پر میری آپ بیتی کو ہی لے لیں۔ اس میں میری ترجمہ شدہ نظمیں غلط ہیں۔ میں نے ناشر کو بارہا لکھا کہ میں تراجم ہندوستان سے کروا کر بھیج سکتی ہوں مگر اس نے کبھی جواب دینا ہی گوارا نہیں کیا۔ درحقیت اس نے میری کتاب کی ایک کاپی بھی مجھے کبھی نہیں بھیجی۔

سوال: آپ نے اپنی کتاب آپ بیتی میں کئی لوگوں کے نام لئے ہیں؟

جواب: مگر پاکستان میں چھپا ہوا ترجمہ مکمل نہیں ہے، مثال کے طور پر میں نے اپنے ایک دوست سجاد حیدر کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے وہ حصہ حذف کر دیا۔ جہاں جہاں اس کا ذکر آتا تھا وہ حصہ ہی نہیں چھاپا اس طرح کتاب ضائع کر دی۔ میں نے اس کا ذکر بہت محبت سے کیا تھا۔ تم ایک وکیل ہو تم یہ مسئلہ پاکستان میں اٹھاؤ۔

سوال: آپ نے ساحر لدھیانوی کا ذکر بھی کئی جگہ پر کیا ہے۔

جواب: میں نے حال ہی میں اپنی کتاب پر نظرثانی کی ہے۔ میری آپ بیتی کا نیا ایڈیشن ابھی چھپا ہے۔ میں نے اس میں کچھ اضافے کئے ہیں۔ میں نے اس میں ساحر کی وفات کے بعد اس کے بارے میں مزید لکھا ہے۔ میں نے اندرا گاندھی کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ دونوں شخصیات کی موت میرے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔ میں نے ان کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں۔

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ ساحر کے ساتھ آپ کے 'خصوصی' تعلقات تھے؟

جواب: ہاں، وہ میرا دوست تھا وہ جو اردو میں کہتے ہیں 'میں اپنے خیالوں کے صدقے'

سوال: کیا ساحر بھی آپ کے بارے میں یہی محسوس کرتا تھا۔ کیا اس کے بھی یہی جذبات تھے؟

جواب: کئی حوالوں سے، کچھ حوالوں سے ہاں۔ مگر وہ آخری قدم نہ اٹھا سکا۔ اس میں حوصلہ نہ تھا

سوال: کیا ساحر نے بھی آپ کے بارے میں کوئی نظم لکھی؟

جواب: کئی ایک۔ایک دفعہ ساحر، دلی میں تھا۔میں اورامروز (امرتا کا جیون ساتھی) اسے ہوٹل ملنے گئے۔اس نے تین گلاسوں میں وسکی (شراب) ڈالنی شروع کردی۔ہم نے اس کے ساتھ ایک گھنٹہ گذارا اور واپس گھر آ گئے۔اس نے رات کے گیارہ بجے مجھے فون کیا ۔اس نے بتایا کہ اس نے شراب کے تین گلاس بھرے ہیں اور ان سے وسکی پی رہا ہے اور یہ نظم لکھ رہا ہے۔

'میرے ساتھی خالی جام ،تم آباد گھروں کے باسی ،میں آوارہ اور بدنام'۔اس نے یہ ساری نظم مجھے فون پر سنائی۔بعد میں یہ نظم فلمائی بھی گئی ہے۔

سوال: کیا آپ نے بھی ساحر کے بارے میں نظم لکھی ہے؟

جواب: ہاں میں نے بھی اس پر نظمیں لکھی ہیں جیسے' لگی لوتے پہلے پہر'

سوال: آپ کا پاکستان میں اپنے ہم عصر ادیبوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: فیض احمد فیض سے دوستی ہوگئی تھی۔ایک دفعہ جب وہ دلی آئے تو ان کو میں نے دوردرشن کیلئے انڑویو کیا تھا۔میں ے انہیں پہلی دفعہ زندگی میں کھلے عام پنجابی بولتے سنا۔جہاں تم بیٹھے ہو اسی جگہ فیض بیٹھے تھے کیونکہ دوردرشن کے پاس اس وقت کوئی سٹوڈیو نہیں تھا۔تم یہ لیمپ شیڈ دیکھ رہے ہونا۔اس پر امروز کے لکھے ہوئے فیض کے شعر' گلوں میں رنگ بھرے' بات اسی سے شروع ہوئی۔ جب انڑویو ختم ہوگیا تو فیض نے کہا کہ کھڑکیاں کھول دو اور چائے کے برتن ہٹادو۔کچھ شراب لاؤ۔

میں نے فیض سے پوچھا کہ آپ نے شاعری کس کے لئے اور کیسے لکھنی شروع کی۔فیض نے مجھے سیالکوٹ میں ایک لڑکی سے اپنے معاشقہ کے بارے میں بتایا۔اس نے بتایا کہ سیالکوٹ میں ایک لڑکی تھی جس کے لئے اس نے شاعری شروع کی مگر بعد میں اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں ہوگئی۔وہ کافی عرصہ اس لڑکی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔فیض نے بتایا کہ اس لڑکی کے بعد اس کے ایک قریبی دوست کی سالی اپنی بہن کو ملنے انگلینڈ سے ہندوستان آئی تھی ،تو بس اس سے شادی کرلی۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک لکھاری کو کرافٹ میں تجربات کرنے چاہیں؟

جواب: آپ کو کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایک لکھاری اپنے آپ کو بار بار دہرا نہیں سکتا۔ہر ایک کو ایک

طرح کے تجربات ہوتے ہیں مگر ایک لکھاری کو اس کو پیش کرنا آتا ہے۔ یہی تو آپ کو لکھاری بناتا ہے، موضوع نیا نہیں ہوتا مگر آپ کیسے لکھتے ہیں۔ یہ آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

سوال: آپ کے ناولوں میں بنیادی مسئلہ کیا ہے جو آپ کے کرداروں میں سامنے آتا ہے۔

جواب: بنیادی مسئلہ عورت اور مرد کے تعلقات ہیں۔ جو آدمی اور آدمی اور پھر ملک اور ملک کے درمیان پھیل جاتے ہیں۔

سوال: آپ کی نظر میں آدمی اور عورت کے درمیان تعلقات اتنے پیچیدہ کیوں ہیں؟

جواب: کیوں کہ عورت نامکمل ہے اور یہی حالت مرد کی ہے۔ ہم محبت کو، نوجوانی اور خوبصورتی کی کشش اور بعض آسائشوں کی چاہت کا نام دے دیتے ہیں۔ لیکن محبت مکمل عورت اور مکمل مرد کے درمیان ہوتی ہے۔ سچی محبت مکمل عورت اور مکمل مرد کے درمیان ہوتی ہے۔

سوال: آپ کا مکمل عورت کا کیا تصور ہے؟

جواب: جو اقتصادی، جذباتی اور ثقافتی طور پر خود مختار اور آزاد ہو۔ آزادی کی بھیک نہیں مانگی جاتی، نہ یہ sieze کی جاسکتی ہے۔ یہ دوسروں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہ جسم کی دھول سے اٹھتی ہے۔ ایک دفعہ ایک امریکن عورت مجھے ملنے آئی۔ اس نے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ امریکن عورت بہت آزاد ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا یہ یقیناً درست نہیں ہے۔ اگر یہ درست ہوتا تو امریکوں کا رویہ دوسری قوموں کی طرف مختلف ہوتا۔ مساوات اور برابری کا ہوتا۔ آزاد ملک ہونے کی حیثیت سے وہ دوسروں کی آزادی کی عزت کرتے۔

سوال: آپ نے پنجاب کی تقسیم پر ایک بہت جذباتی نظم لکھی تھی۔ کیا آپ کے بھارتی پنجاب میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے؟

جواب: ہاں میں نے بہت نظمیں لکھی ہیں۔ 'رب خیر کرے میرے ویڑے دی' میں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔

سوال: سعادت حسن منٹو نے پنجاب کی تقسیم پر کئی زبردست افسانے لکھے، کیا آپ ان کو ذاتی

طور پر جانتی تھیں؟

جواب: نہیں میں اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس نے مجھے بہت خوبصورت خط لکھا تھا۔ اس نے لکھا کہ میری نظم پڑھ کر اس پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔۔۔۔ میں نے اسے شکریہ کا خط لکھا۔ منٹو کی وفات کے بعد ایک ناشر میرے پاس آیا اور کہا کہ میں منٹو کے بارے میں ایک کتاب کا دیباچہ لکھ دوں۔ مجھے ان کے تقسیم کے بارے میں افسانوں سے جذباتی لگاؤ تھا۔ خاص کر کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ جب میں نے دیباچہ لکھنا شروع کیا تو میرے پاس پنجابی کا ایک بڑا چوٹی کا، نام نہاد ادیب آیا اور مجھے کہا کہ تم منٹو پر کتاب کا دیباچہ نہ لکھو۔ اس کے مشورے کے باوجود میں نے منٹو پر کتاب پر بھرپور دیباچہ لکھا۔ اس میں میں نے ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا۔ میں نے لکھا کہ روس کے ایک گاؤں میں خوتین بہت عمدہ قالین بنتی تھیں، وہ مصنوئی رنگ استعمال نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ جنگل سے جڑی بوٹیاں لا کر ان کو ابال کر ان سے خوبصورت پکے رنگ بناتی تھیں۔

جب ایک عورت نے لینن کی موت کا سنا تو اس نے بہت ہی خوبصورت قالین بنا۔ کیونکہ اس کے پاس کالا رنگ نہیں تھا اس لئے اس نے قالین کا باڈر بنانے کے لیے، مصنوئی، کیمیکل رنگ استعمال کیا۔ قالین کھلے آسمان کے نیچے پڑا تھا، بارش اور دھوپ میں اصلی، قدرتی رنگ بہت شوخ اور پکے ہو گئے اور مصنوئی رنگ اتر گیا، دھل گیا۔ میں نے کہا کہ یہی منٹو کے ساتھ ہوگا۔ اس کی ذات کے ساتھ لگا ہوا دھبہ وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے گا، دھل جائے گا۔ اور اس میں سے حقیقی اور خوبصورت منٹو ابھر کر آئے گا۔ میں نے کہا کہ اس کے ناقدین مر جائیں گے مگر منٹو زندہ رہے گا۔

سوال: کیا آپ نے کسی پاکستانی ادیب کے بارے میں بھی لکھا ہے؟

جوب: ہاں میں نے فخر زمان کے بارے میں لکھا ہے۔ میں نے اس کی کتابیں 'بے وطنا' اور 'بندی وان' چھاپی ہیں۔ میں نے مظہر الاسلام اور سعیدہ گذدر کے بارے میں لکھا ہے اور ہاں سارہ شگفتہ کے بارے میں بھی۔

تحقیق کے نئے اُفق

(تبصرۂ کتب)

عورت: زندگی کا زنداں

تصنیف: زاہدہ حنا

ضخامت: ۳۰۰ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے

طابع: شہرزاد، بی۔۱۵۵، بلاک ۵، گلشنِ اقبال، کراچی۔ سنِ اشاعت: ۲۰۰۴ء

تبصرہ نگار: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

علامہ اقبالؔ نے تو عورتوں کی پس ماندگی اور زبوں حالی پر یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ ؎

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

لیکن اقبال کے بعد سینکڑوں ایسے افراد اور بیبیاں سامنے آ چکی ہیں جنہوں نے اس 'عقدۂ مشکل' مشکل کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ سمجھ کر بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ عورتیں خواہ ہمارے معاشرے کی ہوں یا کسی اور ملک و معاشرے کی، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ حالت کم و بیش سب کی ایک ہی سی ہے۔ جن معاشروں میں وہ بظاہر قومی زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کرتی نظر آتی ہے، وہاں بھی بغور دیکھا جائے تو استحصال کی زنجیروں نے ان کو کسی نہ کسی شکل میں جکڑا ہوا ضرور ہے۔ یہاں تک کہ ترقی یافتہ مغربی معاشروں میں بھی سامنے کی چکاچوند سے ہٹ کر اگر معاشرے کے تنگ و تاریک گوشوں میں دیکھا جائے تو دہرے معیاروں اور معاشرتی اونچ نیچ کی زد میں سب سے پِسا ہوا اور کراہتا ہوا وجود عورت ہی کا نظر آئے گا۔ البتہ ادھر چالیس پچاس برسوں میں یہ ضرور ہوا ہے کہ خواتین نے احتجاج کا راستہ کہیں زیادہ یکسوئی اور تیاری کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ ان کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں تنظیمیں دنیا بھر میں قائم

ہو چکی ہیں اور وہ اپنے اپنے مزاج کے اور اپنی استعداد کے مطابق خواتین کے احوال وکوائف کو بہتر بنانے کے لیے سرگرداں ہیں۔اس سلسلے میں علمی سطح پر جو کام ہوا ہے، وہ بھی بڑا وقیع ہے۔کوئی دن نہیں جاتا جب ہم کسی بین الاقوامی ادارے، مختلف ممالک میں یا اپنے ملک میں تیار کی گئی خواتین سے متعلق کسی رپورٹ کو نہ پڑھتے ہوں۔مختلف معاشروں میں عورتوں کی صورتِ حال کے تقابلی مطالعوں پر مشتمل بیسیوں کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔مختلف ملکوں کے بارے میں انفرادی کیس اسٹڈیز بھی روز کا معمول ہیں۔ادھر پچھلے دس بیس برسوں میں پاکستان میں بھی سرکاری طور پر بھی اور مختلف این۔جی۔اوز اور جامعات کی طرف سے بھی بہت سا لٹریچر خواتین کے حوالے سے منظرِ عام پر آیا ہے۔

یہ بھی ایک قابلِ ذکر حقیقت ہے کہ صنفیت اب ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔جس کے بارے میں تعلیم وتدریس اور تحقیق کے شعبوں میں بڑے پیانے پر کام ہو رہا ہے۔ البتہ اس تمام سرگرمی کے باوجود صنفیت سے متعلق مطبوعات میں گہرے اور ٹھوس سماجی و تاریخی مطالعے نسبتاً کم نظر آتے ہیں۔اردو زبان میں تو اس حوالے سے تحقیقی اور تاریخی ادب اور بھی کم ہے۔جو چند ایک کتابیں ادھر پچھلے برسوں میں شائع ہوئی ہیں ان میں زاہدہ حنا کی تصنیف 'عورت: زندگی کا زنداں' ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔کتاب کا عنوان ہی اس کی ادبیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔زاہدہ حنا خود ایک تسلیم شدہ تخلیق کار ہیں جنھوں نے فکشن کے میدان میں اپنی نمایاں پہچان قائم کروائی ہے۔وہ ایک مستقل کالم نگار بھی ہیں اور ملک اور بیرونِ ملک کئی اخبارات میں ان کے کالم چھپتے رہے ہیں۔پھر ان کی فکشن کی تحریریں ہوں یا کالم نگاری دونوں میں ان کے وسیع مطالعے، تاریخ اور کلاسیکی ادب کے ان کے فہم اور ان کے عوام دوست سماجی شعور کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ان کی دیگر ادبی وصحافتی مصروفیات سے قدرے ہٹ کر ایک ٹھوس علمی کام کے طور پر سامنے آئی ہے۔اس کتاب کا موضوع تاریخ وادب میں اور خاص طور سے جنوب مغربی ایشیا میں عورت کو حاصل رہنے والی حیثیت اور مقام کا معروضی انداز میں تجزیہ کرنا ہے۔

اس کتاب کو عورت کی مجبوری ومختاری کے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل رہے گی، کیونکہ اس میں شامل مضامین گہرے غور وفکر اور تحقیق کے حامل ہیں۔ان میں سے چند ایک

مضامین مختلف اوقات میں جرائد میں بھی شائع ہوئے لیکن یہ سب ایک ساتھ یکجا ہو کر ایک مبسوط کتاب کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات ایک دوسرے سے منطقی طور پر جڑے ہوئے ہیں اور ان سب میں ایک فکری دھارے کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی اس کتاب کو مضامین کا مجموعہ ہونے کے باوجود ایک مستقل کتاب کا درجہ دے دیتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں پہلا مضمون 'ماں سے باپ کی حکمرانی تک' مادرسری نظام سے پدرسری نظام تک انسانی تہذیب کے ارتقا کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کو علم الانسان یا اینتھروپولوجی کے دائرے میں رکھ کر پڑھا جائے تو یہ اپنے موضوع پر اردو میں ایک اہم تحریر کی حیثیت سے جانا جائے گا۔ مادرسری نظام جن تہذیبوں میں روبہ عمل رہا ان میں اس نظام نے خاص طور سے اپنے دورِ عروج یعنی دس ہزار سے سات ہزار قبل مسیح تک جو اثرات مرتب کیے، اس مضمون میں ان کا تفصیلی ذکر ہے۔ البتہ یہ نظام کس طرح سے تبدیل ہوا اور تبدیلی کے اس عمل میں معاشرے میں نجی ملکیت کے تصور کے متعارف ہونے نے جو اہم کردار ادا کیا اس کا بھی اس مضمون میں تفصیلی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون نگار قدیم تہذیبوں میں سے خاص طور سے مصری، یونانی اور رومی تہذیبوں کا ذکر کرتی ہیں اور دکھاتی ہیں کہ کس طرح مادرسری نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی عورت جانوروں کی طرح مرد کی ملکیت بن گی اور بردہ فروشی نے اس کو جنسِ بازار بنا کر رکھ دیا۔

اس سلسلے میں پروہتوں نے مذہب کے نام پر عورت کے استحصال کو جو روحانی رنگ دیا، اس نے عورت کی آزادی کے تصور کو تقریباً محال بنا دیا۔ اس ضمن میں زاہدہ حنا بہت سے مغربی ماہرین علم الانسان کے ساتھ ساتھ مشرقی ممالک کے اہلِ قلم کے رشحاتِ فکر سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں جہاں مورگن، کارل مارکس اور ول ڈیورانٹ اور ایسے ہی دوسرے مغربی مفکرین کے حوالے ملتے ہیں وہیں وہ فاطمہ مرنیسی اور بعض دوسرے مشرقی اہلِ قلم کی تحریروں سے بھی اکتساب کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا یہ مقالہ ازمنۂ قدیم سے شروع ہو کر آج کے زمانے تک آتا ہے اور گلوبلائزیشن اور مارکیٹ اکانومی کے دور میں پدرسری نظام کی کیا شکل ہے اور اس نظام نے کیا لبادے اوڑھ رکھے ہیں، مقالے میں ان سب کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا مقالہ 'پاکستانی عورت آزمائش کی نصف صدی' چند برس قبل ارتقا انسٹی ٹیوٹ

کے زیرِ اہتمام حمزہ واحد یادگاری لیکچر کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں قیامِ پاکستان سے لے کر آزادی کے ۵۰ سال بعد تک کے زمانے میں جو کچھ ہمارے ہاں عورت پر گذری اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کے لیے مصنفہ نے بہت سے اعداد وشمار اکٹھا کیے ہیں انہوں نے مختلف اداروں کی رپورٹوں خاص طور سے انسانی حقوق کمیشن کی دستاویزات سے استفادہ کیا اور پھر ان تمام معلومات کو پاکستان کے وسیع تر سماجی وسیاسی نظام کے سیاق وسباق میں رکھ کر اپنا تجزیہ مرتب کیا ہے۔

پاکستان میں مختلف حکومتوں نے اور ریاست کے اداروں نے خواتین کے حوالے سے کس قسم کی پالیسیاں وضع کیں، ان پالیسیوں میں کیا جھول تھا اور پھر حکومتوں کے اعلانات اور ان کی حقیقی کارکردگی کے درمیان فاصلوں کی نوعیت کیا تھی۔ اس کا بھی ذکر اس مضمون میں موجود ہے۔

'ذرائع ابلاغ کا صنفی رویہ' ایک اہم مقالہ ہے جس میں پاکستان کے اخبارات ورسائل اور الیکٹرانک میڈیا میں خواتین کی نمائندگی جو کہ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز ذرائع ابلاغ کا خواتین کی طرف جو رویہ رہا ہے اور ان کا جو امیج ان ذرائع ابلاغ نے پیش کیا ہے اس کا بھی محاکمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زاہدہ حنا نے ایک اور باب اردو ادب میں خواتین کے تصور پر رقم کیا ہے۔ اس میں ان کا مؤقف یہ ہے کہ ادب چونکہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر معاشرے کا عکاس ہوتا ہے لہٰذا معاشرے کی اقدار ہی بالعموم ادب میں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ اردو ادب کیونکہ بنیادی طور پر ہندوستان اور پاکستان کے پدرسری نظام میں تخلیق ہوا لہٰذا سماج کی پدرانہ قدریں ادب کے اندر بھی اظہار پاتی رہیں۔ چنانچہ خواہ وہ خاندان کا تصور ہو یا شرافت اور پاکیزگی کے تصورات، وہ اخلاق سے متعلق سوچ ہو یا نیکی وبدی کے معیارات، یہ سب چونکہ پدرسری نظام کے دائرے ہی میں متعین ہوئے تھے لہٰذا ہمارے ادب کا بیشتر حصہ انہیں قدروں کا پرتو پیش کرتا ہے۔ البتہ جب اس نظام سے بغاوت کی گئی اور ایک نئے نظام کے قیام کی جوت جگائی گئی تو ادب میں بھی اس بغاوت نے راہ پائی اور ہمارے سامنے ترقی پسند ادب کی شکل میں ایک نیا ادب سامنے آیا۔

کتاب کا ایک باب برصغیر کی تین اوّلین ادیب خواتین کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے زمانے میں تعلیم نسواں کا خواب دیکھا اور اس کے لیے اپنے طور پر جو کچھ وہ کر سکتی تھیں وہ کرنے کی

کوشش کی۔ یہ تین خواتین رشنا دیوی، رشید النساء اور رقیہ سخاوت حسین تھیں۔ زاہدہ حنا نے ان تینوں خواتین کے سماجی ماحول اور اس جکڑ بندی کا تفصیلی طور پر احاطہ کیا ہے جن کا ان کو سامنا تھا اور جن کا مقابلہ کر کے انہوں نے اپنے لیے اور ہندوستان کی ایک عام عورت کے لیے نئے راستے کھولے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان تین خواتین کے بارے میں عام طور سے بہت کچھ نہیں جانا جاتا اور نہ ہی ان کا ذکر مقبول خواتین کے ذکر کے دوران آتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک ایسا تحقیقی مضمون ہے جس میں تاریخ کے سو اصدی پہلے کے باب کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔

'تین اردو داستانوں کے نسائی کردار' ایک اور مضمون ہے جس میں ماضی کی اہم داستانوں کے کرداروں کا ان کے عہد کے تناظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ زاہدہ حنا درست لکھتی ہیں کہ اُردو داستان کے نسائی کردار' اپنے عہد کے مخصوص حالات اور تاریخی جبر کا اس طرح شکار تھے جس طرح اس عہد میں زندگی کرنے والی عورتیں۔'

'عورت زندگی کا زنداں' کا آخری باب 'زبان کے زخم' اب سے کوئی سات سات قبل لکھا گیا جس میں یہ دکھایا گیا کہ کس طرح ماضی میں ہمارے بہت سے مذہبی اور ادبی دانشور شعوری اور غیر شعوری طور پر ایسے خیالات اور ایسی زبان تحریر کرتے رہے جو صنفی امتیاز کی مظہر تھی۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے عورتوں کو ایک کم تر درجے کی مخلوق اور ایک تفریح کا ذریعہ بنا کر پیش کیا۔ زاہدہ حنا کے الفاظ میں:

> 'یوں عورت کا بدن صحیح النسب نسل کو جنم دینے اور تمام صلاحیتیں اسے پروان چڑھانے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ دوسری طرف فحش نگاری اور ابتزال نے عورت کو محض استعمال کی شے بنا کر رکھ دیا۔ اس کو شہوت کی پڑیا اور ڈال ڈال اڑتی ہوئی چڑیا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس حوالے سے میرؔ کی مثنویاں ہوں یا خواجہ میراثر کی، مرزا شوق کے اشہبِ قلم کا کمال ہو یا میر حسن کی جولانیٔ طبع، عورت ہو یا پری ہو، سب ہی عشق کے نام پر ہوس، معاملہ بندی اور چوما چاٹی کے دائرے میں قید ہیں۔'

زاہدہ حنا کا یہ مضمون انتہائی چشم کشا اور ذہنوں کو جھنجھوڑنے والا مضمون ہے۔ یہ مضمون اس لائق ہے کہ اگر ہمارے صاحبانِ دانش اور ماہرینِ نصاب روشن خیالی کا ثبوت دیں اور ہمارے

معاشرے نے منافقت کی جو چادر اوڑھ رکھی ہے اس سے باہر نکلنے کی ہمت کریں تو اس کو کم از کم بی۔اے کے نصاب میں ضرور شامل کرلیا جانا چاہیے۔اور نصاب ہی کی بات ہو رہی ہے تو شاید زیرِ نظر کتاب کے دیگر مضامین بھی اس اعزاز کے حق دار ہیں کہ ان کو نئی نسل کے مطالعے میں لایا جائے۔

بحیثیت مجموعی زاہدہ حنا کی یہ تصنیف ایک مستقل اہمیت کی حامل کتاب ہے۔کاش ہم اس کی اہمیت و افادیت کو سمجھیں۔اگر ہم ایسا کر پائیں تو یہ ہمارے اپنے حق میں بہتر ہوگا ورنہ زاہدہ حنا نے تو اپنا کام کردیا۔

عزت کے نام پر

تصنیف: طاہرہ ایس۔خان

ضخامت: ۳۸۷صفحات، قیمت:۵۵۰روپے

طابع: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی۔ سنِ اشاعت:۲۰۰۹ء

تبصرہ نگار: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

ہمارے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور جس کا اظہار کم و بیش سب شعبہ ہائے زندگی میں ہوتا ہے، اس کے وجود اور گوناگوں مظاہر سے ہم سب واقف ہیں۔یہ اپنی جگہ اتنا وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ کسی ایک کتاب میں کرنا ممکن نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے اور بے شمار کتابیں، ہزارہا مقالات و مضامین اور سینکڑوں رپورٹیں ان موضوعات پر مرتب ہو چکی ہیں اور یہ سب لٹریچر اپنی جگہ بڑا کارآمد اور مفید بھی ہے۔لیکن بالعموم ہمیں ایسی تحریریں پڑھنے کو نہیں ملتیں جن میں عورت کی معاشرتی حیثیت، اس کی پس ماندگی اور اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو کسی مربوط نظری سانچے کے پس منظر میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ڈاکٹر طاہرہ ایس خان کی زیرِ تبصرہ کتاب جو پہلے انگریزی میں شائع ہوئی تھی اور جس کو ۲۰۰۶ء کا اختر حمید خان میموریل ایوارڈ بھی مل چکا ہے، اس

ضرورت کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے لئے کئی سال تحقیق کی ہے اور پاکستانی معاشرے میں خواتین کی زبوں حالی کے بارے میں بالعموم اور عزت کے نام پر ہونے والے خواتین کے قتل کے واقعات کے بارے میں بالخصوص ایک فکری اور نظری سانچہ یا نظریہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ خان عزت کے نام پر ہونے والے قتل کے واقعات کی صرف تفصیل بیان نہیں کرتیں نہ ہی وہ ان کے فوری اسباب یا سماجی وسیاسی تناظر تک خود کو محدود رکھتی ہیں بلکہ وہ ان تمام زاویوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک قدم آگے جا کر خود عزت کے تصور کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ایسا کرنے پر یہ بات ان کے سامنے آتی ہے کہ عزت کا تصوّر بھی مختلف معاشروں اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس تصوّر کی تفہیم کے لئے مختلف نظری سانچوں اور فلسفوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ عزت کا تصوّر انسانی معاشرے کی مادّی اور سماجی نوعیت اور اسکے اقتصادی حقائق کے ساتھ گہرے طور پر جڑا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تاریخی مادیّت کا تصوّر کسی معاشرے میں عورت کے مقام اور حیثیت کو سمجھنے میں بہت معاون ہوسکتا ہے۔ وہ ازمنۂ قدیم سے عہد جدید تک کے معاشروں میں عزت کے تصوّر کے ارتقا کا اجمالی جائزہ لیتی ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ عزت کا تصوّر اور اس کے نام پر ہونے والا تشدّد کس قدر گہرے طور پر معاشرے کے سماجی ڈھانچے کے ساتھ مربوط ہے۔

طاہرہ شاہد خان اس حقیقت کا بھی انکشاف کرتی ہیں کہ عزت کے نام پر قتل کے واقعات صرف پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک ہی میں وقوع پزیر نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ان کی مثالیں باآسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے خاصی تحقیق کے بعد ان تفصیلات کو کتاب میں یکجا کیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ ہی پر کیا موقوف، آج کی جدید دنیا اور یورپ وامریکہ میں بھی عورتوں پر تشدّد کی دیگر شکلوں کے علاوہ عزت کے نام پر قتل کے واقعات بھی رونما ہوتے رہے ہیں۔

مصنفہ کا خیال ہے کہ عزت کا تصوّر معاشرے کی سطح پر جنم لیتا ہے، اور اس سے متعلق قدریں بھی اُس معاشرے کے مخصوص سماجی نظام پر اُستوار ہوتی ہیں، جبکہ یہ سماجی نظام وہاں کے نظامِ پیداوار پر اپنی بنیادیں رکھتا ہے۔ جہاں تک پیداوار کے نظام کا تعلق ہے وہ ذرائع پیداوار اور

پیداواری رشتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ چنانچہ ایک قبائلی یا فیوڈل یا پھر سرمایہ دارانہ معاشرے، ایک دوسرے سے مختلف قسم کے سماجی نظام کے حامل ہوتے ہیں اور نتیجتاً اُن کی قدریں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور اگر اُن کی قدریں اپنی جداگانہ بنیاد رکھتی ہیں تو اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ اُن کا عزت کا تصوّر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔

مصنفہ وضاحت کرتی ہیں کہ قدیم اور عہد وسطیٰ کے معاشرے اور اُن کی اقدار اُن اُدوار کے آلات و اوزارِ پیداوار اور پیداواری رشتوں کا حاصل تھے۔ لہذا خاندان، شادی، وراثت وغیرہ کے معاملات معاشرے کے سماجی و اقتصادی حقائق سے براہ راست طور پر متاثر اور متعین ہوتے تھے۔ مصنفہ دنیا کے مختلف ملکوں اور سماجی اور قانونی نظاموں کے اندر رہنے والی عورتوں کی حیثیت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ قانون دراصل افراد کے سماجی کردار اور موجود نظام کو تحفظ فراہم کرنے کا وسیلہ بنتا ہے اور جہاں تک اُس معاشرے کے سیاسی ڈھانچے کا تعلق ہے ان سب سیاسی ڈھانچوں نے معاشرے میں موجود صنفی تقسیم محنت کو مستحکم کیا ہے۔ خود عورت کے سیاسی کردار کا یقین بھی اسی تناظر میں ہوا۔ اگر کسی ملک میں خاتون کو کوئی اہم سیاسی منصب حاصل ہو جائے یا خواتین کو سیاسی اداروں میں نمائندگی دے دی جائے تو اس سے لازماً یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ اُس معاشرے کی ماہیت میں کوئی بڑی تبدیلی آگئی ہے یا ان عوامل کی بنا پر آجائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ چند خواتین کے، سیاست و اقتدار میں اہم مقامات تک پہنچ جانے سے نہ تو معاشرے بدل جاتے ہیں اور نہ ہی خواتین کی حیثیت میں کوئی نوعی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ایک معاشرے میں بنیادی طرز کی تبدیلی صرف سماجی نظام کے تغیرات اور پیداواری رشتوں کے بدلنے ہی سے ممکن ہوسکتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو سیاسی نظام اور اُس میں دی جانے والی خواتین کے لئے رعایتیں محض دکھاوے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مذکورہ بالا نظری خاکے کو بنیاد بناتے ہوئے ڈاکٹر طاہرہ خان خواتین کے حقوق کے لئے مصروفِ عمل تنظیموں کے طرز فکر اور اُن کے تجویز کردہ راستوں کا تنقیدی جائزہ لیتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ خواتین کے مسائل کو عام طور سے قانون سازی، خواتین کے اندر اُن کے مسائل کے بہتر شعور کو فروغ دینے اور اُن کی زیادہ سے زیادہ سیاسی شمولیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔

مصنفہ کا خیال ہے کہ تلافی کی یہ سیاسی و قانونی کوششیں صرف ایک محدود حد تک خواتین کے سماجی کردار اور حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ عورتوں کے خلاف تشدّد بنیادی طور پر سماجی ساخت کا پروردہ ہے۔ اور سماج کی مادّی بنیادوں کو تبدیل کئے بغیر اس سے گلو خلاصی ممکن نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تاریخی مادیت کے نقطہ نظر سے موجودہ نظام ایک کردار عورت کے لئے اور ایک دوسرا کردار مرد کے لئے مختص کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عورت ہی نہیں مرد بھی آزاد نہیں ہے۔ اور ان دونوں کی آزادی تب ہی ممکن ہے جب موجود نظام کو تبدیل کیا جائے۔

ڈاکٹر طاہرہ خان جو اس سے پہلے کئی علمی اور تحقیقی مقالے تحریر کر چکی ہیں، اپنی ماضی کی تحریروں کی طرح اس کتاب میں بھی بنیادی مواد پر انحصار کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ذاتی انٹرویوز کو بھی اہمیت دی ہے۔ اور بہت سی ایسی خواتین سے بالمشافہ ملاقات کر کے معلومات حاصل کی ہیں جو ذہنی اور جسمانی تشدّد کا شکار بنیں۔ انہوں نے مختلف مکاتب فکر کے دانشوروں اور علماء سے انٹرویو کئے۔ جن سے حاصل کردہ معلومات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے نتائج فکر قارئین کے لئے مرتب کئے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اُن کی کتاب واقعی اختر حمید خان ایوارڈ کی مستحق تھی۔

پاکستان میں کسانوں کی تاریخ کا ایک اہم باب

پٹ فیڈر کسان تحریک

تحقیق و تصنیف: محمد رمضان

صفحات: ۱۹۴، قیمت: ۱۵۰ روپے

بھنڈار ہاری سنگت، حیدر آباد (سندھ)

پری خانہ

واجد علی شاہ اختر

تاجدار اودھ جان عالم واجد علی شاہ اخترؔ کے حرم سرا کی خودنوشت داستان، جس کو فارسی کے ایک نایاب قلمی نسخے سے ترجمہ کیا گیا۔

ترجمہ:

تحسین سروری

تعارف

'پری خانہ' واجد علی شاہ کی ایک ایسی تصنیف ہے کہ جس کا تعلق ان کی ذات اور نجی زندگی سے ہے۔ اس میں عورتوں سے عشق و محبت کی داستانیں ہیں اور کہیں کہیں تاریخی واقعات۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی مدد سے ہم اودھ کے دربار اور اس عہد کے جاگیردارانہ سماج میں عورت کے مرتبے اور اس کی حیثیت کا تعین کر سکیں گے۔

اوّل، جاگیردارانہ معاشرے میں عورت کا سماجی مقام گر جاتا ہے۔ اس کی حیثیت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ جائیداد کے لیے جائز وارث پیدا کرے۔ اس جائز وارث کی پیدائش کی وجہ سے اس پر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں، اسے پردے میں رکھا جاتا ہے، اس کے کردار کی نگہداشت کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ دنیا سے کٹ کر محل کی چار دیواری میں قیدی بن جاتی ہے۔

دوسری طرف مرد کو جس ذہنی اور جنسی تسکین کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے وہ طوائف کے ڈیرے کا رخ کرتا ہے۔ طوائف مرد کی ان خواہشات کو پورا کرتی ہے اس لیے اس کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ رقص، موسیقی، ادب اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کر لیتی ہے۔ طوائف کا کردار اس قدر اہم ہو جاتا ہے کہ مرد کو اس کی قربت کے لیے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور طوائف اپنے ناز و ادا اور غمزوں سے اسے اپنے قدموں میں گرا رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں طوائف آزاد، خودمختار اور اپنی مرضی سے انتخاب کرنے والی ہوتی ہے۔ مرد کی حیثیت اس کی نظر میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اسے کس قدر دولت و تحفے تحائف دیتا ہے۔

دوسری جانب محلات میں بیگمات شوہر کی غلام ہوتی ہیں، اور شوہر کی خوشنودی کی خاطر اس کو خوبصورت عورتیں بھی پیش کرتی ہیں۔ ایسے ماحول میں لڑکے ابتدائی عمر سے عورتوں کی قربت میں رہتے تھے، جب کہ واجد علی شاہ نے لکھا ہے کہ ۸ برس کی عمر سے انہیں عورتیں ستانے لگی تھیں۔ یا ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی تھیں۔

ان عورتوں میں بڑی تعداد ملازماؤں، خواصوں اور خدمت کرنے والیوں کی ہوتی تھی۔ مرد کی خوشنودی اور قربت کے لیے یہ تمام طریقوں کو استعمال کرتی تھیں۔ ان میں جہاں ناز و ادا اور نخرے ہوتے تھے، وہیں وہ اپنے جسم کو بھی استعمال کرتی تھیں کیونکہ ایک عورت جس کی سماج میں کوئی حیثیت نہ ہو، اسے مرد کی خوشنودی حاصل کر کے اور اس کے ذریعے اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے اور کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی ہے۔

واجد علی شاہ نے 'پری خانہ' میں پریوں سے اپنے عشق و محبت کے بارے میں دلکش انداز میں لکھا ہے۔ وہ ایک عورت پر عاشق ہوئے ہیں اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کو بھول کر دوسری عورت کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں، انداز ایسا ہے کہ جیسے ان کا عشق بڑا سچا اور گہرا ہے۔ مگر ان کے نزدیک عورت کی کوئی حیثیت نہیں، وہ ایک ایسی شے ہے کہ جسے استعمال کے بعد ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ سونے پر سہاگہ کہ وہ خود تو عشق میں مبتلا ہوتے ہی ہیں، مگر انہیں یہ خوش فہمی بھی ہوتی ہے کہ وہ بھی ان کی محبت کی اسیر ہے۔ یہ ان عورتوں کی محبت نہیں، مجبوری اور ضرورت تھی کہ وہ ان کی خوشنودی کے لیے ان حربوں کو استعمال کرتی تھیں۔

لہٰذا اودھ کے اس جاگیردارانہ معاشرے میں طوائف، بیگم اور ملازم عورتیں اپنے اپنے کردار میں نظر آتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے 'پری خانہ' کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے سماج میں عورت کی حیثیت کے بارے میں کافی معلومات مل سکتی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

دیباچہ

مولانا مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جو ہندوپاک کے صاحبِ علم وفضل بزرگوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور جو مختلف علوم وفنون خاص کر تاریخ وسیر کی بے شمار کتابوں کے مصنف و مؤلف کی حیثیت سے اردو میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں، میرے خاص عنایت فرماؤں میں سے ہیں۔

ایک روز میں نے موصوف کے پاس اوسط حجم کی ایک قلمی کتاب دیکھی، جو جدید الخط ضرور تھی، لیکن صاف اور عمدہ طرز میں لکھی ہوئی تھی۔ میں نے کتاب لے کر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ فارسی زبان کا ایک نایاب نسخہ ہے اور اس کا نام 'پری خانہ' ہے اور اس کے مصنف تاجدار اودھ جانِ عالم واجد علی شاہ اختر ہیں۔

جیسے جیسے میں کتاب کو پڑھتا گیا، میری دلچسپ میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال میرے ذہن میں آیا کہ اس کتاب کو بہ اعتبار موضوع اردو زبان میں ہونا چاہیے تھا اور خود واجد علی شاہ اختر کا تعلق اردو زبان وادب سے جو رہا ہے، اس لحاظ سے بھی ان کی یہ یادگار تصنیف اردو ہی میں ہوتی۔ میں نے اس بات پر کافی غور کیا کہ آخر واجد علی شاہ کو اسے فارسی میں لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی ہوگی۔ لیکن کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی، سوائے اس کے کہ ان کی یہ ایک شاہانہ ترنگ تھی۔

واجد علی شاہ اختر کے سوانح نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کی فارسی قابلیت کی بڑی تعریف کی ہے۔ چنانچہ کتاب 'پری خانہ' کے دیکھنے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب محض ان کے ذاتی اور نجی معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ساز وسامان، زیور ولباس، نشست وبرخاست کے الفاظ، آداب وتعظیم کے کلمات اور محاورات واصطلاحات فارسی نسخے میں سب کے سب وہی استعمال کیے گئے ہیں جو اس وقت عام طور پر لکھنؤ اور خاص کر شاہی محلات میں

مروّج تھے۔ اس لیے لازمی طور پر اس کتاب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فارسی نثر کا مزاج قطعی غیر ایرانی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صرف افعال وضمائر فارسی ہیں باقی کا حصہ اردو ہے، یہی وجہ ہے کہ مجھے ترجمہ کرتے وقت زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے یہ بات جانِ عالم کی فارسی قابلیت کو کم بتانے کے لیے نہیں کہی بلکہ اس کتاب کی یہ خصوصیت مصنف کی غیر معمولی صلاحیتوں کی نشاندہی کرتی ہے، کسی بدیسی زبان میں دیسی خصوصیات کو سمودینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

تاریخوں اور تذکروں میں واجد علی شاہ کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، لیکن ان کی اس کتاب کا بہت کم ذکر آیا ہے، غالباً ہمارے مؤرّخوں اور تذکرہ نگاروں کے جذبہ ملّی اور غیرت قومی نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی اس نجی تصنیف کو جو محض واردات عشق ومحبت سے تعلق رکھتی ہے، منظرِ عام پر لایا جائے اور اس طرح وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے رہے کہ انگریزوں نے جو ان کی عیش پرستی اور امور ریاست سے غفلت کا چرچا کیا ہے، اس کی تکذیب ہو جائے گی، حالانکہ یہ طریقہ انتہائی غلط تھا، تاریخ بہرحال ہر شخص کو اس کے اصلی روپ میں پیش کر کے ہی رہتی ہے۔

میں نے 'پری خانہ' کے متعلق داخلی معلومات کے علاوہ کچھ خارجی مواد بھی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی، البتہ مولوی نجم الغنی خاں رام پوری کی تاریخ اودھ (جلد پنجم) کے دیکھنے سے ایک نئی چیز کا انکشاف ہوا، انہوں نے واجد علی شاہ کے 'پری خانہ' کا بڑا تفصیلی تذکرہ قلم بند کیا ہے، اور سارے حالات انہیں واجد علی شاہ کی ایک مثنوی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی مؤلف تاریخ اودھ نے جگہ جگہ مذکورہ مثنوی کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہوتی ہے، ان اشعار میں بڑی روانی اور برجستگی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف اس مثنوی کی تصنیف میں بے پناہ خلوص اور شاعرانہ کمالات کو کام میں لایا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ واجد علی شاہ نے جب 'پری خانہ' کو فارسی نثر میں تحریر کر لیا تو انہیں اس کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کا خیال آیا ہوگا، لیکن افسوس کہ اس مثنوی کے متعلق مجھے کچھ تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں اور یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک دلچسپ انکشاف ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'پری خانہ' اور نجم الغنی کے بیانات میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً

واجد علی شاہ نے 'پری خانہ' میں اپنی ایک محبوبہ ننھی بیگم کو انشاء اللہ خاں انشا کی نواسی بتلایا ہے، لیکن تاریخ اودھ میں انشاء کی بیٹی تحریر ہے۔ اسی طرح 'پری خانہ' میں واجد علی شاہ نے لکھا ہے کہ جب وہ آٹھ برس کی عمر کے تھے تو رحیمن نامی ایک چہل سالہ عورت نے ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ لیکن نجم الغنی نے یہ واقعہ پانچ سال کی عمر کا بتایا ہے لیکن ہم واجد علی شاہ ہی کے بیانات کو صحیح تسلیم کریں گے۔

اس کتاب میں مندرجہ واقعات کے ساتھ اگر تاریخ وسن کی بھی صراحت ہوتی تو شاید اس کی قدر وقیمت میں مزید اضافہ ہوتا۔ لیکن چونکہ مصنف کا مقصد اس کو تاریخی کتاب بنانا نہیں تھا اور اس کے علاوہ ہر واقعہ رونما ہوتے ہی فوراً قلم بند نہیں کیا گیا، بلکہ آٹھ سال کی عمر سے ۲۶ سال کی عمر تک وہ جن واردات عشق و واقعاتِ ہجر و وصال سے دوچار ہوا تھا، انہیں کافی مدت بعد محض حافظے کی مدد سے چند ماہ میں مرتب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے تسلسل میں بھی کچھ خلل واقع ہو گیا ہے، چند ایک مقامات پر جو تاریخی حوالے ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

- واجد علی شاہ کی ۱۵ر شعبان ۱۲۵۳ھ کو علی نقی خاں ابن شریف الدولہ بن مدار الدولہ کی دختر سے شادی ہوئی۔
- ۱۲۵۵ھ میں اعظم بہو صاحبہ نواب خاص محل کے بطن سے دوسرا فرزند مرزا فلک قدر بہادر تولد ہوا۔
- ایک دفعہ واجد علی شاہ سوزاک کے مرض میں سخت مبتلا ہوئے، علالت کے زمانے میں پریوں اور بیگموں نے بڑی بے اعتنائی اور بے پروائی کا سلوک کیا تھا یہ واقعہ ۱۲۶۵ھ کا ہے۔
- فضہ حبشن کے بطن سے واجد علی شاہ کی جو دختر جہاں آرا بیگم تھی وہ تین سال کی عمر میں ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ کو فوت ہوئی۔

واجد علی شاہ کی تخت نشینی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں ہوئی، اس کے دو سال بعد یعنی ۱۲۶۵ء میں کتاب پری خانہ تصنیف ہوئی۔ اس دوران میں بے شمار ملکی و سیاسی حالات ایسے پیدا ہوئے جن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امورِ ریاست سے متعلق اس کتاب میں ایک لفظ بھی نہیں۔ اگر ضمناً کوئی ایسی بات ضبطِ تحریر میں آ گئی ہے تو وہ اتنی اہم نہ ہو گی کہ ہم اس سے تاریخی مواد کا کام لے سکیں۔

تخت نشینی کے پہلے ہی سال یعنی ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈ نگ گورنر جنرل لکھنؤ آ کر واجد علی شاہ کے شاہی مہمان ہوئے تھے، ان کے لکھنؤ آنے سے قبل استقبال کے لیے واجد علی شاہ کانپور تک بڑے شاہانہ کرّ و فر کے ساتھ گئے۔ ان کے کانپور تک جانے اور لارڈ ہارڈ نگ سے ملاقات کرنے کے تمام واقعات تواریخ اودھ (جلد پنجم) اور مولانا عبدالحلیم شرؔر مرحوم کے دیباچے 'حزن اختر' میں پڑھنے کے لائق ہیں۔ واجد علی شاہ کا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وہ اپنی چند بیگموں کی بے وفائی اور ناروا سلوک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، چنانچہ 'پری خانہ' میں ان کے سفر کانپور کا ضمناً یوں ذکر ملتا ہے:

'چندروز بعد قیصر بیگم صاحبہ کی سفارش پر میں نے حضرت بیگم صاحبہ کا قصور معاف کیا اور انہیں رتبۂ اعلیٰ پر سرفراز کیا۔ اسی دوران میں لارڈ صاحب کی ملاقات کے لیے کانپور کا سفر اختیار کیا، تمام محلات روزانہ میری خیریت معلوم کرواتی تھیں۔ لیکن نئی بیگمات میں سے ایک نے بھی مجھے نہیں پوچھا۔'

کانپور سے واپسی کے چار دن بعد لارڈ ہارڈ نگ لکھنؤ آئے اس موقع پر بڑی شاندار ضیافتیں ہوئیں اور سارے شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، واجد علی شاہ اور لارڈ ہارڈ نگ میں ریاست کے نظم ونسق اور داخلی امور پر بڑی اہم بات چیت ہوئی، لیکن پری خانہ میں اس واقعے کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔

یہ چند ایک ایسے واقعات ہیں جن کی وجہ سے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ دراصل واجد علی شاہ کو ریاست اور امورِ ریاست سے کوئی دلچسپ نہیں تھی بلکہ وہ صرف ناچ گانے اور پریوں اور بیگموں کے ناز و اغماض میں کھوئے ہوئے تھے، لیکن میرے خیال میں ایسا قیاس کرنا واجد علی شاہ کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ 'پری خانہ' ان کی صرف نجی زندگی سے متعلق تصنیف تھی اور اس میں بھی اس کا ایک خاص موضوع تھا۔ اس لیے اگر اس میں اِدھر اُدھر کے واقعات بھی درج ہو جاتے تو شاید اس کی اب جو خصوصیت ہے وہ باقی نہ رہتی اور یہ کتاب مختلف واقعات کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی۔ مصنف کا تو یہ کمال ہے کہ اس نے کتاب کو جس موضوع کے لیے مخصوص کیا ہے آخر تک اس کو برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'پری خانہ' واجد علی شاہ کی سوانح عمری کا ایک ایسا دلچسپ باب ہے جس کو سوائے واجد علی شاہ کے کوئی اور اتنی عمدگی سے تحریر نہ کرسکتا تھا۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جنسی مریض کی داستانِ ہجر و وصال ہے، جو بادشاہ ہونے کے باوجود حالات وخواہشات کا غلام اور ایک مجبور و بے بس انسان ہے تو یہ ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ایک تخت وتاج کے مالک کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے واجد علی شاہ اختر کی یہ تصنیف بڑی اہم ہے۔ اور ان کے کردار کے بہت سارے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔

شاہِ اودھ کی بیگمات ومحلات کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان کے القاب وخطابات بھی اتنے پُرشکوہ ہیں کہ وہ معزز وممتاز خاندانوں کی خواتین معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن غالباً 'پری خانہ' ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے ذریعے سے ان بیگمات ومحلات کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں۔

مثنوی 'حزن اختر' میں جن بیگمات کا تذکرہ ملتا ہے ان میں سے بیشتر کے نام 'پری خانہ' میں بھی ملتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ تر اپنی سابقہ زندگی میں شاہدانِ بازاری تھیں۔

توقع ہے کہ واجد علی شاہ اختر کی اس یادگار تصنیف کے ترجمے کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

تحسین سروری
۹ مئی ۱۹۵۸ء۔ کراچی

پہلا باب

معلوم ہونا چاہیے کہ خداوندِ عالم نے ہر آدمی کو عشق کی لذت عنایت فرمائی ہے اور ہر ذی روح کو اس گلشن ہمیشہ بہار میں نشو و نما بخشی ہے، چنانچہ میرا خمیر بھی اسی آب و گل سے اٹھا ہے اور یہ دردِ جگر روزِ اوّل سے میرے حصے میں آیا ہے، لہٰذا میں اپنی داستانِ عشق و محبت جو اوائل عمر سے اس وقت تک گذری ہے تحریر کر رہا ہوں، اس وقت میری عمر کا چھبیسواں سال شروع ہے اور میں اس دشتِ پُر فضا کی بہت کچھ سیریں کر چکا ہوں۔

تصویر یار دل میں ہے گو منہ پہ وہ نہیں
اختر خدا کا شکر صنم خانہ رہ گیا

رحیمن

جب میری عمر آٹھ برس کی تھی، رحیمن نام کی ایک عورت میری خدمت کے لیے مامور کی گئی۔ رحیمن کی عمر کوئی پینتالیس سال کی تھی۔ وہ ہر وقت میری خدمت میں حاضر رہتی ___ ایک دن جب کہ میں سو رہا تھا اسنے مجھ پر قابو پالیا اور مجھے چھیڑنے لگی۔ چونکہ میں ابھی بچہ تھا، اس لیے مارے ڈر کے میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اس عورت نے مجھے روک لیا اور یہ کہہ کر ڈرایا کہ میرے استاد اور تالیق سے مجھے سزا دلائے گی۔ میں پریشان تھا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا، اس روز کے بعد سے اس کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیا کرتی!

میں جب دس برس کا ہو گیا تب بھی رحیمن کا دستور اسی طرح جاری تھا۔ اس کے بعد خدا جانے وہ کہاں چلی گئی، مجھے کچھ یاد نہیں۔

چونکہ شروع سے عشق کے معاملات سے مجھے رغبت رہی ہے اس لیے اکثر عاشق صادق کے حال پر میں افسوس کرتا ہوں اور بے رحم معشوقوں کو برا بھلا کہتا ہوں۔

امیرن

اسی زمانے میں جناب معظمہ و مکرمہ والدہ صاحبہ مدظلہا العالی کی خدمت میں امیرن نام کی ایک

عورت ملازم تھی، اس کی عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہوگی، گندمی رنگ، چھریرا بدن، اس کی بائیں آنکھ کی پتلی میں سفید تل تھا، وہ ہمیشہ رنگ دار کپڑے پہنے رہتی تھی، تا کہ دیکھنے والوں کو خوب صورت معلوم ہو۔ یہ عورت چال چلن کی اچھی نہ تھی، اکثر مردوں کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار کر کے ناز و غمزہ کے کرتب دکھانا اسے خوب آتا تھا، ہمیشہ وہ چار روپے مشاہرے پر نوکری کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود عیش و عشرت کی زندگی گذارتی تھی۔ دراصل کچھ ناجائز آمدنی سے اپنی آرائش و زیبائش کا خرچ پورا کرتی تھی۔

ایک روز میرے سارے عزیز نصیرالدین حیدر بادشاہ خلد منزل کے ہاں مناجان کے ختنہ کی تقریب میں گئے ہوئے تھے، جب دیکھا کہ سارا گھر خالی ہے اس عورت نے جب کہ میں بستر پر محوِ خواب تھا، رات کے وقت میرے نزدیک آ کر مجھے اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ میری طبیعت بھی پہلے سے اس کی طرف کچھ مائل تھی، اس لیے اس کی اس بے تکلفانہ حرکت پر مجھے غصہ نہ آیا بلکہ اپنے کو محوِ خواب ظاہر کیا تا کہ اس کے جذبات ٹھنڈے نہ پڑ جائیں، اس طرح میں دل ہی دل میں اس کے دلی جوش اور ولولوں کا لطف اٹھاتا رہا، اگر چہ میں اس وقت اس کے بے جا نازنخروں کو خاطر میں نہ لایا لیکن گیارہ برس کی عمر تک وہ میرا مرکزی خیال بنی رہی۔

بنو صاحب

جب میری عمر گیارہ برس کی ہوئی تو میں ہر حسین عورت کو محبت بھرے جذبات سے دیکھتا اور کوشش کرتا کہ وہ میرے مطلب کو سمجھے، اس طرح میں اپنی ہر منظورِ نظر عورت کی دل ستاں اداؤں سے لطف اندوز ہوتا۔ اسی زمانے میں ایک عورت مسمی بنو صاحب جس کا باپ حبشی تھا اور اس کا نام غالباً شیدی سلطان تھا اور ماں ہندوستانی تھی۔ میری والدہ ماجدہ کے یہاں مغلانی کے عہدے پر مامور تھی، یہ عورت شادی شدہ اور اس کے میاں کا نام مرزا جان تھا، میں چند دنوں سے اس کے دامِ محبت میں گرفتار تھا اور اس کے وصل کا خیال دل میں سمایا ہوا تھا۔ لیکن یہ ایک امر محال تھا۔

چونکہ وہ عورت فہمیدہ اور عصمت مآب تھی، اس لیے بڑی ترکیب سے مجھے خوش کر کے ٹال دیتی۔ آخر کار میں نے اسے دوگانہ کے لفظ سے ملقب کیا اور ہر روز محض تعلق خاطر کی بنا پر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا اور اپنا دل بہلایا کرتا، اس ارتباط و رسم و راہ دوستی کا مقصد بے لوث محبت کے

سوائے کچھ نہ تھا۔

بنو صاحب کی عمر تئیس یا اس سے کچھ ہی زیادہ تھی، سیاہ فام، میانہ قد، سڈول جسم، ہونٹ اور دانت خوبصورت، بھوؤں کے بال کسی قدر کم، آنکھوں میں شرارت آمیز شوخی، ستواں ناک، سر کے بال کسی قدر گھونگھریالے، ہاتھ اور پاؤں متناسب اور انگلیاں نرم تھیں۔ وہ کسی قدر پڑھی لکھی بھی تھی۔ قرآن شریف اور اردو کی آسان کتابیں بے رکے پڑھ سکتی تھی۔ سینے پرونے میں طاق تھی۔ گنجفہ[1] کھیلنا بھی جانتی تھی اس کے ساتھ ہی صاحبِ عصمت بھی تھی۔

جناب والدہ معظّمہ و مکرمہ کی وہ بہترین رفیق تھی، اس کا ایک بھائی اور چار بہنیں تھیں، بھائی کا نام شیدی احمد تھا جس کے پاس اب وزیرن نام کی ایک طوائف ہے جو قبل ازیں نصیرالدین حیدر بادشاہ کے ہاں گانے والیوں میں نوکر تھی اور مجھ سے بھی اس کی ملاقات تھی، لیکن اب شیدی احمد کے گھر پڑی ہے اور اس سے کچھ ناراض بھی رہتی ہے۔

مختصر یہ کہ بنو صاحب کی چار بہنوں میں سے ایک کا نام حاجی خانم تھا جو کہ بنو صاحب سے چھوٹی اور شادی شدہ تھی، وہ ایک دن مہمان کی حیثیت سے اپنی بہن بنو صاحب کے ہاں جناب والدہ صاحبہ معظّمہ کے مکان میں آئی ہوئی تھی۔

حاجی خانم

برسات کا موسم اور ساون کا مہینہ تھا، میں اپنی دادی مریم مکانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک عورت جس کی عمر بائیس برس کی تھی، صورت سے شوخ و طرار معلوم ہوتی تھی، قد کسی قدر دراز، انگ انگ خوب صورت، بھوؤں کے بال ہلکے، بڑی بڑی اور رسیلی آنکھیں، نازک کمر، آنکھوں کی پتلیاں سبزی مائل اور ان میں سرمہ، لب و دنداں دل آویز، ہاتھ پاؤں متناسب، سر کے بال گھنگھریالے، لبوں پر مستی کی دھڑی، ہاتھوں میں مہندی کا رنگ رچا ہوا، کانوں میں زمرد کے بندے جن کی روشنی کی جھلک اس کے صاف و شفاف رخساروں پر پڑ کر ایک عجیب سا سامان تفریح فراہم کر رہی تھی۔ وہ سراسر عطر میں بسی ہوئی تھی، جس کی مہک سے شامِ جاں کو تازگی حاصل ہوتی تھی، پانچ سال کی

---

[1] ایک کھیل جو تاش کی طرح کھیلا جاتا ہے

عمر کے ایک بچے کو گود میں لیے ہوئے ایک خاص دلبرانہ انداز سے وہ آئی اور دادی صاحبہ کو ادب سے جھک کر سلام کیا۔

میں نے پہلی ہی نظر میں اس کے عشق کا تیر دل پر کھایا اور اسی وقت میرا سینہ الفت کی آگ سے یوں جلنے لگا جیسے حمام لکڑیوں کی آگ سے جلتا ہے۔ صبر کا یارا نہیں رہا شکیب کی طاقت سلب ہوگئی، یہاں تک کہ بنو صاحب کی یاد بھی دل سے محو ہوگئی، حقیقت یہ ہے کہ میں اس گل بہار آفریں کا دل سے شیدا ہوگیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا 'یا اللہ! کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں اس حور شمائل اور پری پیکر کے گلشن شباب کا طائر ہزار داستان ہوتا'

چونکہ میرے سارے اعزّہ نئی ہونے کی وجہ سے اس پر کڑی نگرانی رکھتے تھے اس لیے میرا کچھ بس نہ چلا۔ میں تو صرف اس کے جمال جہاں آرا کی دور ہی سے زیارت کرتا رہا۔

اسی طرح رات گذری اور دن نکل آیا، لیکن بے بسی کا وہی عالم تھا، چونکہ میں اسرارِ عشق سے واقف نہ تھا اسْ لیے اندر ہی اندر میری حالت خراب ہو رہی تھی، لیکن میں نے اپنے اس درد نہاں کا کسی کو علم بھی نہ ہونے دیا۔ آخر کار کچھ دنوں بعد حاجی خانم میرے حالِ زار سے آگاہ ہوگئی اور میری بے غرض محبت اس کے دل میں بھی جاگزیں ہوگئی۔

حاجی خانم کی ایک آتو[۲] امامی خانم نام کی تھی جو بے حد بدشکل عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس سال بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی اور اس عورت نے میری بہن کو پڑھایا تھا، اس کو حاجی خانم کے سلسلے میں پیغامبر مقرر کیا جس کی وجہ سے حاجی خانم کے تمام تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ مگر امامی خانم کو خود اپنے بارے میں خوش فہمی تھی اس درجہ بدصورت تھی، خود کو شکل وصورت کے معاملے میں یکتائے روزگار سمجھتی تھی چنانچہ اس نے اس کا بھی کچھ خیال نہ کیا کہ وہ حاجی خانم کی استانی ہے اور ہماری ہم راز ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ پر کمند عشق ڈالنے لگی، لیکن میں اس کے کسی فریب میں نہ آیا۔

میں اور حاجی خانم دکھاوے کے طور پر اس کی خاطر داری اور تواضع وتوقیر میں کوتاہی سے کام نہ لیتے اور وہ شیطان کی خالہ اپنے دل میں یہ سمجھے ہوئے تھی کہ میں فی الواقعی اس کے تیرادا کا گھائل

۲۔ استانی

ہوں اور اس کی فرقت میں رات دن ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ اس بات سے باخبر نہ تھی کہ۔

من در چہ خیالیم وفلک در چہ خیال

میں اپنے بزرگوں کا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ خاص کر اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان امور میں امامی خانم ایک موزوں عورت معلوم ہوئی، لہٰذا میں نے اور حاجی خانم نے مجبوراً اس بدشکل و بدنہاد عورت کی بے جا اطاعت کو اپنا شیوہ بنالیا۔

بعض اوقات یہ بدخو عورت کہا کرتی کہ میں حاجی خانم کی دوست اور رازدار ہوں، اس لیے میرا لحاظ کیا کرو، تم دونوں شرابِ عشق کے متوالے میری فرمانبرداری کے بغیر اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ الغرض ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرتا جس میں حاجی خانم کی محبت کی آگ سے میرا سینہ نہ پھنکا جاتا ہو۔ وہ بھی مجھ پر بری طرح گرویدہ تھی، عموماً ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ جب اپنے گھر جاتی تو میری جدائی کے غم میں رات دن روتی رہتی۔ اِدھر میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہو جاتا۔ لیکن مفارقت کا یہ رنج مجھے زیادہ نہ کھینچنا پڑتا تھا، اس لیے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے گھر سے جلد ہی واپس آجاتی۔

ہم دونوں لیلیٰ مجنوں جب کسی جگہ بیٹھتے تو آپس میں بڑی پُر لطف گفتگو ہوتی اور پیار محبت کی باتوں سے اپنے دل بہلایا کرتے، لیکن جس طرح حاجی خانم کی باتوں میں شیرینی ہوتی اسی طرح بعض وقت وہ تلخ کلامی پر بھی اتر آتی تھی جس سے میرے دل کو ٹھیس پہنچتی، کبھی کبھی وہ اپنے شوہر کا بھی ذکر کرتی، اس موقع پر میں رنجیدہ ہو جاتا لیکن اس کیفیت کو دیکھ کر روئے سخن بدل دیتی اور خلوص و محبت کی باتیں کر کے میرے دل کا غبار دور کر دیتی۔

بنو صاحب کے پاس ایک لونڈی الٰہی خانم نام کی تھی جو حاجی خانم کی بھاوج یعنی شیدی احمد کی حرم تھی، اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانے میں وہ بھی مجھ پر فریفتہ تھی ـــ مختصر یہ کہ تیرہ چودہ برس کی عمر تک حاجی خانم سے مجھے بے داغ محبت رہی۔ چونکہ وہ شوہر والی عورت تھی اور اس کا گھر فیض آباد میں تھا اس لیے ہمارے ہاں وہ زیادہ دن نہ ٹھہر سکی، جب وہ اپنے گھر جانے لگی تو اس نے مجھے ایک انگوٹھی اور ہاتھی دانت کی دو چار کنگھیاں دیں۔ تاکہ میں نشانی کے طور پر رکھوں، چنانچہ میں نے اس کی یہ نشانیاں بادل ناخواستہ قبول کیں اور اسے خدا کی امان میں دے کر رخصت کیا۔

شادی

جب میں پندرہ برس کی عمر کا ہوا تو میرے والدین کو میری شادی کی سوجھی، کافی سوچ بچار کے بعد تجویز یہ قرار پائی کہ دخترِ منیر الدولہ بہادر (جن کا اس وقت تاجدار بہو خطاب ہے اور میرے بھائی مرزا اسکندر حشمت بہادر کی بیوی اور میری چچی کی بیٹی اور میری نسبتی ہمشیرہ ہیں) سے نسبت قرار پائے، لیکن کسی وجہ سے میں نے یہ رشتہ منظور نہ کیا۔

بعدازاں سیف الدولہ بہادر کی لڑکی (سیف الدولہ گونڈہ بہرائچ کے چکلہ دار تھے) نظرِ انتخاب پڑی اور بات چیت بھی مکمل ہو چکی تھی، لیکن کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ شادی معرضِ التوا میں پڑی رہی۔

اس کے بعد میری ایک رشتے کی چچی وزیر صاحبہ بنتِ کلن کی دختر سے شادی قرار پائی (وزیر صاحبہ میری والدہ ماجدہ کی نسبتی بہن ہیں اور اب تک زندہ ہیں) وزیر صاحبہ نے دل سے یہ پیغام قبول کیا، لیکن ان کی لڑکی کو کوڑھ تھا اور انہوں نے ہم لوگوں سے یہ عیب چھپائے رکھا تھا، غرض یہ کہ رشتہ بھی ختم ہو گیا۔

آخرکار جانی خانم کے توسط سے جو کہ میری دادی انجمن النساء بیگم کی منہ بولی بیٹی اور ان دنوں مشاطّہ کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہے نواب علی نقی خاں مرحوم کی دختر نیک اختر سے نسبت کا پیغام دیا گیا، چونکہ یہ بڑا معزز خاندان تھا اس لیے مجھے بھی یہ رشتہ پسند آ گیا اور میرے والدین بھی اس رشتے سے بہت خوش ہوئے اور پندرہ شعبان المعظم ۱۲۵۳ھ کو مانجھے کی رسم ادا کی گئی۔ لیکن شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ میرے ہونے والی بیوی کی چچی سلطان بیگم کا انتقال ہو گیا اور ادھر میرے عمِ محترم اصغر علی خاں ناصر الدولہ بہادر خلف اکبر حضرت فردوس منزل و والد بزرگوار ممتاز الدولہ بہادر وفات پا گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری تقریب کتخدائی تاریخ معینہ پر نہ ہو سکی اور میں کامل دو ماہ تک مانجھے کے کپڑوں میں لپٹا رہا، جو زیادہ دن گذرنے کی وجہ سے میلے اور گندے ہو گئے تھے، اللہ اللہ کر کے دو ماہ گذرے، اس کے بعد رواج کے مطابق رسوم ادا ہوئے اور میرا عقد ہو گیا جس میں شان و شوکت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔

مجھ میں اور میری منکوحہ بیوی میں شروع کے پانچ مہینے تک محبت کا وہ ارتباط قائم رہا، جو میاں بیوی میں ہوتا ہے۔

حضرت فردوس منزل کی تخت نشینی

میری شادی ہو کر ابھی پانچ ماہ ہی گذرے تھے کہ نصیرالدین حیدر بہادر نے اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر عالمِ بقا کی راہ لی۔ اس کے بعد میرے دادا نصیرالدولہ بہادر فردوس منزل نے تخت نشین ہو کر عنان حکومت سنبھالی اور ہر شخص کو اس کے رتبے کے مطابق انعام وخطاب مرحمت فرمایا اور میرے والد محترم حضرت جنت مکان کو ولی عہدی کا خلعت سرفراز فرمایا۔ ہر چھوٹے بڑے کی معقول تنخواہوں سے عزت بڑھائی، لیکن مجھے اور میری زوجہ کو اپنی کسی عنایت سے متفخر نہ فرمایا۔

میرا مشاہرہ مقرر نہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت فردوس منزل مغفور بڑے عاقل وزیرک آدمی تھے، انہوں نے یہ سوچا کہ حضرت جنت مکان کے بعد میں ہی ریاست کو سنبھالنے کا اہل ہوں، غالباً اسی وجہ سے انہوں نے اپنی تخت نشینی کے وقت مجھے اپنا مورد عنایات بنانا پسند نہ کیا، بس یہی ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔

یہ حال دیکھ کر میرے والد ماجد ولی عہد بہادر ثریا جاہ حضرت جنت مکان نے اپنی جیبِ خاص سے میرا پانچ سو روپے اور میری بیوی کا چار سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا۔ اس خیال سے کہ میں کہیں افسردہ خاطر نہ ہو جاؤں۔

اس دوران میں، میں اپنے محل کی نوکرانیوں اور خادماؤں سے چھپ چھپ کر ہنسی مذاق کیا کرتا تھا، لیکن میری یہ حرکت میری بیوی کو ناگوار ہوتی تھی، چنانچہ انہوں نے چند نوکرانیوں کو نکال دیا اور میری نگرانی کے لیے معقول انتظام کیا۔ لیکن میں اپنی شوخیٔ طبع سے مجبور تھا، دن رات اسی قسم کے خیالات میں مستغرق رہتا تھا۔

مرزا نوشیرواں قدر بہادر کی پیدائش

والد ماجد حضرت جنت مکان کی ولی عہدی کا زمانہ گذر کر ایک سال ہوا، اس اثنا میں میرے ہاں نواب اعظم بہو صاحبہ کے بطن سے ایک فرزندِ ارجمند تولد ہوا جس کا نام مرزا نوشیرواں قدر بہادر ہے، میرے جدِ اعلیٰ حضرت فردوس منزل اس خبرِ فرحت اثر کو سماعت فرما کر بہت خوش ہوئے، اس خوشی میں مجھے اعلیٰ خلعت عنایت کیا اور ناظم الدولہ فخر الملک محمد واجد علی خاں بہادر صولت جنگ کے خطاب دیئے اور میرے فرزند کو مرزا نوشیرواں قدر بہادر کے نام سے ملقب کیا۔

میرے فرزند دل بند کو چونکہ مرزا نوشیرواں قدر بہادر کا خطاب ملا تھا، اس لیے اس کے دو تین ماہ بعد میرا خطاب بدل کر مرزا خورشید حشمت محمد واجد علی کے نام سے مخاطب فرمایا۔

مرزا فلک قدر بہادر کی پیدائش

مرزا نوشیرواں قدر بہادر کے پیدا ہونے کے بعد ۱۲۵۵ھ میں فرزند دوئم محل سابقہ کے بطن سے تولد ہوا۔ جس کا نام میرے جدامجد نے مرزا فلک قدر بہادر تجویز فرمایا، اس وقت میری عمر سترہ برس تھی۔

چونکہ ابھی میرے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا اور مجھ میں جوانی کا جوش وخروش اور طبیعت پُرشور تھی، اس لیے مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ شباب کا یہ عہد خوب صورت وخوش جمال عورتوں کی معیت میں گذاروں، لیکن کچھ ایسی رکاوٹیں تھیں کہ میں آزادانہ طور پر اپنی خواہشات کو پورا نہ کرسکتا تھا، آخر میں نے یہ ترکیب سوچی کہ میں تسکینِ قلب کے لیے عورتوں کو خادماؤں کی حیثیت سے ملازم رکھ کر خفیہ طور پر ان سے عشق ومحبت کے مراسم بڑھاؤں۔ اس راحت افزا تجویز سے دلِ بے قرار قابو میں آیا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے موتی خانم نام کی ایک عورت کو نوکر رکھا۔ چھریرا بدن، گندمی رنگ، بڑی اور خوب صورت آنکھیں، لمبی بھنویں، طبیعت میں چالاکی، مزاج میں گرمی، اس کی آنکھوں پر کچھ کچھ چیچک کے داغ تھے، وہ عورت قبل ازیں، مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے ہاں جلسہ والیوں میں ملازم رہ چکی تھی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ میں نے موتی خانم کو اپنے آرام اور اپنے دل کی مرادیں پوری کرنے کی خاطر ملازم رکھا تھا۔ لیکن میرا یہ عمل میرے محل کو سخت ناگوار گذرا اور انہوں نے بڑا اودھم مچایا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ موتی خانم اپنی ملازمت سے برطرف کردی گئیں اور میں جناب والد صاحب قبلہ کا معتوب ہوکر نظر بند کردیا گیا۔

موتی خانم سے محبت

اس واقعے کے بعد میں گوشہ نشین ہوگیا اور اپنی طبیعت کو شعر وشاعری کی طرف راغب کیا، اس کے باوجود دل کا غبار دور نہ ہوتا تھا، جناب والد صاحب قبلہ کی برہمی سے زندگی بے مزہ سے ہوکر رہ گئی تھی۔

جب میرا حال والد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی زبان سے یہ حکم صادر فرمایا کہ اس عورت کو بلا کر میرے حوالے کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ وہ اس گھر میں نہیں رہ سکے گی، بلکہ کسی اور گھر میں اتاری جائے اور وہ کبھی میرے سلام کو حاضر نہ ہوا کرے__ میں نے چونکہ یہ کہہ رکھا تھا کہ جب تک موتی خانم مجھے واپس نہ ملے گی میں کھانا پینا حرام سمجھوں گا، میرے خیال میں یہ حکمِ عالی اسی لیے سنایا گیا ہوگا۔

جیسے ہی حکمِ عالی نافذ ہوا موتی خانم کو میری خدمت میں حاضر کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ ماں باپ کی اطاعت کو دنیا کے جملہ امور سے افضل قرار دیا ہے۔ اس لیے میں نے اس عورت کو علیحدہ کر دیا، اور حضرت قبلہ کی خدمتِ اقدس میں عرض داشت پیش کی کہ یہ بندۂ بے دام بطور فرمان واجب الاذہان آپ کا تابع ہے اور یہ میری مجال نہیں کہ میں آپ کی رضامندی کے خلاف کوئی اقدام کروں۔

میری عرض سماعت فرمانے کے بعد ارشادِ عالی ہوا کہ تم موتی خانم کو خوشی سے الگ کر سکتے ہو۔

اس کے بعد میں نے موتی خانم کو اپنے سے جدا کر دیا۔ اس دن کے بعد سے کبھی بھول کر بھی میں نے اس عورت کا خیال نہ کیا۔ اگرچہ والد صاحب مرحوم داخلِ جنت ہو چکے ہیں اور ان کے بعد میں ریاست کا خود مختار بادشاہ ہوا اور جو میرا جی چاہے وہ کر سکتا تھا، لیکن جو وعدہ کر چکا تھا اس کو پورا کرنا ہے۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی، اسی زمانے میں مجھے فنِ شعر کا شوق ہوا اور اس عورت یعنی موتی خانم کی محبت میں غزلوں کے دو دیوان مرتب کیے اور تین مثنویات موزوں کیں، لیکن اپنے دل کی بے چینی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس آتشِ غم میں، میں اتنا جلا کہ مجھ میں جان نام کو رہ گئی تھی__ اس پُر الم واقعے کے بعد میں نے اپنے محل کی طرف کبھی التفات نہ کیا، جس کا انہیں بڑا رنج ہوا، کئی بار انہوں نے فکر مند ہو کر میرا حال پوچھا اور میری بے التفاتی کا سبب دریافت کیا، لیکن میں بالکل خاموش رہا اور ان کی ایک بات کا بھی جواب نہ دیا۔

چونکہ وہ بڑی زیرک اور فہمیدہ عورت واقع ہوئی ہیں۔ اصل بات کی تہہ کو پہنچ گئیں اور سمجھ گئیں کہ یہ سب کچھ خود انہیں کی حرکتوں کا نتیجہ ہے، اس کے ساتھ ہی انہیں محسوس ہوا کہ مجھے خوش رکھے

بغیر یا میری مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا کر خوش و خرم زندگی گذارنا محال ہے۔ چنانچہ مجھ سے خوشامدانہ انداز میں کہنے لگیں کہ 'اگر آپ کو میری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو مجھے اس کا افسوس ہے اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ہر طرح آپ کی رازدار رہوں گی، آپ کا جس کسی پر بھی دل آئے اس سے عشق کیجیے، میں ہرگز مزاحم نہ ہوں گی۔' چونکہ یہ عین میرے مطلب کی بات تھی، لہٰذا میں نے جواب دیا کہ اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو مناسب ہے۔

مرزا کیوان قدر بہادر

میرے محل کے بطن سے اسی زمانے میں میرا فرزند سوم متولد ہوا (جو اس وقت منصبِ ولی عہدی پر فائز المرام ہے) میرے جد امجد حضرت فردوس منزل نے دیکھا تو بہت مسرور ہوئے اور مرزا کیوان قدر بہادر خطاب مرحمت فرمایا۔

صاحب خانم سے عشق

اسی زمانے میں ایک گانے والی عورت مسمی صاحب خانم جو جناب قبلہ والد ماجد حضرت ثریا جاہ جنت مکان کے ہاں ملازم اور شادی شدہ تھی۔ اس عورت پر میری نظر پڑی۔ اس کی عمر کوئی بتیس یا کچھ زیادہ کی تھی، سرخ و سفید رنگ، پستہ قد، کشادہ دہن، چشم و ابرو جاذبِ توجہ، ہر وقت سر کے بال کھلے رہتے تھے جو اس کے شانو پر پڑے رہتے تھے (یہ اس کی ایک ادائے خاص تھی) بہت عمدہ گاتی بجاتی تھی اور گنجفہ بھی خوب کھیلتی تھی، وہ دو یا تین لڑکیوں کی ماں تھی۔

صاحب خانم سے مجھے عشق ہو گیا اور ادھر وہ بھی میرے عشق میں مبتلا ہو گئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ میری صورت کو دیکھے بغیر کبھی رات کو سو نہ سکتی تھی، وہ ہمہ وقت میرے ہی پاس بیٹھی ہوئی تاش کھیلتی رہتی یا گانے بجانے وغیرہ میں وقت گذار دیتی، میری تازہ ترین غزلیں بڑے شوق سے گایا کرتی تھی، ان میں سے ایک غزل کا مطلع ہے۔

پڑا ہے پاؤں میں اب سلسلہ محبت کا
برا ہمارا ہوا ہو بھلا محبت کا

میں روزانہ اسے روپیہ دو روپے دیا کرتا تھا جو کہ وہ دل سے قبول کرتی تھی۔ میرے لیے پان

کے بیڑے بنایا کرتی تھی۔ اتفاق سے اگر میں کچھ دیر کے لیے اسے دکھائی نہ دیتا تو وہ بے تاب ہو جاتی اور ہر طرف میری تلاش میں دوڑی دوڑی پھرتی، میں کبھی باہر ہوتا تو دروازے کے روزن سے مجھے پہروں دیکھتی رہتی، کبھی کوٹھے پر چڑھ کر مجھ سے آنکھیں لڑایا کرتی تھی، مختصر یہ کہ مجھے دیکھے بغیر ایک لحظہ بھی وہ گذار نہ سکتی تھی۔

اگرچہ میرے محل کو میرے اور صاحب خانم کے باہمی عشق ومحبت کی خبر تھی لیکن ہندی کی اس کہاوت کے بہ مصداق کچھ نہ کہہ سکتی تھیں۔

دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیئے

اس طرح وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر چپکی تھیں، بعض وقت تو میری خوشنودی کے لیے صاحب خانم کی تواضع اور مدارات بھی کیا کرتیں۔

صاحب خانم میری محبت میں اس قدر دیوانی ہوگئی کہ ایک روز اس نے میرے ستار کی سندری کھول کر آگ میں گرم کی، جب وہ انگارہ سی سرخ ہوگئی تو اپنی بائیں ران کو داغ دیا، اس طرح ستار کی سندری اس کی ران کے گوشت میں دھنس گئی، اس کے بعد وہ زخم کو مرہم پٹی کر کے بائیں پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی جب میں نے دیکھا کہ صاحب خانم لنگڑاتی ہوئی آرہی ہے تو میں پریشان سا ہوگیا کہ یا خدا اس کو یہ کیا ہوگیا ہے، جب وہ میرے قریب آئی تو بڑے دردانگیز لہجے میں کہنے لگی۔ 'افسوس مجھے آپ نے مرہم بھی عنایت نہ فرمایا' میں نے کہا 'تمھیں مرہم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟' اس پر اس نے جواب دیا کہ 'میں اپنی ران کے زخم پر لگانے کے لیے مانگ رہی ہوں، آپ اگر نامناسب نہ سمجھیں تو ذرا سا مرہم عنایت فرمائیں تاکہ میرا زخم مندمل ہو جائے۔' میں نے تجسس اور تحیر کی نظر سے دیکھا تو واقعی اس کی بائیں ران میں گہرا زخم تھا، جس سے اس کی بات کا یقین ہوگیا اس واقعے کے بعد ہم دونوں کا ربطِ محبت لیلیٰ مجنوں کی طرح قائم ہوگیا۔ یہ سلسلہ ایک سال تک رہا۔

مرتضیٰ بیگم کی ولادت اور وفات

جب میری عمر انیس برس کی ہوئی، میری زوجہ کے بطن سے پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام مرتضیٰ بیگم تجویز کیا گیا تھا، لیکن خدا کی مرضی ہی ایسی تھی کہ وہ صرف چالیس دن جی کر رحلت کر گئی، انہیں

دنوں کی بات ہے کہ جناب قبلہ والد صاحب حضرت ثریا جاہ نواب امجد علی شاہ تخت نشین سلطنت ہوئے۔ صاحب خانم سے میری ربطِ محبت کا بھی یہی زمانہ تھا۔

جب میرے محل کو میرے اور صاحب خانم کے ربط وضبط کی خبر ہوئی تو ایک دن مجھ سے پوچھا کہ آپ ' کا موجودہ شغلِ عشق آپ کے حسبِ مرضی ہوا یا نہیں، میں نے جواب دیا۔ 'تمہیں دوسروں کے معاملات سے کیا تعلق، میری قسمت میں جو کچھ ہے وہی ہوگا۔ البتہ میں اس وقت تمہارا احسان مند ہوتا، جب کہ تم کسی عورت کو میری ملاقات کے لیے منتخب کرتیں۔' میری بیوی بے حد عقل مند اور مزاج شناس عورت ہے، لہٰذا وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئیں کہ اب میری اطاعت و رضا کے بغیر کام نہیں چل سکتا، چنانچہ انہوں نے فوراً دوسری عورتوں کو ملازمت کے لیے بلانا شروع کر دیا۔

عمدہ بیگم سے عشق

میرے محل کے ہاں عمدہ بیگم نام کی ایک عورت آ کر ملازم ہوئی۔ یہ بڑی اچھی خاتون تھیں۔ ان کی عمر کوئی ۲۷ سال کی تھی۔ گورا رنگ، متناسب اعضا، تاش کھیلنے میں ماہر تھیں۔

اس سے قبل عمدہ بیگم نصیرالدین حیدر کے پاس آساميوں کے زمرے اور ڈولی والیوں میں ملازم تھیں۔ پھر نصیرالدین حیدر کے انتقال کے بعد گردشِ تقدیر نے انہیں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب میں نے عمدہ بیگم کو دیکھا وہ مجھے بے حد پسند آئیں، رفتہ رفتہ ان کی محبت نے میرے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ انہوں نے بھی میری محبت کا جواب اپنے ناز و اغماض سے دینا شروع کیا۔ پوشیدہ طور پر ان کا عشق مجھ سے کئی گنا زیادہ تھا۔

صاحب خانم اور عمدہ بیگم جب ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوگئیں تو دونوں میں رشک وحسد کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اور رات دن ایک دوسرے پر چوٹیں کیا کرتیں، ان کی باہمی منافرت یہاں تک پہنچ گئی کہ مجھے لامحالہ صاحب خانم سے ترکِ تعلق کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ صاحب خانم سے میرے تعلقات اس لیے بھی مناسب نہ تھے کہ وہ حضرت جنت مکان کی ملازمان میں سے تھی، نیز وہ ایک شادی شدہ عورت تھی جس کا شوہر موجود تھا۔

ننھی بیگم

اس وقت حضرت جنت مکان جناب والد صاحب قبلہ کے یہاں تین بہنیں ملازم تھیں۔ بڑی کا نام حیدری بیگم، منجھلی کا نام محمدی بیگم اور چھوٹی کا نام ننھی بیگم تھا۔ یہ تینوں بہنیں میر انشاء اللہ خاں کی نواسیاں تھیں اور جناب سیّد الشہداء صلوٰۃ اللہ علیہ کی ذاکرہ تھیں۔ ننھی بیگم کی شکل وصورت ہو بہو ایک عورت سے ملتی جلتی تھی جو پارہ والی سرفرازو کے نام سے مشہور تھی۔ سرفرازو ایک طوائف تھی جو کہ یہات کی رہنے والی تھی اور پارہ کی ٹھیکیدار بھی تھی، میں نے اسے فردوس منزل حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے زمانۂ حکمرانی میں اپنے برادرِ خورد مرزا اسکندر حشمت بہادر کی تقریبِ شادی میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میری عمر بھی قریب قریب اتنی ہی ہوگی۔ چونکہ اس زمانے میں وہ موسیقی میں کافی شہرت رکھتی تھی اور میں بھی بچپن سے رقص وسرود سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس واسطے میں اس کے کمندِ عشق کا اسیر ہو گیا لیکن نہ اس کے دل میں میری کوئی چاہ پیدا ہوئی اور نہ ہی میں اپنے بزرگوں کے ڈر سے اس کے نام کوئی پیغام بھیج سکا۔

مختصر یہ کہ جب حضرت جنت مکان کے ملازمین میں ننھی بیگم، پارہ والی سرفرازو کی ہم شبیہ معلوم ہوئی تو مجھے بڑی بھلی لگی، لیکن ننھی بیگم نے میری اس عنایت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ میرے عشق کو اس نے بازیچۂ اطفال سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔

کبھی مجھے تنہائی کا ایسا موقع مل جاتا جہاں ننھی بیگم بھی موجود ہوتی، تو میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ وہاں سے رفو چکر ہو جاتی اور شرارت سے مجھے کہتی کہ میں دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ فلاں وقت کہاں تھے، خیر چھوڑیئے یہ باتیں کسی اور موقع پر ہوں گی۔

عمدہ بیگم کی وجہ سے جب صاحب خانم کو علیحدہ کر دیا گیا تو وہ اپنی نافرمانی پر سخت شرمندہ ہوئی۔ دراصل اس سے چند ایسی حرکات سرزد ہوئی تھیں جو میری طبیعت کے عین خلاف تھیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ میں نے متعدد بار اس سے کہا کہ تیری دونوں لڑکیاں میرے پاس بڑی عمدگی سے رہیں گی تو اپنے شوہر سے طلاق لے لے اور میرے محل میں آجا۔ لیکن اس بدبخت نے کوئی دھیان نہ دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر میں نے اسے الگ کر دیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار ہی مجھے نظر نہ آیا۔ اس طرح چند اور وجوہ بھی اس کے ترک کرنے کا باعث ہوئے۔ وہ بدبخت عورت ابھی تک جیتی ہے اور میرے ہی ایک محل کی ملازموں میں ہے۔

صاحب خانم سے ترکِ تعلق کے بعد عمدہ بیگم سے مراسم محبت بہت زیادہ بڑھ گئے تھے، لیکن چپکے چپکے میں ننھی بیگم کے تیرِ عشق کا بھی گھائل تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ عمدہ بیگم کا عشق ننھی بیگم پر ظاہر نہ ہو اور ننھی بیگم جو میری مرکزِ توجہ بن رہی تھی اس کی اطلاع عمدہ بیگم کو نہ ہونے پائے۔ لیکن رموز و کنایات کے بروئے کار آنے کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کو خوب پہچان گئیں، ساتھ ہی یہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو صاحب خانم اور عمدہ بیگم کی باہمی رقابت سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن عمدہ بیگم اس بے پناہ محبت کی وجہ سے زیادہ گڑبڑ نہ کر سکیں، جو ان کے ساتھ مجھے تھی، اگرچہ اس دوران میں انہوں نے دو تین مرتبہ اسی جذبہ رُقابت کی بنا پر ملازمت ترک کرنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا۔ مگر میرے محل نے ان کی درخواست منظور کی نہ انہیں گھر جانے کی اجازت دی۔

دوسرا باب

تخت نشینی حضرت جنت مکان

جناب والد ماجد حضرت جنت مکان امجد علی شاہ بادشاہ نے آبائی تخت سلطنت پر جلوسِ اجلال فرمایا۔ میں خدا کے فضل و کرم سے منصبِ ولی عہدی سے سرفراز ہوا۔ اس کے بعد سے مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ عمدہ بیگم صاحبہ کو محل بنایا جائے۔ عمدہ بیگم نے فرمانبرداری اور میری خدمت گذاری سے میرے دل میں جگہ پیدا کر لی تھی اور ان سے مجھے اس درجہ محبت ہوگئی تھی کہ سوائے ایک پہر سونے اور جناب والد صاحب کی خدمت میں سلام کو حاضر ہونے کے میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کو دور نہ ہونے دیتا تھا، ہم دونوں کا عشق لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح کا تھا۔

جب اس عالم میں ننھی بیگم نے مجھے دیکھا تو خدا جانے کس وجہ سے مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ اس وقت ان کی یہی تمنا تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح انہیں بھی محل بنالوں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لالچی تھیں، ممکن ہے یہ خیال کیا ہو کہ ایسی دولت مند سرکار ہاتھ سے مفت کیوں جائے۔

ننھی بیگم صاحبِ عفت و پارسا عورت تھی، اس کے ساتھ ہی مرثیہ خواں اور ساتویں امام کی اولاد میں میر انشاء اللہ خاں کی نواسی تھی، اس کا رنگ گورا تھا۔ قد موزوں، بھویں باریک اور آنکھیں چھوٹی سی تھیں ـــــ اس کے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ تین سال کی ایک لڑکی بھی تھی۔ جس کا نام احمدی تھا۔

ننھی بیگم بیوہ ہونے کے بعد میری والدہ صاحبہ کے پاس مرثیہ خوانوں میں ملازم ہوئی۔ آخر کار مجھ سے اپنی محبت جتانے لگی اور اس بات کی آرزو مند ہوئی کہ اس کا مرتبہ بھی عمدہ بیگم کے مرتبے کو پہنچے، مگر عمدہ بیگم کا ستارۂ اقبال چرخ چہارم پر جلوہ افروز تھا، لہٰذا ننھی بیگم کا جادو کارگر نہ ہو سکا۔

عمدہ بیگم سے افزونی محبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص محل کے دل میں بھی رقابت کی آگ بڑھکنے لگی اور زمین و آسمان ان کی نظروں میں اندھیرے ہو گئے، لیکن ہندی زبان کی اس مثل کے مطابق 'دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر' عقل مندوں کا کام نہیں۔ وہ کچھ نہ کر سکیں۔

ادھر جواہرات اور پشمینہ سے بھری ہوئی کشتیاں، چاندی کے ظروف اور دیگر قیمتی اشیا عمدہ بیگم

صاحب کے واسطے تیار کیے جانے لگے، پھر میری ولی عہدی کے بعد عمدہ بیگم صاحبہ میری محل ہوگئیں اور خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحب کے خطاب سے ممتاز ہوئیں، ڈیڑھ ماہ تک نواب خورد محل کا ستارۂ تقدیر مہر جہاں تاب کی طرح سپہر اقبال پر روشن رہا، اس کے بعد یہ کہاوت صحیح ثابت ہوئی کہ 'چار دن کی چاندنی، پھر اندھیری رات ہے۔' ننھی بیگم جو خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحبہ کی طرف سے اپنے دل میں بغض رکھتی تھی، چاہتی تھی کہ میں کسی طرح نواب عمدہ بیگم کے دامِ محبت سے چھوٹ کر اسے اپنا محل بنالوں۔ بالآخر میں اس کے مکر کے جادو سے محفوظ نہ رہ سکا، اس نے میرا محل بننے کی خواہش میں مختلف حربے استعمال کیے اور مجھے آمادہ کرلیا۔

ایک دن چھتر والے مکان (جو بعد کو چھتر منزل کے نام سے موسوم ہوا) واقع کنارۂ دریائے گومتی کے، دریا کی طرف والے برج پر وہ چڑھ گئی اور اس کے بعد وہ اپنے کو دریا میں گرا دینا چاہتی تھی، لیکن میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ 'ایسی حرکت عین جہالت و بد دماغی کے سوا کچھ نہیں، یہ نہایت نازیبا حرکت ہے، اس سے سوائے اقربا میں رسوائی اور دنیا بھر میں بدنامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔' اس طرح میں نے اس کو اس خطرناک ارادے سے باز رکھا، اسی دوران میں اس کی لڑکی کا انتقال بھی ہوگیا۔

غرض یہ کہ خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحبہ کے محل ہونے کے ڈیڑھ ماہ بعد ننھی بیگم کو بھی میں نے محل بنالیا۔ نشاط محل نواب ننھی بیگم صاحبہ کا انہیں خطاب دیا اور تھوڑے سے زر و جواہر اور کچھ ملبوسات دے کر انہیں اعزاز بخشا۔ صرف پندرہ روز تک مشکل سے ان کی قسمت کا ستارہ چمکا۔

نگار محل

برسات کا موسم تھا، ایک روز آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، ہوا کے مسرت آگیں جھونکے روح میں تازگی پیدا کرتے ہوئے دماغ و دل کو غنچۂ شگفتہ کی طرح کھلا رہے تھے، طائران نغمہ فروش گلستان کی شاخ شاخ پر بیٹھے ہوئے محو زمزمہ پردازی تھے، جن کی پُرکشش آواز دل پر عجیب تاثر چھوڑ رہی تھی۔ زرنگار طاؤس ہر طرف رقص میں مصروف تھے، ابر پارے باغ کی روشوں پر پانی چھڑکتے ہوئے گذر جاتے تھے، محفل عیش و طرب سجی ہوئی تھی، میری متوسل جتنی عورتیں تھیں سب کی سب مجھے اپنے حلقے میں لیے بیٹھی تھیں، ناچ گانے کا ایک

قیامت خیز ہنگامہ برپا تھا۔ مورچھل بردار مرصع مورچھل میرے اوپر جھل رہے تھے ___ ہر شخص پر جوش وسرمستی کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔ بقول شاعر ۔

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

کسے را با کسے کارے نہ باشد

یکا یک اس محفلِ نشاط میں میرے برادر خورد جرنیل صاحب مرزا اسکندر حشمت بہادر وارد ہو کر ناچ گانے میں شریک ہوئے، کچھ دیر بعد مجھ سے کہا کہ 'میں نے مجرے کے لیے ایک عورت کو طلب کیا ہے، جو حددرجہ حسین ہونے کے علاوہ گانے میں بھی بے مثل ہے۔' میں نے بے چینی سے کہا 'اگر تم اس کو میرے ملاحظہ میں پیش کرتے تو بہت مناسب تھا۔' جب انہوں نے دیکھا کہ اس اَن دیکھی عورت کے لیے میں بے تاب ہو رہا ہوں تو یہ کہہ کر اسے بلانے سے انکار کر دیا کہ وہ میرے سامنے بہت دیر تک ناچتی گاتی رہی ہے جس کی وجہ سے تھک کر چور ہوگئی ہے۔ آپ اطمینان رکھیے کسی اور موقع پر اسے آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا۔

چونکہ میرے اختیارات باقی نہ رہے تھے۔ اس لیے اپنے دل پر جبر کر کے خاموش ہو رہا، لیکن اس عورت کی ایک دن کی جدائی ایک برس معلوم ہونے لگی۔

دوسرے دن صبح کو جب پھر وہی بزمِ نشاط آراستہ ہوئی تو میرے چھوٹے بھائی جرنیل صاحب مرزا اسکندر حشمت بہادر چلے آئے، ان کے ساتھ ایک عورت تھی، جس کا رنگ کندن کی مثال دمک رہا تھا۔ عجیب ناز و انداز کے ساتھ دلوں کو کچلتی ہوئی قدم اٹھا رہی تھی، اودے اطلس کا پاجامہ اور اس پر سرخ رنگ کی مسالہ ٹکی پشواز پہنے ہوئے تھی اپنے سازندوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتی اور ایک ادائے خاص سے مسکراتی، اٹھکھیلیاں کرتی چلی آ رہی تھی، اس کی عمر اٹھارہ برس کی یا اس سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔ اس کا نام وزیرن تھا، بی جان نامی طوائف کی بیٹی تھی۔ قصاب والے پل پر اس کا مکان تھا۔

جیسے ہی اس سے میری آنکھیں چار ہوئیں، عشق کا ایک تیر میرے دل کے پار ہو گیا، اس خیال سے کہ یہ ایک ہم چشموں کا جلسہ ہے، اس لیے اپنی زبان سے کچھ کہہ نہ سکا، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھامے اور چپکے چپکے کراہ کے رہ گیا، مجھ پر بے خودی کا وہ عالم تھا کہ ممکن تھا کہ میں فرطِ شوق میں داستانِ محبت چھیڑ بیٹھتا، لیکن شرم دامن گیر ہوئی، میں کچھ اسی قسم کی دلی کیفیات میں ڈوبا

ہوا تھا کہ وزیرن نے اپنا ناچ اور گانا شروع کر دیا۔

حسن کیا کم تھا جو آئینہ کی کھولی قلعی
ایک حیرانی زیادہ ہوئی حیرانوں پر

وہ تو ادھر سرگرمِ رقص تھی۔ ادھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا آخر مجھ میں ضبط کی طاقت نہ رہی اور میں نے اسی بے خودی کے عالم میں محفل برخواست کرنے کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن اسی طرح اس پری تمثال نے بزم میں آ کر اپنے عشوہ و ناز کا مظاہرہ کیا اور مجھ فرقت نصیب کو اپنے تیرِ ادا سے ایسا گھائل کیا کہ مجھ میں طاقت نہ رہی اور میرے لیے سونا اور کھانا پینا تک حرام ہو گیا۔ اس کی ناوک مژگاں نے میرے دل کو یوں دو ٹکڑے کر دیا کہ وہ مرغِ بسمل کی صورت تڑپنے لگا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ نجم النساء بیگم مرحومہ میرے محل میں عہدۂ داروغگی پر مامور تھی' یہ خاتون نواب خاص محل کی رشتے کی چچی اور میرے چچا خسر علی نقی ابنِ محمد علی خاں ابن مدارالدولہ بہادر کی نسبتی بہن تھیں۔ چالیس پینتالیس سال کے سن کی عورت تھیں، بااخلاق اور سمجھدار اور دوست نواز واقع ہوئی تھیں، سبحان اللہ، مرتے دم تک پروانے کی طرح مجھ پر اپنی جان چھڑکتی رہیں۔ میرے مزاج سے اس قدر واقف ہو گئی تھیں کہ میں اپنے منہ سے ابھی بات نکالنے بھی نہ پاتا کہ وہ فوراً تعمیل کر دیتیں۔ میرا روپیہ پیسہ سب انہیں کے پاس ہوتا تھا، جس کی وہ اپنی جان کے برابر حفاظت کرتی تھیں، وہ اپنے آرام کا اتنا خیال نہ رکھتیں، جتنا میری خوشنودی کا، حددرجہ خوش مزاج اور طرح دار و خوش پوشاک عورت تھیں۔ ذرا سے پُر تکلف لباس میں وہ پری معلوم ہوتی تھیں۔ ان کا رنگ گندمی تھا، جس میں کچھ کچھ سرخی نمایاں تھی اور رخسار پر تل تھا۔ قامت موزوں اور اعضائے جسم عمر کے لحاظ سے مناسب تھے۔ بڑی ہوشیار اور عقل مند تھیں۔

ان کے خاندان میں ان کا پرانا نام پیارے صاحب تھا، وہ جب میرے محل میں عہدۂ داروغگی پر فائز ہوئیں تو داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے خطاب سے سرفراز ہوئیں، رات دن میرے اطراف ہالے کی طرح رہتیں۔ جو بات میرے دل میں ہوتی، وہ میری آنکھوں کے تیور سے سمجھ جاتی تھیں، داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے اٹھارہ مورچھل بردار ایسی عورتوں کو نوکر رکھوایا تھا کہ شوخی و طراری ناز و انداز میں ہر ایک عورت الگ الگ خصوصیت کی حامل تھی، اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک یگانہ روزگار

تھی، تو بے جانہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے جب دیکھا کہ میری جان خطرے میں ہے اور مجھ میں صبر وضبط کی مطلق تاب نہیں ہے تو محبت کے جوش میں ایک دن میرے قدموں پر گرگئیں اور یوں گویا ہوئیں۔ 'اے میرے جانِ عالم! میری جان آپ پر تصدق، آخر ایسی کون سی بات ہے جس کے باعث آپ کو اپنی جان کی پروا تک نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ بندگانِ اقدس کا چراغ راحت ہوائے غم کے جھونکوں سے گل سا ہوگیا ہے۔ اللہ کی قسم ہے اگر رات کا دن اور دن کی رات یا اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے تو بھی آپ کی یہ لونڈی آپ کی اطاعت سے کوتاہی نہ برتے گی۔'

اسی زمانے میں میر محمد مہدی داروغہ کے عہدے پر میرے ہاں ملازم ہوا تھا۔ میر محمد مہدی امین الدولہ امداد حسین خاں کے متوسلین میں سے تھا اور امین الدولہ نواب امداد حسین خاں میرے والد ماجد حضرت جنت مکان کے زمانۂ حکومت میں وزارت و مدارالمہامی کے عہدے پر ممتاز تھے۔ نیز وہ میرے استاد بھی رہے تھے، میں نے ان سے میزان اور شرح اسباب پڑھا تھا۔

میر محمد مہدی سیّد زادہ تھا۔ میرے والد ماجد حضرت جنت مکان کے زمانے میں ایک تمن کا تمندار اور پندرہ روپے مشاہرہ پاتا تھا۔ یہ ایک پاک باطن اور نیک دل انسان تھا، ساتھ ہی اس میں غرور ونخوت بھی موجود تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا، ورنہ وہ ہرگز معزول نہ کیا جاتا، اس کی عمر بتیس سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی، قد مناسب، سفید رنگ، وہ پڑھا لکھا آدمی بھی تھا۔

امین الدولہ امداد حسین خاں نے میر محمد مہدی کو ازارہِ دوستی میری سرکار میں داروغہ کے عہدے پر رکھوایا تھا، چونکہ اس زمانے میں امین الدولہ امداد حسین خاں کا طوطی بولتا تھا۔ غرض مند لوگ ہر وقت انہیں گھیرے رہتے تھے___ لیکن میر محمد مہدی داروغہ سے میرا دل کسی طرح بھی مربوط نہ ہوسکا، یہی وجہ تھی کہ اور لوگ اس شخص کے کاروبار میں دخل اندازی کرتے تھے، اس کی عین خواہش تھی کہ میں کسی طرح بے تکلفی بڑھا کر شیر وشکر ہو جاؤں، لہٰذا اس نے موجودہ واقعے کو مناسب ذریعہ بنایا اور چاہا کہ اس کام میں وہ میرا مددگار بنے، چنانچہ ایک روز بڑی منت سے کہنے لگا 'اے جانِ عالم، کیا وجہ ہے کہ حضور کے دشمن کئی روز سے غمگین ومضطرب، منہ کو ڈھانپے ہوئے پڑے رہتے ہیں اور رقص وموسیقی کی محفلیں بھی بالکل ختم کردی گئی ہیں۔'

انہیں دنوں دو گانے والی عورتیں میری ملازمت سے سرفراز ہوئیں، ایک کا نام امّن تھا اور

دوسری کا نام اَمامن۔ یہ عورتیں میری سرکار میں ملازم ہونے سے قبل رئیس فرخ آباد کے ہاں اپنے پیشے کے طفیل میں بڑا اعزاز حاصل کر چکی تھیں، خدا معلوم کیونکر وہاں سے نکل کر میری سرکار میں سرفراز ہوئیں۔ انہیں سرور محفل والیاں خطاب دیا گیا۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ ماں کا نام مجو۔ باپ کا نام نھو تھا۔ بھائی کا نام غلام رضا۔ نسبتی بھائی کا نام گھسن۔ چچا کا نام غلام نبی ماموں کا غلام حیدر تھا۔

مذکورہ لوگوں کا ذکر موقع آنے پر کیا جائے گا، فی الحال ناظرین کی معلومات کے لیے ان کے صرف نام بتا دینا کافی ہے۔

امن اور امامن صدق دل سے میرے ساتھ محبت رکھتی تھیں۔ ہمیشہ داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر سچے دل سے میری خدمت گذاری کرتیں، میں نے امّن اور امامن کو بہن بنالیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی حسنِ سلیقہ اور جذبۂ خدمت سے میرے دل میں ایسی جگہ پیدا کر لی کہ میں ان تینوں عورتوں (امّن، امان اور داروغہ نجم النساء بیگم) کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا، اسکے علاوہ ہر ساعت اپنے اس پوشیدہ راز یعنی عشق وزیرن کے تردد میں رہتا تھا۔ جس وقت اس گلستانِ حسن کے گلِ نودمیدہ کے عشق کی آگ میرے دل میں سلگ اٹھتی تو میری یہی ہمدم وہمراز عورتیں محبت بھرے گیت اور عاشقانہ غزلیں گا کر دل کی آگ کو ٹھنڈا کرتی تھیں۔ اسی زمانے سے میں نے ٹھمریاں موزوں کرنے کی مشق شروع کی۔ انہیں میں سے ایک ٹھمری کے یہ بول ہیں۔

سن او گوئیاں سیاں رہے وا ہو دیس

رفتہ رفتہ ان تینوں عورتوں نے اپنی حد درجہ رفاقت کو کام میں لا کر میرے درپردہ عشق کا حال معلوم کر لیا۔ ادھر باہر دربار میں داروغہ میر محمد مہدی مختلف طریقوں سے دریافت حال کرتا تھا۔

ایک دن داروغہ نجم النساء بیگم مرحومہ کسی بہانے بی جان کے گھر گئیں۔ انجان طور پر وزیرن کے دلی جذبات کا جائزہ لینا شروع کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ وزیرن بھی میرے عشق میں بری طرح مبتلا ہے، اس کے پاؤں میرے عشق کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں جس کے باعث وہ سرد سرد آہیں بھرتی ہے، جب داروغہ نجم النساء بیگم وہاں پہنچیں تو اس نے نہایت اضطراب کے عالم میں مگر چپکے چپکے اپنے دل کا حال اور قصۂ واردات عشق سنایا۔ داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ مرحومہ کی نظر جب وزیرن کی ماں پر پڑی تو وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ان کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا موقع ہی

نہیں دیتی کہ وزیرن سے کوئی بات ہو، انجام کار داروغہ نجم النساء بیگم منہ لٹکائے واپس آئیں۔

میں ادھر بے بس، چھپے ہوئے صدموں اور رنج وملال سے بسترِ غم پر پڑا ہوا تھا اور بار بار میرے دل سے جاں سوز آہیں نکلتی تھیں۔ اس لیے کہ اس سرچشمۂ عشق کی یاد میں میرا دل ماہئ بے آب ہو رہا تھا۔

میرا یہ حال دیکھ کر داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ مرحوم اور امّن اور امامن مجھ فرقت نصیب وسوختہ جاں کے پاؤں پر گر گئیں اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگیں کہ حضور کو یوں آہ وزاری سے کام نہ لینا چاہیے۔ کیا آپ نے یہ شعر نہیں سنا۔

مشکلے نیست کہ آساں نشود

مرد باید کہ ہراساں نشود

خدا کی مرضی ہوئی تو حضور کی پری چہرہ معشوقہ وزہرہ جمال بنتِ طناز کو لا کر حضور کے آغوش میں بٹھا دیں گے۔ لیکن تھوڑے دنوں کی مہلت چاہیے۔ اس وقت تک حضور کو صبر وضبط سے کام لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وزیرن کی ماں حضور کے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہو کر فریادی ہو، اور بنے بنائے کام میں خلل پڑ جائے۔

میں غم کا مارا اس مکان میں جس کا نام خاص مکان ہے بستر پر منہ ڈھانپے پڑا رہتا تھا اور دن رات اس کی محبت کے ستم سہہ سہہ کر کمزور وناتواں ہو رہا تھا۔ جب طبیعت بہت ہی گھبرا جاتی تو ستار بجانے لگتا اور کبھی پُرسوز غزلیں گا گا کر دلِ بے تاب کو سمجھانے کی سعی کرتا، کھانا پینا تو بالکل ہی حرام ہو گیا تھا۔

ایک آدمی مسمّی غلام علی میرا پرانا مصاحب اور رفیق تھا جو اب بھر مار پلٹن میں کمیدانی کے عہدے پر فائز ہے، اس کا خطاب بہاؤالدولہ ہے۔ دوسرا آدمی میرا اکبر علی ہے۔ یہ آدمی بھی میرا پرانا مصاحب ہے۔ آج کل دیوان خانہ سلطانی کا پیشکار اور اس کا اکبرالدولہ خطاب ہے۔ تیسرا شخص میر محمد مہدی داروغہ حال جو فی الحال اپنی خدمت سے سبک دوش کر دیا گیا ہے، امیرالدولہ کے خطاب سے ممتاز ہے۔

ان تینوں کی خواہش ہوئی کہ کوئی ایسا موقع نکلے کہ وہ معشوقہ طناز جلد از جلد مجھے ملے۔ اس کی ماں چونکہ بڑی گھاگ عورت تھی۔ اس لیے ان کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ایک روز داروغہ نجم النساء

بیگم پھر وزیرن کے گھر گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ چار پائی پر لیٹی ہوئی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ نجم النساء نے کوشش کی کہ اشاروں کنایوں سے اسے الگ لے جا کر میری طرف سے محبت کا پیغام اس کے گوش گذار کریں۔ اچانک اس کی سنگ دل ماں شور کرنے لگی اور کہنے لگی 'داروغہ سرکاری کارنڈیوں کے مکان پر کیا کام ہے، ہم لوگوں کو تم سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہمارے ہاں ہرگز نہ آیا کریں۔ ورنہ در دولت پر حاضر ہو کر میں فریاد کروں گی۔' یہ سن کر داروغہ نجم النساء بیگم گھبرائیں اور بہ عجلت ممکنہ اس کے مکان سے نکل گئیں اور ناامیدی کے عالم میں میرے پاس آئیں۔ جب میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے سے تکدر نمایاں ہے اور لہجے میں درشتی اور سر سے پیر تک کانپ رہی ہیں تو اس کی وجہ دریافت کی۔ پھر انہوں نے اس کی ماں کے شور مچانے اور طرزِ گفتگو کا ماجرا سنایا۔ یہ واقعہ سننے کے بعد مجھے بہت غصہ آیا۔ فوراً میر محمد مہدی کو (جو امین الدولہ کے متوسل تھے) طلب کیا اور کہا کہ 'جب تک میری محبوبہ نہیں آئے گی، مجھ پر کھانا پینا اور سونا حرام ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ اس وقت تم میرے حال پر افسوس کرو گے۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ جیسے بھی ہو جان پر کھیل کر اسے میرے پاس لاؤ۔'

تھوڑی دیر تک وہ سوچ میں پڑ گئے، اس کے بعد عرض کیا کہ 'اس کا لایا جانا تو کوئی مشکل کام نہیں، لیکن حضرت جنت مکان سے اس راز کو کب تک پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے۔'

اس دوران اس کی جدائی میں ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن مراد بر آنے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی۔ میں نے اس معاملے کے سلسلے میں امین الدولہ کے پاس بھی کچھ پیغامات ارسال کیے اور کچھ عورتوں کو جو میرے والد ماجد کی ملازم تھیں۔ مثلاً مصاحب السلطان اور انتظام السلطان جو اس زمانے میں حضرت جنت مکان کے محل میں داروغہ کی خدمت پر فائز تھیں اس کام میں لگایا، لیکن کوئی تدبیر فائدہ مند نہ ہوئی اور میں اسی طرح رنج و آلام کا شکار رہا۔

ایک دن میں اپنے مکان بادشاہ منزل کی چھت پر ایک طپنچہ لے کر چڑھ گیا اور اندر سے اس کے دروازے بند کر لیے اور چاہتا تھا کہ طپنچے کی گولی سے اپنے کو ہلاک کروں۔ اتنے میں داروغہ نجم النساء بیگم آ کر دروازے سے اپنا سر مارنے لگیں اور ساتھ ہی کہنے لگیں 'اے جانِ عالم! میں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتی ہوں، میری ایک بات سنیئے!' میں نے اندر سے جواب دیا۔ 'کیا بات کہنا چاہتی ہو کہو۔' پھر انہوں نے کہا کہ 'اگر اب کی دفعہ میں اس کو نہ لا سکی تو آپ کا دل جو چاہے

کیجیے، اب جبکہ آپ کا مدعا پورا ہو رہا ہے، ایسی حالت میں خود کو ہلاک کرنا کہاں کی دانائی ہے؟'

میں نے ان کی بات مان لی اور اپنے ارادے سے باز رہا، پھر اسی لمحے شیخ غلام علی تیز رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر وزیرن کے گھر گیا، میں نے اِدھر اپنے مکان کو مکلّف و آراستہ کیا، نہر کے بیچوں بیچ جس کے اطراف فوارے چھوٹے ہوئے تھے سیج بچھوائی۔ میر محمد مہدی کے علاوہ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا، میں بہ مصداق اس شعر کے۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک

آتشِ شوق تیزتر گردد!

فرطِ مسرت میں بے چینی سے میں چہل قدمی کر رہا تھا، اسی طرح پہر رات گذر گئی دفعتہً دیکھا کہ اس ماہ وش کی تجلیٔ جمال سے سارا مکان روشن ہے میں نے بے خودی میں دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

رات بھر اس کے شمع حسن پر پروانے کی طرح قربان ہوتا رہا اور تمام رات باہمی شکوہ و شکایات اور راز و نیاز میں گذری۔

جب صبح نمودار ہوئی، صدائے نوبت و آواز مرغ واللہ اکبر کا غلغلہ بے دار ہوا جس کے باعث میرا طائر روح عین ہنگامِ وصال گویا ذبح ہو گیا__ اس وقت یکا یک دروازے کے پیچھے سے میر محمد مہدی نے کہا 'رات کا اندھیرا چھٹ گیا اب صبح کا اجالا ہر طرف پھیل رہا ہے، مناسب یہی ہے کہ اب حضور رخصت فرما دیں۔' میر صاحب کی اس آگاہی سے میرے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور صبر کی طاقت بھی جواب دینے لگی، اسی عالم میں اٹھ کر میں نے اسے خدا حافظ کہا۔

برابر ایک ماہ تک ایسا ہی کچھ سلسلہ جاری رہا، ایک دن میں نے اس جان خوبی کو روک لیا اور امین الدولہ کو اس مخلصانہ خدمت کے صلے میں لبادہ و مندیل کے ساتھ پانچ پارچہ کا خلعت عنایت کیا۔

اس بت طناز کا ایک اور قصہ سنیے:

ایک روز وہ اپنے مکان میں تھی جو کہ قصائی والے پل پر تھا اور جس کا میں ذکر کر چکا ہوں، اس کو بڑا تیز بخار چڑھا ہوا تھا، بخار کی شدت سے اس کی آنکھیں مندھی ہوئی سی تھیں، ادھر میرا یہ حال تھا کہ اندر ہی اندر اس کی یاد میں دیوانہ ہو رہا تھا، جیسے ہی میں نے اس کا خیال کیا خدا کی قسم کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بخار کی اسی شدت میں میرے پاس آ گئی۔ اس وقت وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے

اور ننگے پاؤں تھی اوراسی حالت میں ایک کوس کا فاصلہ طے کر کے میرے پاس آئی تھی۔

میں نے پوچھا 'تمھیں اس حالت میں یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔' اس نے کہا 'غالباً اس وقت آپ نے مجھے دل سے یاد کیا تھا۔' اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہوگئی۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسے واقعات پرانے قصوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

جس روز وہ جانِ جاں آ کر میرے گھر بیٹھ گئی جشنِ مسرت منایا گیا، مطربانِ خوش آواز و پری جمال مغنیوں نے اس محفل کو رشکِ فردوس بنا دیا۔ ہر طرف سے مبارک باد کی آواز آتی تھی اور نوبت و نقارہ کی صدائے دلپذیر فضا میں گونجتی تھی۔ میں نے اس خوشی میں حضرت مشکل کشا کا دسترخوان کیا۔ ملازموں نے نذریں پیش کیں اور میں نے ہر ایک کو اس کے رتبے کے مطابق سرفراز کیا۔ خاص کر داروغہ نجم النساء بیگم، امّن و امامن اس شمعِ جمال پر پروانہ وار نثار ہو رہی تھیں۔ اس کی ماں امین الدولہ کی ایما سے قید کی گئی۔ دو تین ماہ بعد میری سفارش سے رہا ہوئی اور اس کی بیٹی کی جانب سے دو ہزار نقد مع خلعت و دوشالہ و رومال عطا کیا گیا۔ میں نے ہر طرح چاہا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس ہی رہے، لیکن اس نے اپنے ناجائز پیشے کو چھوڑ کر بیٹی کے پاس رہنا گوارا نہ کیا جس کی وجہ سے میری جانِ تمنا وزیرن اپنی ماں سے سخت ناراض رہی۔

نفیس سے نفیس جواہرات، سونے چاندی کے بیش قیمت برتن اور اچھے اور فرمانبردار ملازم انہیں دیئے گئے اور ایک اعلیٰ خطاب سے وہ سرفراز کی گئیں۔ آخری خطاب ان کا ملکۂ عالم نواب نگار محل صاحبہ ہے۔

ایک سال تک ان کا ستارۂ اقبال جگمگاتا رہا۔ اس کے بعد چند خاص وجوہات کی بنا پر ماند پڑ گیا۔ ان کے مزاج میں اس قدر تلون آ گیا تھا کہ رات کی کہی ہوئی بات صبح کو فراموش کر جاتی تھیں۔ میں نہ چاہتا تھا کہ وہ میرے دوسرے محلات سے میل جول پیدا کریں لیکن انہوں نے کوئی پروا نہ کی اور سب سے ربطِ دوستی بڑھاتی رہیں۔ ان کے اس عمل نے مجھے بڑا دکھ پہنچایا۔ ذرا سوچنے کی بات ہے میری یہ خواہش کہ نواب نگار محل کا کوئی اور ہمسر نہ ہو۔ لیکن ان کی یہ حالت کہ وہ اپنے پرائے، دوست دشمن میں تمیز نہ کریں، میری دل جوئی کا بھی انہوں نے کوئی خیال نہ کیا۔ دوسرے محلات میں نواب خورد محل عمدہ بیگم صاحبہ، نواب نشاط محل ننھی بیگم صاحبہ سے میری مرضی کے خلاف دوستی پیدا کی۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ نواب نگار محل ان دونوں محلوں سے ممتاز رہیں، یہ جب ان

میں گھل مل گئیں تو فوقیت وفضیلت کہاں رہی۔اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی پیدا ہوئیں، بے پروائی سے کام لینا، کھانے پر انتظار نہ کرنا، عشق ومحبت کو بازیچۂ اطفال سمجھنا اور اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں جس کی وجہ سے یہ ناگوار صورتِ حال پیدا ہوئی۔

حضور والیاں

اس مہ جمال کا تذکرہ ختم ہوا۔اب دوسرا شروع کرتا ہوں، جب اس محبوبہ طنّاز نے میرے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ کیا تو اس کی طرف سے میرا دل پھر گیا اور دشمنوں کو ان کی کوششوں میں کامیابی نصیب ہوئی۔

اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی تھی۔اسی زمانے میں اٹھارہ نفر آسامیاں مورچھل بردار داروغۂ نجم النساء بیگم کے توسط سے ملازم رکھی گئیں، وہ اپنی خدمت وفرائض کی انجام دہی میں سب پر سبقت لے گئیں، لہٰذا انہیں 'حضور والیاں' کا خطاب بخشا گیا۔میں دو سال تک مختلف مکروفریب سے کام لے کر ہر ایک سے محبت کرتا رہا، لیکن یہ عورتیں بڑی بداطوار واقع ہوئی تھیں۔آٹھ دن یہاں رہ کر جو کما لیتی تھیں آٹھ دن میں اپنے گھر پر غیروں پر خرچ کر دیتی تھیں اور کمال یہ کہ میری محبت کا دم بھرتی تھیں اور میری ہمدم ودمساز بنتی تھیں۔

اسی زمانے میں بشیر اور فیروز نام کے دو خواجہ سرا حضور جنت مکان نے مجھے مرحمت فرمائے تھے۔میں نے فیروز کو نعمت خانہ کا درا روغہ بنا دیا اور بشیر کو عہدۂ نظارت پر مامور کیا۔یہ دونوں خواجہ سرا حبشی قوم سے تھے۔بشیر کی عمر پچاس اور فیروز کی عمر چالیس برس کی تھی۔ان دونوں غلاموں میں جانبازی کے جوہر موجود تھے۔اس کے علاوہ بشیر میں جذبات رشک تھے۔مگر یہ آدمی جہاں دیدہ اور ذی عقل تھا اور اس کے مزاج میں تحمل تھا اور فیروز کے مزاج میں غصہ تھا اور وہ جاہل بھی تھا۔

جب دونوں اپنے اپنے عہدوں پر ممتاز ہو گئے تو بشیر نے یہ کوشش شروع کر دی کہ اطاعت و خدمت میں داروغہ میر محمد مہدی کا مدِمقابل ہو جائے۔لیکن میر محمد مہدی کے سامنے اس کا جادو نہ چل سکا، جس کی وجہ سے اس کی ہوس کو آسودگی نہ مل سکی۔اس کے علاوہ داروغہ نجم النساء بیگم سے بھی وہ کچھ عداوت رکھتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی مراد پوری ہوئی۔وہ یوں کہ میں ایک ماہ پیکر کی محبت میں گرفتار ہوا اور اس نے

نشاط گری شروع کی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے عروج بھی نصیب نہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ جب بشیر نے یہ جان لیا کہ میں حضور والیوں کی طرف مائل ہوں، تو وہ عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کرنے لگا، کبھی تو ان کے حسن و جمال کی تعریف کے پل باندھ دیتا اور کبھی ان کو بے وفا بتا کر مجھے ڈراتا۔

چونکہ حضور والیوں کا دستہ داروغہ نجم النساء بیگم نے آراستہ کیا تھا اور بشیر کو ان سے کدورت تھی اس لیے چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی محل کے اندر اور محل کے باہر دونوں جگہ کا وہ داروغہ بن جائے۔

بشیر وہی شخص ہے جو حضرت خلد مکان کے ہاں خواجہ سراؤں کے زمرے میں تھا اور ان کی وفات کے بعد ولایتی محل کے ہاں (جو حضرت خلد منزل کا محل تھا) عہدہ نظارت پر مامور تھا اور نصیر الدین حیدر خلد منزل کے انتقال کے بعد میرے دادا جان حضرت فردوس منزل کے محل ملکۂ جہاں کے ہاں خدمت گذاری کے عہدے پر رہا، پھر حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ کے عہد میں اسے خلعت کمیدانی مرحمت ہوا اور کھوپری والی پلٹن کا کمیدان ہوا، بعد وفات حضرت فردوس منزل حضرت جنت مکان امجد علی شاہ نے از راہِ شفقت مجھے مرحمت فرمایا، میں نے اس کی پرورش کے خیال سے اپنے محلات کی نظارت اسے عنایت کی۔

ایک دن عیش و نشاط کی محفل آراستہ تھی، میں حضور والیوں کی محبت میں مبتلا تھا اور ان میں سے ہر ایک عورت عشوہ و ناز دکھا رہی تھی۔ اس موقع پر حیدری خانم نے جو حضور والیوں میں سے ایک تھی اپنے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ بشیر نے عرض کیا پیر و مرشد! یہ حضورِ والا سے مکر کرتی ہیں، یہاں سے جو جواہرات و زر نقد لیتی ہیں۔ اپنے عاشقوں کو دے دیتی ہیں۔ یہ سخاوت کب تک چل سکتی ہے۔ داروغہ نجم النساء بیگم چاہتی ہیں کہ حضور کا سارا مال و متاع تلف ہو جائے۔ جو آدمی حضور کی خدمت میں رہنا پسند کرے اس کو بے شک زر و جواہر اور مال و اسباب سے سرفراز کرنا چاہیے، لیکن یہاں سے سب کچھ لے کر جو اپنے گھر چلی جاتی ہیں اور اپنے یاروں کو بانٹ دیتی ہیں انہیں نوازنے سے کیا حاصل؟ اس پر طرّہ یہ کہ نہ صورت کی اچھی ہیں نہ سیرت کی۔'

اس کی تقریر سن کر میں نے کہا 'یہ سب میرے جاں نثار ہیں۔ اگر میں انہیں صرف اشارہ کروں تو اسی وقت اپنا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کریں۔'

'ہما کو زاغ کی صحبت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور زاغ ہما کے ساتھ رہے تو ہما کا نقصان ہے۔' جب میں نے بشیر کو یہ جواب دیا تو اس نے کہا 'جنابِ عالی! کمسنی اور ناتجربہ کاری کی وجہ

سے ابھی تک عورتوں کے فریب و مکر سے ناآشنا ہیں۔' میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے ارشاد کیا' تمہارا خیال صحیح نہیں ہے، میں ان لوگوں سے یہاں رہ جانے کو کہتا ہوں۔'

جب میں نے جا کر حضور والیوں سے اپنے یہاں رہ جانے کے لیے کہا تو انہوں نے حیلوں بہانوں سے کام لینا شروع کیا اور آج کل کہہ کر ٹالنے لگیں۔ اس طرح بشیر کا کہا درست معلوم ہوتا تھا۔ اس میں سے ایک عورت نے کہا ہم اپنے آبائی گھر کیسے چھوڑ دیں۔ ایک بولی میرے بچے ہیں، میں کیونکر یہاں رک سکتی ہوں۔ ایک نے البتہ کہا میں رات دن خدمت کو حاضر ہوں۔ الغرض تاش کے پتوں کی طرح سب منتشر ہو گئیں، جب میں ان کے فریبوں سے واقف ہوا تو دلی رنج ہوا۔

ہیہات! اٹھارہ عورتوں میں سے ایک عورت نے بھی میرا اور میری محبت کا کچھ لحاظ نہ کیا۔ اسی دم اس جلسہ سے میرا دل اداس ہو گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بے مروت عورتوں کی سرپرستی کرنا سانپ کو پالنے کے برابر ہے۔ مناسب ہے کہ میں ان سے کنارا کش ہو جاؤں، لہٰذا ان سب کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ جھمگٹا صحرا کے سنگریزوں اور خزاں زدہ پیڑ کے پتوں کی طرح درہم برہم ہو گیا، اگرچہ ان میں سے چار پانچ عورتیں رہ گئیں، لیکن ان کی طرف میں نے کوئی التفات نہ کی۔ ہر چند انہوں نے بہت کچھ معذرت خواہی کی، لیکن میں نے ان کے کسی عذر کو قبول نہ کیا۔

مختصر یہ کہ یہ سارا دفتر پارینہ ہو گیا، مگر حضور والیوں میں سے دو تین عورتوں کی محبت کا داغ دل پر رہ گیا۔

قطب علی خاں ستار نواز

قطب علی خاں ستار نواز، ستار بجانے میں بڑا مشہور تھا۔ قبل ازیں مختار الدولہ ابن ناصر الدولہ مرحوم کے پاس ستار بجانے پر نوکر تھا۔ اس کے آباؤ اجداد شہر بریلی کی راجپوت قوم سے تھے، جن کا سلسلۂ نسب راجہ جگت دیو سے جا ملتا تھا۔ اس شخص کی عمر تیس یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ گندمی رنگ، موچھیں کسی قدر لانبی، سارے سر پر بال، پڑھنے لکھنے میں ماہر، نثر نگاری میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا اور موسیقی کے فن میں مشہور و ممتاز تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قطب علی خاں اس فن میں اس قدر مہارت رکھتا تھا کہ اس وقت کا وہ نائک بیجو، نائک گوپال اور تان سین تھا۔ اس شخص کو میں نے اپنے رفع ملال کے لیے ستار نوازی میں اپنا استاد مقرر کیا اور اس سے میں نے یہ

فن اتنا سیکھا کہ کئی بار حاضرینِ محفل حیران رہ گئے۔ لوگ ہنستے ہنستے رو دیتے تھے اور روتے روتے ہنس دیتے تھے۔ پیارے خاں میری تعریفیں کرتا تھا اور میرا استار سن کر جھومنے لگتا تھا۔ بعض وقت تو خود قطب علی خاں میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ میں نے اس فن کو کمال کے درجے تک پہنچا دیا۔ اسی وقت سے قطب علی خاں میرا رفیق و ہمدم ہو گیا، لیکن یہ آدمی لا مذہب تھا۔ روزانہ دو تین پہر وہ میری صحبت میں رہتا تھا۔ ایک روز تاج محل کی ملاقات کا پیغام میرے نام لایا۔ جو کہ حضرت نصیرالدین حیدر خلد منزل کی محل تھیں۔ انہوں نے اپنی ایک مغلانی کے ذریعے بھی کچھ باتیں کہلوائی تھیں، لیکن میں نے اپنے چچا کے ادب و لحاظ سے صاف صاف جواب دے دیا۔ قطب علی خاں بھی محبت پسند اور عاشق مزاج آدمی تھا۔ جٹی بھنویں، گندمی رنگ، فارسی اور عربی زبان کا جاننے والا، بے بدل استاد، بذلہ سنجی، معنی فہمی اور دور بینی بھی اس میں کافی موجود تھی۔

حضور والیوں سے ترکِ ملاقات کیے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس لیے میں یہ سوچنے لگا کہ حسرت و یاس کا یہ صدمہ کب تک برداشت کروں، بہتر یہ ہے کہ دو چار معشوقوں کو بلاؤں تاکہ حضور والیوں کا غم رفع ہو۔

یاسمین پری

بڑی جستجو و تلاش اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک عورت دستیاب ہو سکی جس کو یاسمین پری کے نام سے ملقب کیا گیا۔ میں نے بہت کچھ چاہا کہ خود اس عورت کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کروں۔ لیکن اس کے الھڑ پن کی وجہ سے میں اپنی افسوں گری میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سلیمان پری

ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ ایک دوسری عورت کو اپنے گھر بٹھایا اور اس کا نام سلیمان پری تجویز ہوا۔

عزت پری

اس کے چند ہی روز بعد ایک اور عورت دستیاب ہوئی، چونکہ خود اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی اور

میرے گھر بیٹھنے کا وعدہ بھی کیا تھا اس لیے میں بخوشی راضی ہوگیا اور اس کو عزت پری کے خطاب سے نوازا۔ چونکہ میری طبیعت میں نفاست پیدا ہوچکی تھی اور استاد قطب علی خاں کی معیت میں مختلف قسم کے لطف اٹھاتا رہا تھا اور محفلِ موسیقی منعقد کیے بغیر میرا جی نہ بھرتا تھا۔ لہٰذا جو عورت کہ فنِ موسیقی سے نابلد ہوتی وہ مجھے ہرگز نہ بھاتی تھی۔ مذکورہ بالا تین عورتیں موسیقی کے الف بے سے بھی ناواقف تھیں، میری خواہش تھی کہ کوئی ناچنے گانے والی عورت دستیاب ہو۔ چنانچہ میں نے ان عورتوں سے اپنی محبت نہیں بڑھائی۔

سلطان پری

حیدری اور دلبر نام کی دو طوائفیں لکھنؤ بھر میں رقص و موسیقی کے فن میں بڑی بے مثال سمجھی جاتی تھیں۔ دلبر جو کہ حیدری کی بڑی بہن تھی میری خدمت سے فیض یاب ہونے کا فخر رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی چھوٹی اور حقیقی بہن کو میری خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کیا۔ حیدری کی عمر گیارہ برس کی تھی اور وہ کچھ کچھ ناچ گانے سے بھی واقف تھی، میں نے دلبر کے اس نذرانے کو قبول کیا اور سلطان پری کے خطاب سے مشرف کیا۔ بشیر خواجہ سرا کی معرفت یاسمین پری، میر اکبر علی کے توسط سے سلیمان پری، نواب خاص محل صاحبہ کے توسط سے عزت پری، داروغہ نجم النساء بیگم کے توسط سے یہ لڑکی مجھ تک باریاب ہوئی تھی۔

حور پری

اس واقعے کو گذرے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ داروغہ میر محمد مہدی کے معرفت نجبہ نام کی ایک عورت آئی اور میں نے اس کا نام حور پری رکھا اور اپنے گھر ڈال لیا۔ یہ عورت ناچ گانے کی بڑی ماہر تھی اور امیرن ڈومنی کی بیٹی تھی، اس نے کسبن کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

ماہ رخ پری

بعد ازاں داروغہ ارباب نشاط مسمی مہدی نے محبوب جان نام کی ایک پیشہ ور عورت کو کچھ زبردستی اور کچھ حیلے بہانے سے میرے حضور میں بھیجا۔ یہ عورت رقص و سرود کی ماہر اور اس کی شہرت دور

دور تک پہنچی ہوئی تھی، اگر چہ ہر عہد میں داروغہ کا پیشہ اختیار کرنے والوں کا یہی دستور رہا ہے، اب خواہ لوگ ان سے خوش ہوں یا ناخوش ان لوگوں کو اپنے کام سے کام رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ خدا کو کیا جواب دیں گے۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ گانے والیوں کو اپنے حضور میں پیش کرنے کا ولی عہد سلطنت کا حکم عام ہے تو اپنی امان اسی میں دیکھی کہ کسی عورت کو میرے حضور میں جبراً حاضر کر کے سرخروئی حاصل کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اسی طرح کی ایک عورت کو میری سرکار میں بھیجا گیا، جب میں نے اس کے حالات دریافت کیے اور اس سے اپنے گھر میں رہ جانے کی خواہش کی تو اس نے صاف انکار کیا اور کہا کہ دراصل مجھے دھوکے سے لایا گیا ہے جب میں نے دیکھا کہ وہ نہ میرے گھر رہنا چاہتی ہے اور نہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ پیدا ہو سکتی ہے تو کہا تو بخوشی اپنے گھر جا سکتی ہے، خداوندِ تعالیٰ مجھے اور عورت دے دے گا۔ میری یہ گفتگو سن کر اس نے عرض کیا۔ 'اے جانِ عالم میں آپ کے صدقے جاؤں، ان قدموں کو چھوڑ کر اب کہاں جا سکتی ہوں، میں امید کرتی ہوں کہ مجھے اپنی پریوں میں شامل کر کے میری عزت افزائی فرمائیں گے۔' غرض اس کی درخواست کو منظور کر لیا گیا اور اس کو ماہ رخ پری کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ اس عورت کی ایک رشتے دار عورت راستہ چلتے میری بگھی کے گھوڑوں کے پاس گر گئی اور فریادی ہوئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ حضرت جنت مکان کے سامنے خدمتِ قلمدان میرے ذمّے تھی اور اس وقت میں اپنے والد صاحب کے مجرے کے لیے دربار کو جا رہا تھا۔ اس عورت کی آہ و بکا سن کر بڑا پریشان ہوا۔ میں نے پوچھا تو کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ اس پر اس نے عرض کیا داروغہ ارباب نشاط نے میری لڑکی کو زبردستی چھین کر حضور کی خدمت میں بھیجا ہے میں اس بارے میں آپ سے دادخواہ ہوں اور امید ہے کہ آپ میری درخواست منظور فرمائیں گے، میں اسی وقت اس عورت کو اپنے گھر لے آیا اور ماہ رخ پری سے دریافت کیا۔ کیا تم اس کو جانتی ہو؟' اس نے کہا۔ 'ہاں میں جانتی ہوں، آپ اجازت دیجیے اس کو میں کچھ علیحدگی میں سمجھاؤں گی۔' مختصر یہ کہ میں نے پانچ سو روپے ماہ رخ پری پر نچھاور کر کے اس کی ماں کو دیئے، اس طرح اس نے راضی نامے پر دستخط کر کے خوشی خوشی اپنے گھر کی راہ لی۔ اللہ اللہ! ایسی نیک خصلت عورت میرے دیکھنے میں کبھی نہ آئی تھی۔

وزیرن طوائف

اس دوران میں وزیرن نام کی طوائف نے مجھ سے اپنی محبت جتانی شروع کی۔ یہ وہی وزیرن ہے جس کا تذکرہ گذشتہ ابواب میں ہو چکا ہے اور جو کہ نصیرالدین حیدر کے ہاں گانے والیوں کے زمرے میں تھی اور آج کل شیدی احمد کے پلّے پڑی ہوئی ہے، مجھ ہی پر کیا موقوف ہے یہ عورت ایک دنیا کو اپنے دامِ تزویر میں صید کیے ہوئے ہے۔ گندمی رنگ، عمر تیس برس کے قریب، ہاتھ پاؤں مناسب حد تک خوبصورت، بھنوئیں اور آنکھیں بھی کافی حد تک پُرکشش۔ اس کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت تھی۔ شروع میں برادرِ عزیز مرزا اسکندر حشمت اس کے کمندِ عشق کے اسیر تھے، چنانچہ اس نے ان سے کئی ہزار روپے وصول کیے، اکثر و بیشتر وہ مجھ سے شوخی و شرارت کیا کرتی۔ کسی وقت داروغہ نجم النساء کے توسط کو کام میں لاتی تھی اور کبھی امن و امامن کے ذریعے پیغامِ محبت پہنچایا کرتی۔ غرض کہ ہر روز اپنے بے شمار محبت نامے ارسال کیا کرتی تھی جن پر اس کی انگلی کے خون کی مہریں ثبت ہوا کرتیں۔ اس کی والہانہ محبت کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ میں جس روز درگاہ جایا کرتا تھا، اس روز وہ حضرت عباسؑ کی درگاہ تک صرف مجھے دیکھنے کی خاطر جایا کرتی تھی۔ چونکہ مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ وزیرن کے میرے بھائی مرزا اسکندر حشمت سے مراسمِ محبت ہیں، اس لیے ایک دن میں نے اس بات کو چھیڑا اور کہا کہ 'تو ایک طرف تو میرے بھائی سے اپنا ربطِ محبت بڑھائے ہوئے ہے، دوسرے ادھر میرے ساتھ بھی تیرا عشق بڑھا ہوا ہے، آخر دو آدمیوں سے چاہ کس طرح ممکن ہے۔' یہ سن کر صاف مکر گئی اور قسم کھا کر کہا کہ 'مجھے تمہارے بھائی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔'

ایک دن ایسا ہوا کہ عیش و نشاط کی مجلس بہار پر تھی، ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی، ایسے میں خوش آواز گانے والی عورتوں کی آواز عاشق مزاج لوگوں کے دل پر نشتر زنی کر رہی تھی، محفل کو آراستہ کرنے میں کافی اہتمام اور تکلف سے کام لیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ کوئی محفل نہیں بلکہ کسی نوعروس کو سجایا گیا ہے، مالیوں نے تروتازہ پھولوں کے نہایت ہی عمدہ گلدستے جگہ جگہ سجا رکھے تھے، جن کی وجہ سے ہماری محفلِ نشاط رشکِ ارم بن گئی تھی، دونوں طرف میرے مصاحبین صف بستہ اور قاعدے سے بیٹھے ہوئے تھے اور عجیب عجیب طرح کی دل لگی اور مذاق کا ہنگامہ برپا تھا، اسی محفل میں میرے برادرِ عزیز مرزا اسکندر حشمت بہادر بھی اتفاق سے

موجود تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا 'سنا ہے وزیرن سے تمہارا کچھ تعلق ہے، لیکن معلوم نہیں یہ محض افواہ ہے یا حقیقت' اس پر میرے بھائی نے کہا 'میرے دربار سے وابستہ لوگوں اور مصاحبوں کے ہاتھ وہ اکثر میرے نام محبت آمیز خطوط بھیجتی رہتی ہے۔ جن میں اس کا بھی اظہار کرتی ہے کہ وہ میری محبت میں حالِ تباہ کو پہنچ گئی ہے۔ اس کے یہ خطوط ہنوز میرے پاس محفوظ ہیں۔'

بھائی کی یہ بات سن کر میں نے جواب دیا کہ 'اس عورت نے خود میرے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔'

آخرکار بھائی کے اور میرے مابین یہ طے پایا کہ اتفاق سے اس محفلِ عیش و طرب میں بیسیوں شریف اور وضعدار آدمی موجود ہیں، ان سب کی موجودگی میں وزیرن ہم دونوں میں سے جس کا ہاتھ تھام لے وہ اسی کی تسلیم کر لی جائے۔ اس کے بعد آئندہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے۔ مختصر یہ کہ وہ بے مثال رقاصہ ایک دفعہ ناچتی ناچتی آگے بڑھی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ساتھ ہی یوں گویا ہوئی کہ 'میرا اسکندر حشمت بہادر سے کوئی تعلق نہیں، میں یہ تک نہیں جانتی کہ یہ کون ہیں۔' اس کی اس تقریر سے محفل میں ایک نئی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور خوش آواز مطربوں نے نغمۂ مسرت گانا شروع کر دیا۔ لیکن میرے بھائی اس فاحشہ عورت کے اس سلوک سے بڑے شرمندہ معلوم ہوتے تھے اور ایک عجیب دل شکستگی کے عالم میں محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے بھی محفل برخواست کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعے کے بعد سے وزیرن سے میرا اختلاط رہا۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ میں کھیل اور تماشے سے بھی رغبت رکھتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس سے طے کیا کہ فلاں دن گولہ گنج میں عظیم اللہ کمیدان کے ہاں ضرور جاؤں گا تم بھی وہاں چلی جانا اس نے آنے کا قطعی وعدہ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کو میرے محل میں بلانے میں کوئی امر مانع نہیں تھا، لیکن یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تاکہ اس کے دل میں میری محبت کی آگ زیادہ سلگے اور مجھ سے ملاقات کا اشتیاق بڑھے۔

علی نقی خاں اور وزیرن

مقررہ دن آخر آیا میں نے عظیم اللہ کمیدان کے گھر جانے کی تیاری شروع کر دی اور ساتھ ہی ایک

مختصر سی محفل کا انتظام کیا اور مصاحبوں اور دیگر ملازموں کو روزمرہ کے مکان سے رخصت کر دیا۔ دروازے پر پہرہ مقرر کروایا کہ آنے جانے والوں پر پابندی رہے، ان انتظامات سے فارغ ہو کر میں نے دیدہ زیب ریشمی انگرکھا اور پاجامہ جس پر تاج بنے ہوئے تھے، زیبِ بدن کیا اور زریں کلاہ سر پر رکھی اور اس کے بعد فینس پر سوار ہو کر روانہ ہوا اور پہر رات گذرنے تک بخیریت عظیم اللہ کمیدان کے مکان پہنچا۔ اس وقت میں نے داروغہ نجم النساء بیگم اور دو مشعل برداروں کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

عظیم اللہ تقریباً پچاس برس کی عمر کا تھا اور قوم شیخ سے تھا اور اس کے دماغ میں کچھ فتور سا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا فوراً کھڑا ہو گیا اور سلام و مجرا کے مراسم ادا کیے اور میرے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی پیش کر دی، اس کے بعد پان و عطر میرے ملاحظہ میں پیش کیے جنھیں میں نے قبولیت کا شرف بخشا۔ اس موقع پر میرے چچا خسر علی نقی خاں بھی موجود تھے، سنا ہے یہ شخص مدارالدولہ مرحوم کی اولاد سے ہیں اور صحیح النسب سیّد ہیں۔ بڑی بڑی موچھیں، دراز قد، دبلے پتلے، نہایت عقل مند و زیرک، مہذب و خلیق اور امیرانہ زندگی گذارتے تھے۔ ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ میں آگے بڑھ کر ان سے بغل گیر ہوا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ مکان بہت مختصر سا ہے اور وہ معشوقۂ طنّاز وہاں موجود نہیں ہے۔ تب میں نے عظیم اللہ سے دریافت کیا کہ 'وہ آدمی کہاں ہے۔' اس نے دست بستہ عرض کیا کہ 'ابھی حاضر ہوا چاہتا ہے۔' اس کے آنے تک ستار کی بڑی شاندار صحبت جمی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ گلبدن ناز بھی وہاں آموجود ہوئی، پھر اس سے میرا مصافحہ اور معانقہ ہوا۔ لیکن اس کا عجیب حال تھا کہ کبھی روتی تھی اور کبھی کھلکھلا کے ہنستی تھی۔

برسات کا موسم تھا۔ آسمان پر ہر طرف سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں زور کی بارش نہ ہونے لگے اور میرا گھر جانا ناممکن ہو جائے۔ اس لیے نہایت حسرت و اندوہ کے عالم میں اس سے رخصت ہوا۔ علی نقی خاں سے اس روز پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ میں نے جو محفل برائے نام آراستہ کی تھی وہ اسی طرح جاری ہے، میں سیدھا جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اب رات چونکہ تھوڑی رہ گئی تھی، اس لیے سو گیا۔ داروغہ نجم النساء بیگم اپنی خواب گاہ میں جا کر سو گئیں، حاصل کلام یہ کہ میری محبت کا جادو وزیرن پر بھی چل گیا تھا۔ ادھر میں بھی اس

کی تیغِ ادا کا زخم خوردہ تھا، کبھی وہ مجھے گھائل کرتی تو کبھی میں اس کو گھائل کر دیتا۔

پریوں کی تعلیم

میں عیش و عشرت کے جلسے ترتیب دینے اور نت نئی گانے والیوں کو فراہم کرنے کے خیال سے کبھی غافل نہ رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سازندوں اور موسیقی کے فن کے ماہروں کی ہر وقت تلاش جاری رہتی تھی تاکہ پریوں کی تعلیم جاری رہے اور وہ اس فن میں ماہر ہو جائیں۔

امّن و امامن، ان دونوں بہنوں نے ایک روز کہا کہ ہمارے بعض رشتے دار اس فن میں بڑے بے مثال ہیں۔ میں نے یہ سن کر امّن و امامن کے ان رشتے داروں کو حاضری کا حکم دیا، چنانچہ ایک دن محفل چودھویں رات کے چاند کی طرح کی منعقد کروائی اور خود میں خاص مکان کے برج کی چلمنیں چھڑوا کر امّن و امامن کے ساتھ ستار لے کر بیٹھ گیا اور ان آنے والوں کا انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد وہ لوگ آ گئے۔ یہ کُل چار آدمی تھے۔ ان میں ایک امّن اور امامن کا باپ تھا جس کا نام نتھو خاں تھا، دوسرا شخص ان کا چچا تھا، اس کا نام غلام نبی، تیسرا ان کا برادرِ نسبتی گھسن جان نام تھا، چوتھا ان کا ماموں غلام حیدر۔ ان چاروں نے آتے ہی مجرے کے بعد سرود شروع کر دیا۔ ادھر پردے کے پیچھے سے میں بھی ستار کی آواز برسرِ محفل پہنچا رہا تھا۔ اس وقت محویت و بے خودی کا کچھ ایسا عالم طاری تھا کہ در و دیوار اور ماہ و انجم تک ششدر معلوم ہوتے تھے، حاضرین میں سے ہر ایک کی زبان سے کلماتِ تحسین ادا ہو رہے تھے، ان لوگوں کا گانا اتنا اثر انگیز تھا کہ میں نے اپنا سر چلمن پر رکھ دیا۔

اس روز کے مظاہرے کے بعد نتھو خاں اور گھسن جان کو حور پری اور سلطان پری کی تعلیم کے لیے ملازم رکھا۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک ناچ اور گانے کے ماہرینِ فن ملازم رکھے گئے۔ ثابت علی اور چھجو خان دونوں بھائی سازندوں کے زمرے میں دوسری پریوں کی تعلیم کے لیے ملازم رکھے گئے اور ہر روز ایک جلسۂ طرب و محفلِ نشاط کے انعقاد کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

خود میں بھی نتھو خاں کے شاگردوں کے ساتھ گایا کرتا تھا، تھوڑی مدت میں، میں اس قابل ہو گیا کہ اپنے استاد کو پیچھے کر دیا۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے جب کہ غلام رضا میرے ہاں ملازم ہوا۔ اس کا تذکرہ میں نے پیشتر کیا ہے، اس کی عمر کوئی چھبیس سال کی تھی، پستہ قد، کسی قدر فربہ اندام

آنھیں خوب صورت، خوش طبع اور خوش مزاج آدمی تھا، وہ ایک زبردست طاقت کا بھی مالک تھا۔ ایک روز ہرن کا سینگ لے کر تنکے کی طرح توڑ دیا تھا۔ اطاعت گذاری میں بھی لاجواب تھا، یہی سبب ہے کہ میں نے ہر وقت اس کو حاضر رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔

پری خانہ کی آراستگی

اس عرصے میں ایک چھوٹا سا مکان فنِ موسیقی کی تعلیم کے لیے میں نے مخصوص کروایا جس کی آرائش و زیبائش میں انتہائی تکلف سے کام لیا گیا اور اس خانۂ رشک ارم کو 'پری خانہ' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ مکان سراسر پریوں اور گانے والیوں کے قبضے و تصرف میں تھا۔ مکان کے صحن میں سفید سنگِ مرمر کا فرش کروایا گیا اور اس فرش پر چینی کے نہایت عمدہ اور خوب صورت گلدستے سجائے گئے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لکڑی کی چوکیاں اور قیمتی پلنگ رکھے گئے۔ باہر کے دروازے پر ترکی عورتوں کا پہرہ تھا، جس کی وجہ سے کسی غیر کو اندر آنے کی مجال نہ تھی، البتہ داروغہ نجم النساء بیگم، امّن و امامن، پری خانہ کی پریاں اور گانے والے بے روک ٹوک آ جا سکتے تھے۔

پری خانے میں غلام رضا، گھسن جان، چھجو خان اور ثابت علی روزانہ دو تین پہر تک موجود رہتے اور ان کی صحبت نشاط سے محفل گرم رہتی تھی۔ اس طرح پریوں کی بھی تعلیم و تربیت ہو جایا کرتی۔ میں بھی موسیقی کا علم حاصل کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔

منّا سے ملاقات

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا۔ میرا یہ ذوق و شوق اور بڑھتا گیا اور میری یہ خواہش ہوئی کہ گانے اور ناچنے والی جتنی بھی عورتیں دستیاب ہوسکیں، اچھا ہے۔ چنانچہ ہر شخص پر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ جو شخص بھی اس مطلب کی عورتیں میرے حضور میں پیش کرتا تھا اس کے لیے ایک نیا لفظ 'معروضہ' وضع کیا گیا تھا۔ فرض کیجیے کسی کے توسط سے کوئی گانے ناچنے والی عورت آتی تو کہا جاتا کہ فلاں معروضہ حاضر ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ عورت میرے گھر پڑنے کو آئی ہے۔ لہٰذا آئندہ کسی عبارت میں 'معروضہ' کا لفظ آئے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ اگر کسی جگہ عرضی اور عرض داشت کے الفاظ آئیں تو ان کے معنی وہی ہوں گے جن معنوں

میں یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ایک روز ایسا ہوا کہ داروغہ نجم النساء بیگم اور امّن واما من نے یک زبان ہو کر کہا کہ 'حضور کے لیے ہم نے ایک 'معروضہ' انتخاب کیا ہے جو زمانے میں بے مثال ہے اور قدر دانوں کا خیال ہے کہ ایسا پیکرِ خوبی کبھی چشمِ افلاک نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ رقص و سرود کے فن میں بھی یکتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ حسنِ صورت میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔ عمر اس کی سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں، اس جانِ خوبی نے ایک روز آپ کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ اس روز سے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ وہ پریوں میں داخل کر لی جائے۔ اس کا نام منا ہے۔' تب میں نے اس کے خاندانی حالات دریافت کیے تو بیان کیا گیا کہ وہ وزیرن کی حقیقی بھانجی ہے اور اپنی خالہ سے مخفی طور پر حضورِ والا کے فیضِ محبت کی طلب گار ہے، یہ بات معلوم کر کے میں صبر و تحمل کھو بیٹھا۔ اس کے اشتیاقِ دید میں میرے لیے رات دن ایک ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس کی خبر وزیرن کو بھی ہوئی، وہ بہت پریشان ہوئی اور اس کی زندگی دوبھر ہو گئی اور رقابت کی آگ میں جلنے لگی، مختلف طریقوں سے منّا کی طرف سے مجھے ڈراتی رہی، لیکن اس کو کامیابی نہ ہوئی بلکہ میرے دل میں اس کے عشق کی آگ اور تیز ہوتی گئی۔ انجامِ کار ان تین خواتین کی کوششوں سے ایک دن رات کو منّا میرے گھر آ گئی۔ وہ رات کس قدر عیش و مسرت لے کر آئی تھی میں کچھ بیان نہیں کر سکتا، لیکن جب صبح ہوئی تو اس سنگین جرم کے بدلے میں اپنی برادری کی عدالت سے اس غریب کو قید کی سزا ہوئی، لیکن قید خانے میں بھی ایک لمحے کے لیے وہ میری یاد سے غافل نہ رہی، کبھی تو وہ زار و قطار روتی تھی اور کبھی میری پرسشِ حال کرتی تھی۔ آخر وہ میر محمد مہدی کی ذہانت اور جان توڑ کوشش سے قید سے آزاد ہوئی اور میرے گھر رہ گئی۔ اس کی محبت کی آگ میرے دل میں تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ میرے ہاں کی معشوقوں اور خوب صورت پریوں کی محفلیں دیکھیں تو اس میں تابِ ضبط نہ رہی اور آتشِ رشک سے اس کا سینہ پھنکا جاتا تھا، اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ مختلف تجویزیں بھی سوچنے لگی تھی، جب منّا میرے گھر پڑ گئی تو وزیرن نے مجھ سے ترکِ ملاقات کر لی اور حکیم نواب مرزا اور علی بخش رسالدار جیوش سے ربطِ محبت بڑھایا۔ پھر ان سے بھی الگ ہو کر حاجی خانم کے بھائی شیدی احمد کو اپنے کمندِ عشق کا اسیر کر لیا۔ آج کل اسی کے گھر میں عسرت و تنگدستی کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ شیدی احمد کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ یہ ایک پچاس برس کے سن کا آدمی ہے لیکن

خدا جانے وزیرن اس بوڑھے کھوسٹ کے گھر کیوں پڑی ہوئی ہے۔ لاحول ولاقوۃ الاّ باللہ۔

منّا کا فریب دینا

انہیں دنوں چھوٹے خاں نام کا ایک شخص ہمارے شہر میں وارد ہوا۔ یہ شخص شاہ جہاں آباد کا رہنے والا تھا، طبلہ بجانے کے فن کا ماہر اور اس فن کا منتہی تھا۔ وہ چونکہ ذریعۂ معاش کی تلاش میں آیا ہوا تھا اس لیے میرے ہاں ملازمت کی کوشش شروع کر دی اور آخرالامر شیخ غلام علی کی معرفت طبلہ نوازوں کے زمرے میں ملازمت مل گئی۔ وہ کوئی پینتیس برس کا خوش رو اور کسرتی جسم کا آدمی تھا، رنگ انتہائی گورا، اس کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی اور اسے سیر سپاٹے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اکثر زنانِ بازاری اس پر جان نچھاور کرتی تھیں اور ایک دنیا اس کی والا و شیفتہ تھی، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ مصاحبت کے ڈھنگ خوب جانتا تھا، غرض عجیب خوبیوں کا آدمی تھا، عاشق پیشہ معشوق صنعت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اپنی ان ہی خوبیوں کی بدولت وہ میری قدر دانی و توجہ سے مشرف ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ہمراہیوں سمیت 'بہارِ محفل' کے معزز خطاب سے سرفراز ہوا اور مجھ سے اس کا ربط و ضبط اس قدر بڑھا کہ وہ غلام رضا کے مرتبے تک پہنچ گیا۔ اس کی کچھ کچھ توجہ منّا یعنی امتیاز پری پر بھی تھی۔

امتیاز پری خواہ مخواہ رات دن حسد کی آگ میں جلتی تھی۔ ایک روز اسی نامبارک جذب سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن میں نے اسے منع کیا۔ اس پر اس نے کہا کہ 'میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے لیے جانا چاہتی ہوں، آپ کو کچھ زیادہ انتظار کی زحمت نہ دوں گی۔' میں اس کے فریب میں آ گیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ دو روز تک بھی واپس نہ آئی تو میں بڑا پریشان ہوا اور داروغہ نجم النساء بیگم کو اس کے گھر بھیجا۔ لیکن اس نے میرے گھر آنے سے صاف انکار کر دیا اور کسی قیمت پر بھی راضی نہ ہوئی، جب میں نے یہ واقعات سنے تو بڑا دکھ ہوا اور اپنا ہاتھ دانتوں میں لے کر کاٹنے لگا۔

امتیاز پری کا انتقال

اسی زمانے میں فیروز خواجہ سرا کے توسط سے ایک اور خواجہ سرا محمد حسین میرے ہاں ملازم ہوا۔ یہ

شخص قبل ازیں سیف الدولہ میر ہادی کی بیوی کے ہاں غلام رہ چکا تھا۔ یہ ایک پچیس سال کا نوجوان تھا، نہایت نیک، امانت دار اور جاں نثار شخص تھا، غرض کہ اس میں کوئی عیب بھی نہ تھا اور میرے ساتھ اس نے خیر اندیشی کا کچھ ایسا سلوک کیا کہ میں اب تک اس کا ممنون ہوں۔ وہ خدمت گذاری میں سرگرمی و مستعدی سے مصروف رہتا تھا۔

جب میں نے داروغہ نجم النساء بیگم کی زبانی امتیاز پری (منّا) کا حال سنا تو آپے سے باہر ہو گیا اور محمد حسین خاں مذکور کو حکم دیا کہ اسی وقت جا کر اس کو زبردستی اس کے گھر سے کھینچتا ہوا میرے روبرو لائے۔ یہ حکم سنتے ہی محمد حسین خاں نے ذرا بھی تامل نہ کیا اور فوراً روانہ ہو گیا اور کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ امتیاز پری کو گھسیٹتا ہوا لے آیا، ہر چند وہ زار و قطار رو رہی تھی، لیکن میرے حکم کی تعمیل میں اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ جب وہ میرے سامنے لائی گئی۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور کہا 'تجھ پر خدا کی مار ہو کیا اسی صورت سے تو میری محبت کا دم بھرتی تھی'۔ مختصر یہ کہ دو ایک روز اسے اپنے گھر میں رکھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے اور میری جان کی دشمن ہو رہی ہے اور کسی صورت وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے تو میں نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نشانی کے طور پر دے کر بڑی مشکل سے اس کو روانہ کر دیا، اس کے بعد پھر اسے کبھی بلانے کا خیال نہ ہوا، اس واقعے کے تقریباً ایک سال بعد اطلاع ملی کہ مرض دق میں مبتلا ہو کر مر گئی ہے۔ خس کم جہاں پاک۔

دلربا پری

امتیاز پری کو دور کرنے کے بعد میں دوسری پریوں کے رقص و سرود میں اپنے اوقات نہایت پُر لطف طریقے پر گذار رہا تھا۔ دن رات شب برات تھی۔ ایک روز اکبرالدولہ بہادر کے توسط سے چنی نامی طوائف میری محفل میں مجرے کے لیے حاضر ہوئی۔ جیسے ہی میں نے اسے دیکھا اس پر سو جان سے عاشق ہو گیا۔ ادھر اس نے اپنا کُل زیور اپنے جسم سے اتار کر اپنی ماں (فیضو چونے والی) کو دے دیا اور کہا کہ 'یہاں سے اب میں ہرگز نہ جاؤں گی'۔ وہ رونے پیٹنے لگی۔ اس کے بعد چنی نے اپنے اوپر سے دو ہزار روپے صدقے کر کے فیضو کے حوالے کیے، روپے کو دیکھ کر وہ خوش ہوئی اور اسی وقت ایک راضی نامہ لکھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے چنی کو دلربا پری کے خطاب سے ملقب کیا۔

جاسوسوں نے اس واقعے کی خبر میرے والد ماجد حضرت جنت مکان کے گوش گذار کرادی۔ حضرت جنت مکان نے دلربا پری کو اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ میں یہ سن کر بہت پریشان ہوا اور دلربا پری کی مفارقت کے خیال سے بڑا رنج پہنچا۔ دلربا پری نے مجھے تسلی دیتے ہوئے عرض کی 'حضور والا اس قدر ملول نہ ہوں، مجھے بلاخوف آپ بھیج دیجیے میں بادشاہ سلامت کے ملاحظہ میں اپنی ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا راضی نامہ پیش کردوں گی تاکہ انہیں یہ یقین ہو کہ میں آپ کے ہاں ظلم و تشدد کی بنا پر نہیں آئی۔' گو اس کی تجویز معقول تھی، لیکن اس کو رخصت کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری ہی ایسی تھی، آخر کیا کرتا؟ قصہ مختصر بادل نخواستہ میر محمد مہدی داروغہ کے ہمراہ شاہ جم جاہ حضرت جنت مکان کے حضور میں روانہ کردیا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی حضور سے عرض کی کہ میں بادشاہ سلامت کے عدل و انصاف کی خواستگار ہوں۔

مجھے حرام کاری سے دلی نفرت ہے اور میں باعزت زندگی گذارنا چاہتی ہوں، ثبوت میں میری ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا راضی نامہ بھی پیش کرسکتی ہوں۔' ارشادِ والا ہوا کہ راضی نامہ پیش ہو، اس نے فوراً پیش کردیا۔ راضی نامہ کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ارشاد ہوا کہ اسی طرح بحفاظت تمام ولی عہد بہادر کے محل میں پہنچا دیا جائے۔ دراصل اس عورت نے مجھ پر یہ اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس کے بارگراں سے میرا سر نہیں اٹھتا۔ اس عورت کی عمر کوئی تیس برس کی تھی، گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، متناسب اعضا، ناچ گانے کے فن میں بھی یکتا تھی ___ جب وہ میرے پاس رہ گئی تو پریوں کی تعلیم میں اپنا زیادہ تر وقت صرف کرنے لگی، جیسے جیسے دن گذرتے جاتے تھے میرے دل میں اس کی محبت کی افراط ہوتی جاتی تھی۔

میں نے پریوں کے لیے طرح طرح کے لباس تیار کروائے تھے اور اس کا انتظام و انصرام نواب خاص محل کے سپرد تھا، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس خصوص میں بڑی مستعدی اور خوش ذوقی کا ثبوت دیا اور نہایت عمدگی سے اس کام کی انجام دہی کیا کرتی' ان معاملات پر میرا کئی لاکھ روپے خرچ ہوتا تھا۔

سرفراز پری

یک پیشہ ور عورت تھی، جس کا نام تھا گنا۔ اس نے اس پیشے سے توبہ کرلی تھی۔ پھر اس کے بعد اپنے

ایک رشتے دار سے شرعی عقد کرلیا اور بھلی عورتوں کی سی زندگی گذارنے لگی۔ کہتے ہیں ایک رات اس نے مجھے خواب میں دیکھ لیا اور وحشت کے عالم میں بے دار ہوئی اور اسی دم اس کے دل میں میری محبت کا تیر پیوست ہوگیا۔ اس کی عمر کوئی ستائیس برس کی تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغ، اس کی آنکھیں اور بھنوئیں خوب صورت تھیں، قد و قامت نہایت موزوں۔

یہ عورت شیخ غلام علی کمیدان کے توسط سے فیروز خواجہ سرا کے ہاتھ لگی اور اس بات کی خواہش مند ہوئی کہ میرے ہاں پریوں کے زمرے میں شامل ہو، میں نے اس کی درخواست کو قبول کیا۔ لیکن چونکہ اس کا شوہر موجود تھا، اس لیے مجھے اپنے گھر رکھنے میں پس و پیش تھا۔ لہٰذا اس نے حضرت مجتہد العصر قبلہ و کعبہ کے ہاں جا کر طلاق لے لی۔ اس کے بعد مجھے اپنے پاس رکھنے میں کوئی عذر نہ ہوا۔ میں نے اس کو 'سرفراز پری' کے معزز خطاب سے سرفراز کیا اور میں اور پریوں کے مقابلے میں اس عورت کی محبت سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ خاتون خوش پوشاک و خوش مزاج واقع ہوئی ہیں۔

حیدری بیگم

حیدری بیگم مرثیہ خواں اس زمانے میں میرے ہاں ملازم تھی۔ وہ نہایت نیک و پاک باز عورت تھی۔ میں اس کی محبت کی دل سے قدر کرتا تھا۔ ایک دن داروغہ نجم النساء بیگم کے توسط سے میرے پاس آئی تھی۔ جب وہ جا چکی تو میں بھی اسے بھول گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ محلات میں اسے بھی لے جایا جائے، لیکن میں نے منظور نہ کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ایک روز اسی کوفت میں کانچ (شیشہ) پیس کر کھالیا، جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت والد ماجد کی طرف سے مجھے خوف ہوا۔ پھر فوراً میں نے اس کو ملازمت سے موقوف کر کے اس کے گھر رخصت کر دیا۔

سردار پری

انہیں دنوں امّن اور امامن کے ذریعے سے ایک طوائف کی لڑکی جس کی عمر صرف گیارہ سال تھی نذر کے طور پر میرے حضور میں پیش کی گئی۔ یہ لڑکی کمسن ہونے کے باوجود سرخ و سفید رنگت کی

تھی۔ آنکھیں بڑی اور خوب صورت تھیں۔ وہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کو تعلیم بھی دی گئی۔ اس کو میں نے سردار پری کا خطاب دیا۔

عجائب خانم

نواب خاص محل صاحبہ کے ذریعے سے ایک عورت میرے پاس لائی گئی جس کو میں نے عجائب پری کا خطاب دیا تھا۔ یہ عورت ناچ گانے میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔

رجب کی نوچندی

ایک روز حضرت عباس علیہ السلام کی درگاہ کی زیارت کے لیے ماہ رجب المرجب کی نوچندی میں تمام پریوں کو بھیجا۔ اس وقت پریوں کو نہایت مکلّف لباس اور بیش قیمت زیورات پہنائے گئے اور ان کی سواری کے لیے نفیس ترین فینسیں اور پالکیاں آراستہ کی گئیں۔ جب یہ کاررواں روانہ ہوا تو ایک عجیب کروفر نمایاں تھا، ایسا منظر شاید کبھی چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ میں نے ان پریوں کے ساتھ داروغہ میر محمد مہدی اور داروغہ نجم النساء بیگم کو روانہ کر دیا تھا۔

سنا کہ جس وقت پریوں کا یہ پرا روانہ ہوا، بازار میں راہ چلتے لوگوں اور درگاہ شریف کے تمام حاضرین کی نظریں اسی جانب تھیں۔ یہ بھی سنا کہ اسی رات حیدر حسین خاں سے تاک جھانک کے ضمن میں جھگڑا بھی ہوا۔ لیکن میر محمد مہدی نے کمال دانش مندی سے اس فساد کو رفع کروایا۔ پہر رات تک درگاہ میں گذار کر یہ لوگ خیریت سے واپس ہوئے اور میرے نہایت شکر گذار تھے کہ میں نے انہیں اس قسم کا موقع دیا، لیکن جب اس کی اطلاع حضرت جنت مکان کو ہوئی تو وہ سخت برہم ہوئے اور آئندہ کے لیے سخت تاکید فرمائی۔

ان لوگوں کو بے پردہ درگاہ کو بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے تین عورتوں کو محل قرار دیا تھا اور وہ پردے، میں رہتی تھیں، لیکن پریوں کے اس پردے کا کچھ مطلب ہی نہ تھا۔ لہٰذا ایک روز مجھے خیال ہوا کہ کسی کو محبت کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے دل میں جذبۂ محبت پیدا نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ معشوق اپنے کو آزاد تصور نہ کرے اس کی محبت کا اندازہ دشوار ہے۔ اس لیے میں نے ان کی خواہش کو پورا کرنا ضروری سمجھا تھا۔

سلیمان محل

دن اسی طرح گذر رہے تھے۔ چند دنوں بعد سنا کہ نواب نشاط محل اور سلیمان پری حمل سے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی میں نے سلیمان پری کو محل میں داخل کر کے سلیمان محل صاحبہ کا خطاب مرحمت فرمایا اور اسی وقت عمدہ قسم کی اشیا اور قیمتی لباس، جواہرات کی کشتیاں اور کچھ دوسرا سامان انہیں مہیا کیا۔ اور ساتھ ہی انہیں پردے میں بٹھایا۔

خدا کے فضل و کرم سے حمل کے دن پورے ہونے کے بعد ان دونوں محلوں سے ماہ ومشتری تولد ہوئے اور ان کے ضیائے حسن سے تمام دنیا روشن ہوگئی۔ نواب نشاط محل صاحبہ کے بطن سے مرشد زادۂ والد دو ماں تولد ہوئے۔ اس کے دادا صاحب نے اس کی والدہ کو خلعت تہنیت اور نتھ عنایت فرمائی اور میرے فرزند کو مرزا سپہر قدر خطاب عنایت کیا۔ نواب سلیمان محل صاحبہ سے لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کو اس کے دادا صاحب نے سپہر آرا کبریٰ بیگم کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ الحمد للہ۔

سپہر آرا

میری بہن جو میرے چچا منیر الدولہ کے بیٹے سرفراز الدولہ سے منسوب ہیں۔ ان کے اولاد تو ہوتی تھی لیکن ایک بچہ بھی زندہ نہ رہا۔ اس لیے میری والدہ صاحبہ کی رائے سے حضرت جنت مکان نے میری لڑکی سپہر آرا کبریٰ بیگم صاحبہ کو ان کی گود میں ڈال دیا اور اس کی پرورش و نگہداشت بھی انہیں کے ذمّے کر دی۔ گاہے گاہے سپہر آرا کبریٰ بیگم صاحبہ کو لایا جاتا تاکہ میں اور اس کی ماں اسے دیکھ لیں۔ ایک رات ہمارے ہاں گذارنے کے بعد وہ دوسرے دن صبح واپس چلی جاتی تھیں۔ یہ بات اگرچہ مجھے پسند نہ تھی اور بچی کی جدائی میں بعض وقت میں پریشان سا ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے والدین کی مرضی ہی ایسی تھی۔ میں کیا کر سکتا تھا ان کی اطاعت بہر حال مجھ پر فرض تھی۔ وہ جو کہیں اس کی تعمیل مجھ پر لازم تھی۔

مرزا بیدار بخت

اس کے چند ہی روز بعد یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ نواب خاص محل صاحبہ حاملہ ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ مدت معیّنہ گذرنے کے بعد مثل ماہ تاباں ایک لڑکا تولد ہوا۔ اس کے

دادا نے اس خوشی میں مبارک باد کی گیارہ ضرب توپ کی سر کروائیں۔ خاص خاص لوگوں اور مقربان نے مبارک باد کی رسم ادا کی اور نذریں پیش کیں۔ اس خوشی میں ایک 'جشنِ جمشیدی' کا اہتمام کیا گیا اور محفل طرب منعقد کی گئی۔ پریوں نے جواہرات بیش بہا اور لباسِ فاخرہ سے اپنے آپ کو سجایا۔ اللہ اللہ ایک عید کا سماں تھا۔ یہ ایک ایسا جشنِ مسرت تھا کہ پھر کوئی ایسا جشن نہیں ہوا۔ اس کے دادا نے مرزا بیدار بخت کے خطاب سے اسے ملقب فرمایا اور بڑے چاؤ سے اناؤں کی گودوں میں اس کی پرورش ہوتی رہی۔

شمس آرا بیگم

چند روز کے بعد ایک اور خبر مسرت افزا ملی کہ محل کی ایک ملازمہ فرخندہ خانم حمل سے ہے۔ میں پھر سجدۂ شکر بجا لایا اور اسے پردے میں بٹھا دیا۔ لیکن محل کا اعزاز نہ بخشا۔ صرف فرخندہ خانم صاحبہ کا خطاب دیا گیا۔ دن پورے ہونے کے بعد ایک دختر نیک اختر پیدا ہوئی۔ اس کے دادا صاحب نے اس کو شمس آرا بیگم صاحبہ کا خطاب عنایت فرمایا۔

شہنشاہ پری

ایک روز داروغۂ نعمت خانہ فیروز خواجہ سرا اور شیخ حسین علی کے ذریعے سے پیاری نامی ایک عورت میرے ملاحظہ میں آئی۔ یہ عورت عمدہ آبادی والی تھی۔ میں نے اس کو پریوں کے زمرے میں شامل کر لینے کا حکم دیا اور شہنشاہ پری خطاب دیا اور دستور کے مطابق اس کو بھی رقص و سرود کی تعلیم دی جانے لگی۔

معشوق پری

جہانی نامی ایک ڈومنی کی لڑکی پیارے صاحبہ محمد حسین خواجہ سرا کی معرفت میرے ملاحظہ میں لائی گئی۔ میں نے اس کو بے حد پسند کیا اور اس کو گھر بٹھا لیا۔ معشوق پری اس کا خطاب قرار پایا۔ رقص و سرود کی اس کی بھی تعلیم ہونے لگی۔

مہک پری

امّن واامامن کی معرفت ایک زنِ خانگی آئی جو میرے مرغوب طبع ہوئی۔ اس کو میں نے پریوں میں شامل کرلیا اور مہک پری کے خطاب سے نوازا۔ رقص وسرود کی اس کی بھی تعلیم ہونے لگی۔

دلدار پری

کچھ ہی دنوں بعد بندی جان الٰہی نامی ایک عورت محمد حسین علی خواجہ سرا کی معرفت میرے ملاحظہ سے گذری اور پسند خاطر ہمایونی ہوئی۔ اس کو دلدار پری کا خطاب دیا گیا۔ حسبِ دستور پری خانہ میں اس کو بھی رقص وسرود کی تعلیم دی جانے لگی۔

حضور پری

اس زمانے میں داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ کی معرفت حسینی نامی ایک لڑکی آئی اور میں اسے پسند آیا۔ اس نے صرف قواعد موسیقی سیکھنے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ بھی کچھ کچھ۔ اس کو حضور پری کا خطاب دیا گیا۔ یہ لڑکی بدہیہ نامی طوائف کی بیٹی تھی۔

معشوقہ ٔخاص

ایک عجیب داستان سنیئے کہ نواب نشاط محل صاحبہ کے بطن سے سپہر قدر کی پیدائش کے سلسلے میں جب بزمِ نشاط برپا تھی۔ مختلف قسم کی بوڑھی رقاصائیں اور مطربان خوش آواز کو بھی بلایا گیا تھا۔ اسی ضمن میں اچھے نامی ایک طوائف بھی آ گئی تھی۔

خوب صورت چہرے تو دیکھنے میں آتے ہی ہیں، لیکن اس کا سراپا میں کیا بیان کروں، کیا تھا۔ بس خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا جو نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ خوش رو، خوش آواز، چال میں بجلی کی تڑپ، پری رو، سیم بر، نازک ادا، نازک بدن، سرو قد، سیم تن، غنچہ دہن، گل پیرہن، پری پیکر، حور شمائل، اپنی ایک ایک ادا سے حاضرینِ محفل کے دل پارہ پارہ کر رہی تھی۔ اس کے حسن تقویٰ شکن کو دیکھ کر ملائک بھی اپنی عبادت کے خیال سے غافل تھے۔ وہ ہنستی تو یوں معلوم ہوتا پھول جھڑ رہے ہیں۔ جس وقت میں نے اس ستم گر دل نواز کو دیکھا تو صبر وضبط کا یارانہ رہا۔ اس

وقت میں 'گلزار منزل' کے بالا خانے پر بیٹھا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس جاں سوز نظارے سے مجھ کو ضعف آ گیا تھا۔ اس روز کثرت سے ٹڈیاں آئی تھیں اور میرے دل کی سرزمین پر محبت کے بادل برس رہے تھے۔ اس میں شک نہیں اس زمانے میں خود مجھ میں بھی بتان شوخ وشنگ کے سے آثار موجود تھے۔ میری طلسم آفریں آنکھوں کے آگے سامری کو بھی سبقت لے جانا محال تھا۔ یوسف کو میرے حضور میں بار پانا مشکل تھا۔ میری زلف پر پیچ مشکِ تا تار کو شرمندہ کرتی تھی۔ میری ناوک مژہ اغیار کے سینوں میں کانٹے کی طرح چبھتے تھے۔ حسن و جمال، لطافت و ملاحت میرے آگے سر بسجود تھے۔ ادا و ناز میری ادنیٰ سی کنیزیں تھیں۔ آہوان دم خوردہ میری چشمِ پُر فریب سے رک جاتے تھے۔ سنبل پیچاں میری کاکلوں کی اسیر تھی۔ میرے رخسار مثل آئینہ حلب۔ میری زنخداں سیب سرخ تھی۔ میری آنکھیں ناتوانوں کے لیے مایہ قوت تھیں۔ میرے ہونٹ معشوقوں کے لیے جاں نواز تھے۔ میری بھنویں کمان کیانی۔ میری پیشانی چاند کی طرح چمکتی۔ میرے حلقۂ گیسو کمندِ بلا تھے۔ جس میں بے شمار دل اسیر ہو کر تڑپتے تھے۔ میرے مژگاں کے نیزوں سے عاشقوں کے دل زخمی تھے۔ میری ابرو کی تیغ معشوقوں کی جان کی دشمن تھی۔ زلفیں شب تیرہ و تار کی مانند اور عارض صبح وصال کے مثال تھے۔ قد و قامت سرو مراد کی طرح، جو معشوقوں کے دل کو ہزار فریب سے قابو میں کر لیتا تھا۔

مختصر یہ کہ وہ معشوقۂ طناز بڑی آرزو و تمنا کے ساتھ مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ ادھر میری حالت بھی غیر ہوئی جاتی تھی۔ وہ جب بھی ناچتی میرے قریب آ کے میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور میں چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ آخر کار وہ بزم ختم ہوئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ لیکن وہ میری محبت کا تیر کھا چکی تھی۔

یہ واقعہ رونما ہو کر تین چار ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اس دوران میں دو چار بار اس کی ملاقات میسر آئی۔ لیکن وہ اپنی ماں کی وجہ سے مجبور تھی اور اپنی ماں سے اس قدر ڈرتی تھی کہ اپنی محبت کا اظہار بھی نہ ہونے دیا اور دل ہی دل میں میری محبت کو پروان چڑھاتی رہی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی ماں سے لڑائی جھگڑا بھی کرنے لگی۔ انتہائے مجبوری میں کبھی بے اختیار ہو کر رو پڑتی۔ کبھی میرا اکبر علی کے ذریعے اپنا پیامِ محبت میرے نام بھیجا کرتی۔ اسی زمانے میں ایک بار میں نے پھر اسے مجرے پر بلایا۔ لیکن حضرت والد ماجد اور والدۂ معظمہ کے ڈر سے فوراً رخصت کر دیا، کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان لوگوں نے مجھ پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے گھر بٹھانے کا

کبھی خیال بھی نہ آیا۔ لیکن میرا کبر علی کی سعی بلیغ سے ایک روز وہ میرے گھر آ کر پڑ ہی گئی اور چھ ہزار روپے اپنے اوپر سے صدقہ اتار کر اپنی ماں کو دیئے۔

یاسین پری جس کے میرے گھر پڑنے کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے رقص وسرود کی تعلیم کے بعد یکتائے زمانہ ہوگئی اور اس کا حسن بھی کچھ ایسا نکھر آیا کہ وہ لاثانی ہوگئی۔ اگر چہ مجھے اس سے پہلے ہی سے الفت زیادہ تھی۔ لیکن اس کے مزاج میں ابھی بچپن تھا اور علم موسیقی میں بھی کامل نہ ہونے کے باعث میں اس کی طرف التفات نہ کرتا تھا۔ لیکن کچھ زمانہ گذرنے کے بعد وہ سچ مچ ایک پری بن گئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس سے محبت کی ابتدا کی۔ خود یاسمین پری بھی مجھ پر سو جان سے فدا تھی۔

مجھے اس سے اس درجہ محبت ہوگئی کہ اس کے بغیر خواب وخور حرام ہوگیا۔ جب وہ ناچ گانے میں مصروف ہوتی تو میں اس کے جمال دلفریب وادائے دل ستاں میں کھو جاتا۔ یہ سلسلہ کوئی ایک سال تک جاری رہا اور اس کا ستارۂ الفت میرے فلک توجہ پر ضوفشاں رہا۔ آگے چل کر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ یہ رشتۂ محبت ٹوٹ گیا۔

حالات یہ تھے کہ کچھ دنوں سے میں سرفراز بیگم پر مائل وملتفت تھا۔ یہ دیکھ کر یاسمین پری برداشت نہ کر سکی اور وہ آتشِ رشک وحسد میں جلنے لگی اس لیے اس سے ترکِ تعلقات کے علاوہ کوئی صورت ہی نہ تھی۔

یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ جبکہ بتوسط مصاحب خاص غلام علی خاں پدر غلام رضا خاں، غلام نبی خاں اس کا برادر اور غلام حیدر خاں، اس کے برادرِ نسبتی اور چھوٹے خاں کے ذریعے اس کا برادر گھسیٹے خاں اور غلام احسن خاں کے توسل سے اس کا برادرِ نسبتی محمد حسن خاں جو سارنگی بجانے والوں کی ذات سے تھا حسبِ پسند الٰہیا خاں اور چھجو خاں کے ذریعے اس کے دو برادر حید علی اور نثار علی اور قطب علی کے ذریعے اس کا برادر خواجہ بخش خاں ملازم ہوئے اور میں نے ان کو 'مصاحبانِ خرد' کا خطاب دیا۔

مرزا فریدوں قدر

معشوق پری کو موسیقی کی تعلیم شروع کیے ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ قاصد خوش مقال نے یہ خبر

پُرمسرت سنائی کہ وہ حاملہ ہوچکی ہے۔ میں نے خداوندِ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور پری مذکورہ کو پردے میں بٹھا کر اس کو محل کا درجہ عطا کیا۔ اس کے بعد مختلف ملبوسات فاخرہ اور زیورات بیش بہا اور چند ایک تحفے اس کو عنایت کیے۔ نیز اس کے رہنے کو ایک آراستہ محل سرا لیے تجویز کر کے اس کے حوالے کیا۔

ایامِ حمل گذارنے کے بعد خدائے بزرگ و برتر کی مہربانی سے ماہ محرم الحرام کی نو تاریخ کو فرزند فرخندہ فال پیدا ہوا۔ میرے والد ماجد حضرت جنت مکان نے مرزا فریدوں قدر بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا ساتھ ہی مجھے بھی ایک خلعت فاخرہ مرحمت فرما کر میری عزت بڑھائی اور معشوق پری کو نواب معشوق محل صاحبہ کے خطاب سے نوازا۔

مہر آرا بیگم

اسی دوران میں ایک اور مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ عزت پری امید سے ہے۔ میں یہ سن کر پھر ایک بار سجدۂ شکر بجالایا اور عزت پری کو پردے میں بٹھا دیا اور عزت محل صاحبہ خطاب دیا اور دوسری محلات کی طرح اس کو بھی ممتاز و معزز فرمایا۔ دراصل نواب معشوق محل صاحبہ اور عزت محل صاحبہ ایک ساتھ ہی حاملہ ہوئی تھیں لہٰذا محرم الحرام کی سات تاریخ کو عزت محل صاحبہ کے بطن سے دختر نیک اختر مثل ماہتاب ضوفشاں متولد ہوئیں۔ حضرت والد ماجد یعنی اس کے دادا نے اس کا مہر آرا بیگم صاحبہ نام تجویز کیا۔ مرزا فریدوں قدر بہادر اپنی بہن مہر آرا بیگم صاحبہ سے صرف دو روز چھوٹے تھے۔

داروغہ نجم النساء بیگم کا سانحہ ارتحال

راویٔ غمگین و راقم دل گرفتہ داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ کا کچھ حال رقم کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ قارئین خوش باش و وضعداران نکتہ سنج کو لمحات مسرت میں لمحات موت کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کی حیثیت محض پانی کے ایک بلبلے کی سی ہے۔ لہٰذا ہر جاندار کو ایک دن داروئے مرگ ناگہانی کا مزہ چکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دانایانِ عالم و عاقلانِ بالغ نظر اس دنیا کو نقش بر آب سے زیادہ تصور نہیں کرتے اور اس کو ایک چلتی پھرتی چھایا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ایسا

اس لیے سمجھتے ہیں کہ ہم جس کو سایہ سمجھ بیٹھے ہیں وہاں تھوڑی دیر میں کڑی دھوپ سر پر آ جاتی ہے۔ **فاعتبروایااولی الابصار** اور لقوائے آیت کریمہ **کل نفس ذائقتہ الموت** اور **کل من علیہافان یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام** ۔لازم وملزوم ہے۔لہٰذا میں اپنے اشک ملال کو اپنی ناامیدی کی آستین سے صاف کر کے قارئین کی خدمت میں یہ ہزار رنج و ملال عرض پرداز ہوں کہ داروغہ نجم النساء بیگم صاحبہ جو زنان خانے کی داروغہ، میری شفیق وانیس جلیس ورفیق اور ہمدم ومحبوبہ بے ریا تھیں اور جو مجھ پر پروانہ وار جان چھڑکتی تھیں یکا یک پیک قضا کا نشانہ بن گئیں اور مجھ فراق زدہ کو مجبور و پُر ملال چھوڑ گئیں۔ جب میں نے یہ خبر وحشت اثر سنی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور میں دیوانہ سا ہو کر از خود رفتہ ہو گیا اور بسترِ غم پر گر کے زار وقطار رونے لگا۔اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔مجبوری وناچاری کی حالت میں دل پر صبر کا پتھر رکھ کر بیٹھ رہا اور مرحومہ کے لیے دعائے خیر کرتا رہا۔

امیر پری

نواب نشاط محل صاحبہ کے ذریعے ایک عورت میرے گھر میں داخل ہوئی اور امیر پری کے خطاب سے سرفراز کی گئی۔اصل میں یہ ایک طوائف تھی جو کرم بخش والی کے نام سے مشہور تھی۔اس کی عمر اٹھارہ برس یا اس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔حسبِ قاعدہ اس کو بھی پریوں میں شامل کرلیا گیا اور موسیقی کی تعلیم پر اس کو بھی لگا دیا گیا، لیکن چونکہ وہ پہلے ہی سے اس فن کی ماہر تھی اس لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔لیکن چونکہ بے پروائی سے کام لینے میں موسیقی کے فن پر برا اثر پڑنے کا امکان تھا اس لیے مشق جاری رکھنے کے خیال سے اس کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا گیا۔

وزیر پری

فیروز خواجہ سرا اور نواب خاص محل صاحبہ نے ایک عورت کو میرے ملاحظہ میں پیش کیا جس کو میں نے بے حد پسند کیا اور اپنے گھر میں ڈال لیا۔

یہ عورت سکھ بدن والی کے نام سے مشہور تھی، گرمی کے موسم میں وہ میرے ہاں آئی تھی اور اپنے ناچ گانے کا اتنا اچھا مظاہرہ کیا کہ میں نے بلا تامل اسے قبول کیا اور وزیر پری کا خطاب دیا۔

اس کی بھی تعلیم جاری رہی۔

امراؤ عمدہ خانم

ایک روز کا ذکر ہے کہ مطربان نغمہ سنج، ساقیان عہد شکن، ایک خاص ادائے دل نوازی کے ساتھ ہر طرف مے فروشی کر رہے تھے، عندلیبان ترانہ سنج وطیور شیریں سخن زمزمہ پردازی میں مگن تھے۔ بوئے گل چمن میں چاروں طرف پھیل کر شامِ جاں کو راحت بخش رہی تھی۔ موج ہوا دلبرانہ انداز سے گل مراد چن چن کر حاضرینِ محفل پر نچھاور کر رہی تھی۔ قصر خاقان دلہن کی مانند سجا ہوا تھا۔ ہر فانوس معشوق اصلی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ بلوریں جھاڑ اور گاچ کے درختوں کو ایک عجیب قرینے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ جابجا نامور بادشاہوں اور سلاطین سلف کی تصاویر آویزاں کی گئی تھیں۔ سرخ بانات کا نفیس ترین فرش بچھا تھا، موقع موقع سے قد آدم آئینے نصب کیے گئے تھے، خاص کر 'راحت منزل' کی تزئین و آرائش میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا تھا۔ 'حضرت باغ' کی نہر کا دل نواز منظر عجیب سماں پیش کر رہا تھا جس کو دیکھ کر ایک دنیا غرقِ حیرت تھی۔ 'چشمہ شیریں' کے اطراف مردنگیاں لگائی گئی تھیں۔ ولائتی لیمپوں پر شیشے کے کنول ڈھانپ گئے تھے، سلیقہ مند مالی پودوں اور درختوں کی دیکھ بھال کے لیے جگہ جگہ موجود تھے۔ باغ کی ہر روش نہایت صاف وشفاف تھی۔

قصر خاقان کے بیچوں بیچ ایک نفیس میز بچھائی گئی تھی، جس پر طرح طرح کے انگریزی کھانے، خوش ذائقہ فواکہات، شیشے، پتھر اور چاندی سونے کے برتنوں میں چنے گئے تھے۔ مختلف رنگوں کے گلدستے اور بیش قیمت مرتبان رکھے گئے تھے۔ انگریزی چھری کانٹے بھوکوں کے لیے نشتر کا کام دے رہے تھے اور ہر طرف ظروف میں مرغ روح کو اسیر کرنے کے لیے دھرے تھے۔ نو وارد خواجہ سرا محمد حسین خاں اسی تقریب کا منتظم تھا اور نہایت جوش وانہماک سے کام میں مشغول تھا۔ باورچی سہیل کی طرح اس 'ماہتاب اغذیہ' کے اطراف ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ لیموں اور فالسے کے شربت سے بھری ہوئی صراحیاں جگہ جگہ رکھی تھیں۔ اس میز کے اطراف نفیس وخوب صورت کرسیاں محبوبوں اور گل رخ پریوں کے لیے بچھائی گئی تھیں اور ہر کرسی پر ایک ایک پری چہرہ ہاتھ میں چھری کانٹا لیے ہوئے بیٹھی تھی۔ میرے لیے ایک الگ کرسی جو جواہر نگار مرصع تھی بچھائی گئی تھی، اس روز

میں بھی دولہا کی طرح سجا ہوا تھا۔ آبدار موتیوں کا تاج سر پر تھا اور قبائے ولی عہدی زیبِ بدن تھا۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں اور بازوؤں میں بیش بہا نورتن بندھے ہوئے تھے۔ نہایت ہی قیمتی آٹھ لڑا دست بند ہاتھوں میں تھا۔ سرخ اطلس کا پاجامہ جس کے ہر سوزن کے سوراخ پر موتی ٹانکے گئے تھے پہنے ہوئے تھا۔ نہایت نفیس مطلا جامہ زیبِ بدن تھا، جس پر قیمتی مروارید کے چاند تارے بنے ہوئے تھے۔ چمکتی ہوئی تلوار ہاتھ میں تھی۔ عطر حنا میں سارا جسم بسا ہوا تھا۔ میری پیشانی سے جوانی کا عالم اور آنکھوں سے شباب کی مستی نمایاں تھی۔ انگریزی باجے کی آواز سے ایک عجیب کیف برس رہا تھا۔ خوش آواز زہرہ جبین پریاں میرے سامنے ایک ادائے خاص سے گا رہی تھیں اور زہد شکن انداز سے ناچ رہی تھیں۔ یہ جلسہ امام ہمام کی پیدائش کے روز پندرہ تاریخ ماہ شعبان کو منعقد ہوا تھا۔

اس روز میں نے اپنی پیچ دار زلفوں کی لٹیں اپنے منہ پر چھوڑ رکھی تھیں۔ یکا یک ایک معشوقہ دل نواز، شوخ وعشوہ پرداز، دل آزار و دل فریب، سن برو سرو تمثال و غنچہ دہن میرے روبرو آئی۔ اس کی پلکیں نشتر زنی کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ ہلاکت آفریں زہر پلانے کو بے چین ہیں۔ سینے کا ابھار تجمل حسن کی غمازی کر رہا تھا۔ کان کیا تھے گوشوارہ حسن تھا۔ اس کا چہرہ کتابی مضمون عشق کا آموختہ تھا۔ ناک انگشت شہادت کی شاہد تھی۔ اس کے عارض ورق گلستاں و پیشانی ہم شبیہ بوستان تھی۔ آنکھوں کی سیاہی رشک دہ شب دیجور اور رخسار آئینہ چینی اور گیسوے دراز گلوئے رستم کے لیے کمند تھے۔ اس کے گیسوے مشکیں پر سنبل پیچاں تصدق اور لب خوش رنگ جنت کا خرمہ تھے۔ دانت بہشت بریں کی شیرینی لیے ہوئے تھے۔ اس کی زبان کیا تھی حسن و مستی کا خامہ تھا۔ اس کے ہاتھ برق تپاں کی مثال تھے۔ غرض کہ اس کا سراپا کچھ ایسا تھا کہ اس کی تصویر کشی کے لیے الفاظ کے کئی دفتر درکار ہیں، وہ ابھی پندرہ سال کے سن میں تھی۔ اس کے جمال جہاں آرا کے آگے موجودہ عہد کی تمام حسیناؤں کا حسن گرد تھا۔ اس کا نام امراؤ عمدہ خانم والی مشہور تھا۔ اسکے حسن کی جلوہ زائیوں سے ایک دنیا مبتلائے اذیت تھی، جس وقت میں نے اس کو اور اس نے مجھے دیکھا تو ہم دونوں کے دل تیرِ عشق کے گھائل ہو گئے۔ اس دوران میں رقص وسرود کا غلغلہ بیدار ہوا اور اس جلسے میں ایسا ہنگامۂ نشاط برپا ہوا کہ ایک عجیب لطف کا سامان پیدا ہو گیا اور ایسی پُرلطف صحبت اس سے قبل کبھی میسر نہ آئی تھی۔

دوسرے دن وہ معشوقۂ عاشق مزاج جذبۂ محبت سے مغلوب ہوکر اپنی زبان جادو اثر سے یوں گویا ہوئی کہ 'آپ کے جذبۂ محبت نے میری حالت ہی بدل کر رکھ دی ہے اور طاقت ضبط کا یارا نہیں رہا، لہٰذا اب کوئی ایسی تجویز روبہ عمل لانی چاہیے جو یادگار زمانہ ثابت ہو، میں زندگی بھر آپ کی تابع فرمان رہوں گی۔ اب دل آپ کو چھوڑ کر رہنا نہیں چاہتا۔'

میں نے جب اس کی یہ اثر انگیز تقریر سنی تو بڑی خوشی حاصل ہوئی اور اپنی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس کو شرفِ قبولیت بخشا۔ لیکن چونکہ مجھے اپنے والد ماجد کی طرف سے ڈر تھا اس لیے اپنے ہم نشینوں اور رازداروں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ آخرکار سب کی رائے ہوئی کہ ازروئے شریعت اس خصوص میں مجتہدین سے مدد لینی چاہیے۔ یہ تجویز معقول تھی۔ میں نے اپنی سرکار کے داروغہ میر محمد مہدی کو طلب کیا اور ان سے گفتگو کی اور سید ابراہیم علی خاں نے جو آج کل سیّد ابراہیم علی خاں بہادر کے خطاب سے مفتخر ہیں، بہانہ تلاش کر کے کسی مصلحت کی بنا پر اس نازآفریں سے متعہ کر لینا اور ایک عرضی ترک وفسق اور نکاح ثانی کے ضمن میں لکھ کر مجتہدین کی خدمت میں بہ حسنِ توسط محکمۂ شریعہ میں بھیج دی اور ساتھ ہی سیّد ابراہیم علی اور نازنین مسطور کو بھی روانہ کیا۔ اس سلسلے میں داروغہ میر محمد مہدی نے بڑی سعی و کوشش کی۔ نتیجتاً اپنے منصوبے میں کامیابی ہوگئی۔ بعدازاں اثنائے راہ میں سیّد ابراہیم علی محکمۂ شریعہ سے واپس آرہے تھے۔ امراؤ کو طلاق دے دی۔ اس طرح وہ نازنین مجھے مل گئی۔ میں نے اس کو جیتہ السلطان مکرمتہ الزمانی سکندر بیگم صاحبہ کا خطاب دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑی حیادار عورت تھی۔ میرے پاس آنے کے بعد اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس پر کوئی اعتراض ہوتا۔ چند دن گذرنے کے بعد اس کی ماں عمدہ خانم مجرے کرنے کے بہانے سے ایوانِ شاہی میں باریاب ہوئی اور موقع نکال کر میرے والد ماجد سے فریاد کی کہ میری لڑکی امراؤ کو صاحبِ عالم ولی عہد بہادر نے زبردستی پکڑ کر اپنے گھر ڈال رکھا ہے۔ لہٰذا میں آپ سے انصاف چاہتی ہوں۔ میرے والد ماجد عدل گستری اور انصاف پروری میں یکتائے زمانہ تھے۔ انہوں نے جب یہ حال سنا تو اس واقعے کی تحقیق کے لیے امراؤ کو حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ میں بھاگا ہوا والدہ ماجدہ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ وہ نازنین میری ممتوعہ بیوی ہے اور میں اس کو دل سے چاہتا ہوں، میں نے ہرگز اس پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ

رضا و رغبت وہ میرے پاس آئی ہے۔ ادھر وہ سرمایۂ ناز و وفا کیش نہایت پریشانی کے عالم میں ڈرتے ڈرتے اور زار و قطار روتی ہوئی روانہ ہوئی میرے لیے اس کی یہ جدائی ناقابلِ برداشت تھی۔ لیکن کوئی چارۂ کار نہ تھا، کبھی اپنی بے بسی پر روتا تھا اور کبھی پاگل کی طرح ہنس پڑتا تھا اور کبھی سرِ راہ جا کر ٹہلنے لگتا اور کبھی گھر میں آ کر دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا۔

جس وقت وہ گل ہمیشہ بہار میرے والد ماجد کے روبرو پیش ہوئی تو عمدہ خانم کو بھی حاضر کیا گیا۔ بہت ساری بحث و تکرار کے بعد امراؤ نے عرض کیا کہ اگر لونڈی کو عمل شنیعہ کی اجازت دی جاتی ہے تو اس مکارہ عمدہ خانم کے ساتھ جائے گی اور اگر عملِ حسنہ کا حکم نافذ فرمائیں تو میں سیّد ابراہیم علی کے پاس جاؤں گی کہ میں ان کی ممتوعہ ہوں اور اس پر حکم ہوا کہ تم اپنے شوہر کے پاس جاؤ اور عمدہ خانم کا تم پر کوئی دعویٰ جائز نہیں اور آئندہ وہ کبھی ایسی نالش نہ کرے، ورنہ جرمانہ و سزا کی مستحق سمجھی جائے گی۔

امامن کا انتقال

جام رنگیں جب صہبائے گل عذاراں سے بھر گیا تو یکا یک میری پیر بہن، میری مونس جان و انیس تنہائی امامن کے انتقال پُرملال کی منحوس خبر میرے گوش گذار ہوئی۔ میں نے انتہائی بے تابی میں اپنے آپ کو دریائے غم و اندوہ میں ڈال دیا اور اس نئے غم نے میرے دل میں جگہ کر لی، اس کی موت کیا تھی ایک کانٹا تھا جس کی خلش میرے دل میں پیدا ہوگئی۔ اس رفیقہ کے بعد وہ 'محفل نشاط' جو ان ہی لوگوں کی توجہ سے برقرار تھی، سونی ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمدی کہاری

میری ولی عہدی کے شروع زمانے میں میری خدمت اور مختلف بالائی کاموں کے لیے ایک عورت ملازم رکھی گئی تھی۔ یہ عورت قوم کی کہاری تھی، یہ عورت بڑی شوخ مزاج اور سانولی رنگت کی تھی۔ قبل ازیں مرزا نصیر الدین بہادر مرحوم کے ہاں کہاریوں کے زمرے میں ملازم رہ چکی تھی۔ میری خواہش ہوئی کہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناؤں، چنانچہ اس نے مجھ سے وعدہ بھی کیا، مگر شرط یہ رکھی کہ اسے 'مہری گری' کے عہدے پر فائز کیا جائے۔ میں نے اس کی یہ شرط منظور کر لی اور بہتر النسا

خانم صاحبہ کا معزز خطاب دے کر مہری گری کے عہدے پر اسے سرفراز کیا۔ اس کی محبت میرے دل میں زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتی گئی لیکن جب اس سے یہ کہا گیا کہ وہ میرے گھر پڑے تو اس نے انکار کر دیا۔ جب میں اس کی ملاقات ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو وہ بری طرح رو پڑتی تھی۔ ایک روز مجھے بڑا غصہ آ گیا، گھر نہ پڑنے کی خطا پر ملازمت سے برطرف کر دیا لیکن اس نے اس قدر شور برپا کیا اور اپنی حالت کو برباد کیا کہ میں ڈر گیا اور فوراً اس کو بحال کر دیا۔ عجیب عورت تھی، نوکر تھی لیکن میری محبت میں دیوانی ہو رہی تھی اور گھر نہ پڑنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں اس کو اچھی اچھی چیزیں اور عمدہ ملبوسات دیتا رہتا تھا اس لیے کہ خود مجھے بھی اس سے محبت پیدا ہو گئی تھی، وہی عورت مجھے دونوں وقت کھانا کھلایا کرتی تھی۔

شاہ بخش

اس زمانے میں نواب خاص محل صاحبہ کے توسط سے سترہ برس کی ایک عورت میرے گھر پڑی، جس کو خدمت گاروں اور خواصوں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ایک چست و چالاک عورت تھی، میں نے کبھی اس کو پسند نہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے میرے سامنے بیٹھنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اپنا مقررہ عہدہ سنبھالے رہے۔ اس کو شاہ بخش کا خطاب دیا گیا تھا۔

الطاف بخش

نواب خاص محل صاحبہ کے ذریعے اسی زمانے میں ایک اور عورت جس کا سن سترہ برس کا تھا میرے گھر پڑی اور خواصوں کے زمرے میں سرفراز کی گئی اور الطاف بخش خطاب قرار پایا۔ اس میں شک نہیں یہ عورت بڑی خوب صورت تھی۔ لیکن میری پسند خاطر نہ ہوئی۔ اس کو بھی میرے روبرو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، صرف اپنے کام سے کام تھا۔ وہ علمِ موسیقی حاصل کرنے میں بھی ناکام رہی تھی۔

شیریں حبشن

محمد حسین علی خاں کی معرفت شیریں نام کی ایک حبشن میرے گھر پڑی اور اسے بھی خواصوں کے

زمرے میں ممتاز کیا گیا۔

فضہ حبشن

شیریں حبشن کی معرفت ایک اور حبشن میرے گھر پڑی جس کا نام فضہ تھا، یہ بھی خواصوں کے عہدے پر فائز ہوئی۔

لیلیٰ حبشن

شیریں حبشن کے ذریعے ایک اور عورت لیلیٰ حبشن میرے گھر پڑی اور خواصوں کے زمرے میں شامل ہوئی۔

حضرت جنت مکان کا تحفہ

انہیں دنوں مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کی ایک باعفت محل ملقب بادشاہ محل کا انتقال ہوا۔ ان کا مال و اسباب ضبط ہوا تو ضبطی میں میرے والد ماجد کو چھ لونڈیاں بھی ملیں۔ ان چھ لونڈیوں کو ازراہِ شفقت پدری مجھے مرحمت فرمایا۔ میں نے دو کو اپنی خدمت کے لیے رکھ چھوڑا اور بقیہ چار کی شادی کر دی، جو لونڈیاں میرے تصرف میں آئیں ان میں سے ایک کو فرخندہ بخش اور دوسری کو شاہ بخش کے خطاب سے ملقب کیا۔ یہ وہی فرخندہ بخش ہے جس کے بطن سے ایک لڑکی نواب شمس آرا بیگم ہو کر انتقال کر گئی اور اسی وجہ سے وہ اسامیوں کے زمرے میں شامل ہو کر فرخندہ خانم صاحبہ کے معزز خطاب سے سرفراز کی گئی اور پردے میں بٹھائی گئی تھی، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اس کی قسمت خراب تھی جس کی وجہ سے نواب شمس آرا بیگم زندہ نہ بچی ورنہ یہ عورت محل کے رتبے تک پہنچ جاتی۔

نواب خاص محل کی بے تعلقی

خداوندِ تعالیٰ پروردگارِ کونین کے فضل سے جس کے قبضے میں زمین و آسمان ہیں اس 'پری خانہ' نے خاطر خواہ ترقی حاصل کی۔ اس کی محفل کے ناچ گانے دلوں میں تڑپ پیدا کرتے تھے، سننے والوں کے کانوں میں ایک گرمی سی دوڑ جاتی تھی۔ میری پریوں نے اپنی فن میں اس قدر درک حاصل کرلیا

کہ راجہ اندر کوہِ قاف کی پریوں کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ ہر پری کی دلبرانہ ادا سے انسان کا دل ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ میں اس جلسے کی تمام تر ترقی کو محسوس کرتا تھا۔ اگر میں ایک کے دل نشیں فریب سے چھٹکارا حاصل کرتا تو دوسری کے کمند ناز میں اسیر ہو جاتا، کھانا پینا، سونا، بیٹھنا، سیر تماشا، خواہ کسی موضوع پر بھی بحث ہو رہی ہو۔ پریوں کے بغیر کسی چیز میں کوئی لطف نہ آتا۔ ان پریوں میں سے بیشتر حاملہ ہوئیں اور محل کے مرتبے پر پہنچیں۔ بعض نے اپنی دلربا اداؤں سے مجھے مسخر کر لیا اور کسی نے اپنے دامِ فریب میں پھنسالیا، مختصر یہ کہ ہر ایک پری نے مجھے اپنے اپنے جادو کے شیشے میں اتار لیا تھا۔ کسی وقت بھی رنج و ملال کی صورت میرے تصور میں نہ آتی تھی۔ البتہ دو ایک سانحات رونما ہوئے تھے۔ ایک تو داروغہ نجم النسا بیگم صاحبہ کا انتقال، دوسرا میری رفیق و دم ساز امامن کی موت اور ایک میری دختر کی رحلت، ورنہ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ رنج کیا چیز ہے اور غم کیا بلا ہے۔

میرا یہ مشغلۂ محبت و رابطۂ عشق و وصال میری دوسری بیگمات کو ہرگز گوارا نہ تھا، خاص کر نواب خاص محل صاحبہ نے تو اپنے دل میں ایک خارالم پیدا کر لیا اور اندر ہی اندر آتش رشک سے جلنے لگیں، کسی کو طعنہ دیا تو کسی کا دل دکھا دیا، کسی کی پوشاک میں کوئی نقص رکھا، کسی کے زیور میں کوئی عیب نمایاں کر دیا، مختصر یہ کہ ایسی ہی عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھیں یہاں تک کہ بعض وقت لڑائی جھگڑے پر بھی آمادہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے اس سلوک سے ہر عورت تنگ تھی۔ ان کی طرح اور بیگمات جو پردے میں رہتی تھیں اور ان سے میری ملاقات نہیں ہو پاتی تھی وہ بھی بے حد جلتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ چند روز سے پریوں کی آرائش و زیبائش میں فتور ہونے لگا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر پریوں کی آرائش کا کام بیگمات محل سے واپس لے لیا اور یہ خدمت داروغہ محمد حسین علی خاں کے سپرد کی اور ساتھ ہی اسے محمد معتمد علی خاں کے خطاب سے ملقب کیا۔ اس نے یہ خدمت بخوشی منظور کی اور بڑی تن دہی سے اس کی انجام دہی کرتا رہا۔ میں بھی اس کی محنت کی قدر کرتا تھا اور اپنی عنایتوں کا اس کو مستحق سمجھتا تھا۔ شروع روز سے آج تک روز تک اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، البتہ ایک خطا کی تھی جس کا ذکر آئندہ موقع پر آئے گا۔

خواجہ سرا ریحان

محمد معتمد علی خاں خواجہ سرا نے ریحان نام کے ایک شخص کو لا کر اس کی سفارش کی، میں نے بخوشی اس

کی درخواست منظور کر لی اور نوکر رکھا اور اخبار نویسی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

یہ شخص پہلے سیف الدولہ میر ہادی کی زوجہ کے ہاں خواجہ سرا کی خدمت پر نوکر تھا۔ یہ حبشی نسل کا دبلا پتلا منکسر المزاج اور کمسن شخص تھا جس میں غرور نام کو بھی نہیں تھا اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ میں نے محمد ریحان علی خاں کا خطاب عنایت کیا۔ وہ اپنی خدمت نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا، جس کی وجہ سے وہ الطاف سلطانی کا مستحق ہوا۔

ترک سوار نیاں

محمد معتمد علی خاں کے ذریعے سے ایک شخص حاجی شریف نامی میرے ہاں ملازم ہوا۔ یہ شخص اس سے قبل سیف الدولہ میر ہادی کی سرکار میں خواجہ سرا کی خدمت پر مامور تھا۔ اس کی عمر بھی تقریباً چالیس سال کی تھی۔ بڑا نیک اور صلح جو آدمی تھا، کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا جو میری طبیعت کے خلاف ہو، میں جو کہتا فوراً تعمیل کر دیتا۔ حاجی محمد شریف علی خاں کا خطاب دے کر زنان خانے کے داروغہ کی خدمت اسے عطا کی گئی۔ اس نے اپنا کام نہایت تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اس زمانے میں میری خواہش تھی کہ اپنے گھر پر سپاہیوں کا پہرہ مقرر کروں، لیکن محدود آمدنی اور بے پناہ مصارف کی وجہ سے مجبور تھا۔ نیز والد ماجد کی ممانعت بھی تھی، آخر مجبوراً تیس عورتوں کو زنان خانے کی چوکی کے لیے ملازم رکھا تھا۔ ان عورتوں کو روزانہ فارسی زبان میں قواعد کی تعلیم کا انتظام بھی کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایسی ماہر اور قواعد داں ہوگئیں کہ انگریزی قواعد بھی میری نظر میں بے وقعت ہوگئی۔ ہر ایک عورت لباس کی تزئین اور اسلحہ کی صفائی میں انگریزی فوج کی مدِمقابل ہوگئی۔ اس کے علاوہ پچاس ترک سوار بھی میں نے نوکر رکھے تھے۔ انہیں بھی فارسی میں مذکورہ سپاہی عورتوں کی طرح تعلیم قواعد دی جاتی تھی۔ ترک سواروں کا یہ دستہ بھی انگریزی فوج سے بدرجہا بہتر تھا، حاجی محمد شریف علی خاں کو ان دونوں دستوں کا افسرِاعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور ساتھ ہی 'جانباز سرکار مرزا ولی عہد بہادر کرنیل حاجی محمد شریف علی خاں' کا خطاب دے کر اسے ممتاز کیا گیا۔ حقیقت میں کرنیل مذکور بڑی جانفشانی اور کوشش سے قواعد کی تعلیم دیتا رہا۔ قواعد کے گھوڑوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کی کوئی دیوار ایستادہ ہے۔ اس شخص نے سپاہیوں سے کبھی ایک پیسہ بھی رشوت کا نہیں لیا۔ اس کا رعب و داب بھی ایسا تھا کہ قواعد کے

دوران کیا مجال کہ ایک سپاہی دوسرے سپاہی سے بات کرے۔

عتبات عالیات

والد ماجد حضرت جنت مکان نے محمد بشیر علی خاں اور فیروز علی خاں کے علاوہ ایک اور خواجہ سرا مسمی بلال بھی عنایت فرمایا تھا، جو فی الحال کسی کام پر مامور نہ تھا۔ ایک روز مسمی مذکور نے عرضی پیش کی جس میں زیارات عتبات عالیات کے لیے رخصت کا خواستگار ہوا، میں نے عرضی منظور کی اور زادِ سفر کے لیے نقد دو ہزار روپے بھی عنایت کئے۔ اس کے بعد اطلاع ملی کہ یاسمین پری، ماہ رخ پری اور سردار پری بھی زیارات کے لیے رو رہی ہیں، میں نے چونکہ ان پریوں کو بڑی جستجو اور خرابی کے بعد حاصل کیا تھا اس لیے ان کو دور دراز سفر پر بھیجنے کے لیے تیار نہ تھا اور مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ان عورتوں کی ایسی تمنا کیوں؟ لیکن جب میں نے ان کو اپنے سامنے طلب کر کے پوچھا تو یقین ہو گیا، ان کی اس بے وفائی سے مجھے بڑا دکھ ہوا اور ہر ایک سے میں نے ان کی بے وفائی کا تذکرہ کیا۔ آخر مجھے بڑا غصہ آیا اور ان کی سکونت کے لیے ایک الگ مکان تجویز کیا اور ان کو اپنے سامنے کبھی نہ آنے دیا۔ لیکن اس کا مجھے بڑا رنج تھا۔

اس دوران میں بلال خواجہ سرا حج و زیارت سے مشرف ہو کر واپس آ گیا۔ چھ ماہ کے بعد دوبارہ کربلائے معلیٰ جانے کی درخواست کی۔ میں نے اس کی یہ درخواست بھی بخوشی منظور کی اور اس دفعہ بھی دو ہزار روپے کی رقم عنایت کی۔ ساتھ ہی ان تینوں پریوں کو بھی کربلائے معلیٰ جانے کی خوشی سے اجازت دے دی اور سفرِ خرچ کے لیے چار ہزار روپے دیئے۔ یہ اس لیے کیا کہ اب ان کو گھر میں رکھنا دانش مندی کے خلاف تھا، لیکن خدا معلوم ان کے دل میں کیا آیا کہ جانے میں پس و پیش کیا۔ ظاہر میں اس کا یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے اسی ارادے کے باعث میری معتوب ہوئی تھیں، اس لیے اب وہ کربلائے معلیٰ جاتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ آخر کار اس دفعہ بھی بلال خواجہ سرا اکیلا ہی روانہ ہوا۔ اس روز کے بعد سے ان تینوں پریوں سے مجھے بڑی نفرت پیدا ہو گئی اور ان کی عزت و توقیر پہلے کی طرح نہ رہی۔ ظاہر ہے اب ان سے ربطِ محبت قطع کرنا ناگزیر تھا۔ بعد میں انہوں نے مختلف قسم کے ہتھکنڈے مجھے پھانسنے کے اختیار کیے لیکن میں ہر دفعہ چوکنا ہی رہا اور کسی قیمت پر بھی انہیں قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ صرف اتنا تھا کہ وہ تعلیم خانے میں

تعلیم دینے کی غرض سے آتی تھیں۔ ان کا رتبہ دوسری پریوں سے کم تو نہ تھا لیکن میں ان پر کبھی التفات نہ کرتا تھا اوران کی بے وفائی ان کی صورت دیکھتے ہی یاد آ جاتی تھی۔

یہ یاسمین پری وہی تھی جس سے بے پناہ محبت اور والہانہ الفت اوراس کے فراق میں گریہ کناں ہونے کی روداد میں پہلے قلم بند کر چکا ہوں، غضب خدا کا کہ اس کا اب یہ حال ہو گیا۔

سردار پری اس وقت ابھی تیرہ سال کے سن میں تھی، میرا خیال تھا کہ وہ دوسروں کے بہکاوے میں آ گئی ہے اور میرا یہ خیال کچھ غلط نہ تھا، وہ بالکل بے قصور تھی۔ اس وقت وہ دنیاوی معاملات سے قطعاً ناواقف تھی اور مردوں کی صورت سے بھاگتی تھی، لیکن مجھے یقین تھا کہ جب وہ مجھ سے مانوس ہو جائے گی اور سن شعور کو پہنچے گی میری والا وشیفتہ ہوگی۔ لیکن ماہ رخ پری اور یاسمین پری سے بے حد نفرت ہوگئی، اگر چہ یہ عورتیں جوان وخوب صورت تھیں اور بہ رضا ورغبت میرے گھر پڑی تھیں، لیکن یہ ماضی کی باتیں ہیں۔ ماہ رخ پری میری محبت میں کیسی دیوانی ہوگئی تھی اوراپنے ایک رشتے دار کو کیسا سخت جواب دیا تھا جس کی بنا پر اس نے راضی نامہ لکھ دیا تھا، لیکن اب وہی عورت اپنی تلون مزاجی کے باعث اس نوبت کو پہنچی۔

نورافشاں پری

نواب خاص محل صاحبہ کے حسنِ توسط سے اسی زمانے میں ایک عورت آئی اور میرے گھر پڑی، نورافشاں پری کا اس کو خطاب بخشا گیا، پھر مجھ سے اجازت لے کر زیارات عتبات عالیات کو روانہ ہوئی۔

مصاحب اور مذہب امامیہ

رفتہ رفتہ چونکہ میرے تعلقات اور رابطۂ اتحاد امامن کے رشتے داروں غلام رضا وغیرہ سے بڑھتے ہی جاتے تھے اور یہ تمام مذہب سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے استاد قطب علی خاں بھی اسی فرقے سے متعلق تھے۔ اس لیے شب وروز میں اسی فکر میں رہتا کہ یہ لوگ بھی اگر میرا مذہب اختیار کر لیں تو نہایت خوشی کا باعث ہے، بعض وقت میں ان لوگوں کا رجحان معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو محسوس ہوتا کہ یہ اپنے مذہبی معتقدات پر سختی سے پابند ہیں، جنہیں

ترک کرنا نہیں چاہتے۔

برسات کا موسم تھا۔ ایک روز میں نے نہایت عاجزی اور خوشامد سے اور کچھ لالچ دے کر انہیں اپنا مذہب بدلنے کے لیے کہا۔ شاید خدا کی مرضی تھی کہ یہ کارِ خیر میرے ہاتھوں سے انجام کو پہنچے سارے لوگوں نے میری بات مان لی۔ پھر اسی وقت میں نے سواری کا انتظام کر کے ان کو مجتہد وقت سلطان العلما، مولوی سیّد محمد کی خدمتِ بابرکت میں روانہ کر دیا۔ وہاں جا کر یہ سب لوگ صدقِ دل سے مذہبِ امامیہ میں داخل ہو گئے اور آتے ہوئے اپنے ساتھ سلطان العلما کا خط بھی لائے جو ان لوگوں کے دینِ مبین سے مشرف ہونے کے متعلق تھا، جب میں نے یہ خط دیکھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور سب کو خلعتوں اور خطابوں سے مشرف فرمایا۔ خطابات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

قطب علی خاں کو غلام یداللہ خاں

نتھو خاں پدرم غلام رضا خاں کو غلام علی خاں

گھسن خاں برادرِ نسبتی غلام رضا خاں کو غلام حسن خاں

پھر ان لوگوں نے بھی قول دیا کہ ہم حضورِ والا کے غلام ہو گئے اور متوقع ہیں کہ تاحیات آپ کے قدموں سے الگ نہ ہوں، میں نے اسی وقت یہ الفاظ سنتے ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ ہر وقت میں ان کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان لوگوں کی پاسداری میں اب تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔

مصاحبوں کا امتحان

ایک روز میں 'حضرت باغ' میں تھا، ہر طرف بارانِ رحمت آب پاشی کر رہا تھا۔ رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ گل شبو کا تختہ اپنی عطر بیز خوشبوؤں سے مشامِ جان کو معطر کر رہا تھا، دو ایک گھڑی دن باقی تھا، میں 'بنگلہ فلک سیر' میں بیٹھا ہوا تھا۔ مصاحبینِ خاص و رفیقانِ اختصاص یعنی غلام رضا خاں، پھجو خاں، ثابت علی خاں، غلام یداللہ خاں وغیرہ حاضر تھے۔ ہر آدمی رنگین حکایات و دلچسپ واقعات و پُر لطف لطیفوں سے میرا دل بہلا رہا تھا۔ ادھر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ وقت اچھا

ہے، اس وقت ان لوگوں کی جاں نثاری کا امتحان لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر ایک آدمی کو قریب بلایا اور اس کے کان میں چپکے سے کہا کہ 'ایک بہروپیے کو میرے پاس بھیج دے، جو ظاہر میں زخمی معلوم ہوتا ہو اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے ہو۔ تو خاموش تماشا دیکھتا رہ، مجھے یہ دیکھنا ہے کہ یہ لوگ کتنے جاں نثار ہیں۔' یہ حکم سن کر وہ آدمی روانہ ہوگیا، کچھ دیر بعد بہروپیا ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے زینے کے راستے اوپر برآمد ہوا اور اس کے جسم سے خون جاری تھا، آتے ہی اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں بناوٹ سے کام لے کر ہراساں و پریشان ہوگیا۔ میری جو یہ حالت دیکھی تو غلام رضا خاں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور چھجو خاں نے اس کی کمر پکڑی اور چاہتا تھا کہ اسی کی تلوار سے اس کا خاتمہ کردے۔ میں نے جب ان کے یہ تیور دیکھے تو گھبرا کر کہا 'ٹھہرو ٹھہرو! یہ بہروپیا ہے اسے ہرگز نہ مارو۔' ادھر بہروپیا بھی چیخنے لگا کہ میں نقال ہوں۔ یہ سن کر ان لوگوں نے اس کو فوراً چھوڑ دیا۔ بعد میں دیکھا کہ بہروپیے کو اس کشمکش میں شدید قسم کے زخم آ گئے تھے۔ میں نے بہروپیے کو معقول انعام دیا اور اسی وقت نوکر بھی رکھ لیا اور ان جاں نثاروں کو پانچ پانچ سو روپے انعام عنایت کیا۔ نیز ہر ایک کو ایک ایک شمشیر، ایک ایک سپر اور ایک ایک سات ضربی طپنچہ اور ایک ایک بندوق بھی دی۔ اس کے علاوہ مصاحبانِ خاص و جوانانِ پہرہ کا خطاب مرحمت فرمایا اور انہیں اپنے بسترِ استراحت کے پہرے کی خدمت پر فائز کیا۔ اس روز کے بعد سے جب میں استراحت کے لیے کمرۂ استراحت میں جاتا 'مصاحبانِ خاص' پہرہ دیتے۔ اگر میں کبھی محل میں سوتا تو بطور خاص وہاں مردانہ ہوتا اور وہاں بھی 'مصاحبانِ خاص' ہی کا پہرہ لگا دیا جاتا۔

مرزا برجیس قدر کی پیدائش

اسی مسرت آگیں زمانے کی بات ہے کہ ایک روز قاصد لیل و نہار نے ایک گل تازہ کی آمد کا مژدہ سنایا اور میرے کانوں میں یہ خبر فرحت اثر پہنچائی کہ مہک پری حمل سے ہے۔ میں نے یہ خبر سن کر خدا کا شکر ادا کیا اور مہک پری کو پردے میں بٹھایا اور اس کو افتخار النسا کے خطاب سے ملقب کیا۔ ایامِ حمل گذرنے کے بعد لختِ جگر، فرزندِ ارجمند تولد ہوا۔ اس کے دادا نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور گیارہ توپ کی سلامی دلوائی اور لڑکے کو مرزا برجیس قدر بہادر کا خطاب عنایت کیا۔ ادھر میں نے ایک جشن کا اہتمام کیا۔ مہوشانِ شیریں ادا نے رقص و سرود کا خوب مظاہرہ کیا۔ اس جشن میں ہر

ایک پری نے اپنے آپ کو دلہن کی طرح سجایا۔ جب پریاں ناچتی تھیں تو ان کی ایک ایک گت پر واہ واہ کی آواز بلند ہوتی تھی۔

جہاں آرا بیگم کی پیدائش

پھر ایک اور خوش خبری میرے گوش گذار ہوئی کہ فضہ حبشن کے حاملہ ہونے کی اطلاع ملی۔ میں نے فوراً درگاہ باری تعالیٰ میں سجدۂ شکر ادا کیا اور فضہ حبشن کو پردے میں بٹھا دیا۔ حمل کی مدت گذرنے کے بعد گوہر مراد پیدا ہوئی۔ حضرت جنت مکاں یعنی لڑکی کے دادا نے جہاں آرا بیگم صاحبہ اس کا نام تجویز فرمایا۔ طال اللہ عمرہ۔

یاسمن پری اور سرفراز پری کا ایک واقعہ

ایک وقت یاسمن پری اور سرفراز پری کے متعلق یہ گمان ہوا کہ انہیں حمل قرار پایا ہے اور میں نے قاعدے کے مطابق ان کا پردہ کروادیا۔ لیکن چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ یہ محض گمان تھا، پھر ان کا پردہ توڑ کر باہر لایا گیا اور وہ رقص وسرود کی تعلیم میں مصروف ہوئیں۔

حور پری کی تریاہٹ

اس کے بعد خبر ملی کہ حور پری حاملہ ہے۔ اس خبر سے مجھے بڑی خوشی ہوئی، لیکن چونکہ ایک دفعہ یاسمن پری اور سرفراز پری کے سلسلے میں زک اٹھا چکا تھا اس لیے کچھ زیادہ یقین نہ کیا۔ پانچ مہینے کے بعد اس کو پردے میں بٹھایا گیا، لیکن اس عورت کو پردے میں بیٹھنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ میں بہت کچھ اسے سمجھاتا تھا، لیکن وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید میری مفارقت کو برداشت نہیں کرسکتی، لیکن یہ میرا محض خیال تھا۔ ہر طرح میں تسلی دلاسہ دیتا۔ لیکن وہ منہ پھٹ ہوکر کہتی کہ میں کسی طور بھی پرواہ نہیں کروں گی۔ اگر مجھ کو اسی طرح مجبور کیا گیا تو میں حمل گرانے سے بھی دریغ نہ کروں گی۔ میں نے یہ سن کر جواب دیا کہ ناحق کسی کی جان لینا بہت بڑا گناہ ہے۔ غرض کہ سات ماہ کے بعد ہی وضع حمل ہوا اور لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن افسوس کہ صرف چالیس روز زندہ رہ کر وہ فوت ہوگیا۔ میں نے حور پری کو خلعت ماتم دے کر ناچ گانے کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت

دے دی۔ لیکن بظاہر وہ مردوں کے سامنے آتے ہوئے روتی تھی اور اندر ہی اندر باہر آنے کے لیے مری جاتی تھی۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللّٰہ۔

حیدری کا حاملہ ہونا

داروغہ نجم النسا بیگم نے انتقال کرتے وقت دو کنیزیں اپنے پیچھے چھوڑی تھیں۔ ان میں سے میں نے ایک کا نام مَمّن اور ایک کا نام حیدری تجویز کیا۔ مَمّن کو غلام حیدر کے عقد میں دے دیا اور حیدری کو خود اپنی خواصوں میں شامل کرلیا۔ چند روز کے بعد اس کے حمل ٹھہرا۔ مجھے سخت تعجب ہوا اور غصے سے بھرا ہوا کوڑا ہاتھ میں لے کر حقیقت حال معلوم کرنا چاہی، لیکن وہ مختلف لوگوں کے نام بتاتی تھی۔ جب میں نے اس کو ڈرایا کہ اگر صحیح صحیح نہ بتایا تو اس کوڑے سے درگت بناؤں گا، تو اس نے جرم کا اقبال کیا اور کہا کہ مجھے ثابت علی خاں سے حمل ہے۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ فوراً ان چاروں بھائیوں کو طلب کر کے پوچھا۔ وہ میرے قدموں میں گر گئے اور کہنے لگے کہ اگر اس کا ثبوت مل جائے کہ یہ فعل ہمارا ہے تو ہم حضور کے آگے اپنے سر کٹانے کو تیار ہیں۔ خدا جانے یہ کس کا حمل ہے۔ ہم پر سراسر یہ بہتان ہے۔ اتنا کچھ ہنگامہ ہونے اور ان چاروں بھائیوں کے رونے پیٹنے کے بعد یہ طے ہوا کہ یہ آتش فساد حیدری کو نکال دینے کے بعد ہی فرو ہوسکتی ہے۔ اس کا ایک بھائی حیدر میرے ہاں فراشوں کے زمرے میں ملازم تھا اور اسے داروغہ نجم النسا بیگم نے گود لے لیا تھا۔ میں نے حیدری کو اس کے حوالے کردیا اور ان چاروں کا قصور معاف کیا۔

بلقیس پری

نواب خاص محل صاحبہ کے کہنے سے ایک عورت کو میں نے گھر ڈال لیا اور پریوں کے زمرے میں داخل کر کے بلقیس پری کا خطاب عنایت کیا لیکن وہ بڑی بدطینت عورت تھی۔ ایک روز موقع پا کر مرزا فلک قدر بہادر کے چاندی سونے کے تعویذ جو کہ نواب خاص محل صاحبہ نے جان کی حفاظت کے لیے گلے میں ڈال رکھے تھے چرا لیے۔ اس نازیبا فعل کی وجہ سے بڑی ذلت سے نکالی گئی۔ اگرچہ اسے میری سرکار سے معقول تنخواہ ملتی تھی، لیکن وہ اپنی بدعادت سے باز نہ آئی اور ذلیل ہوکر نکلی۔ بعد میں سنا ہے کہ وہ میرے کسی محل کے پاس نوکر ہے۔

سرفراز پری سے عشق

جس وقت سرفراز پری میرے گھر پڑی، میں اس کے تیغ ابرو کا گھائل ہو گیا۔ ہر لمحہ اس کا ناوک مژگاں میرے دل میں اترا ہوا تھا۔ اس کی ہر ادا پر غم کی سِل اپنے سینے پر رکھے رہتا۔ جہاں اس نے کچھ ناز و غمزہ دکھایا وہاں مجھے ہزار طرح رنج کھینچنے پڑتے تھے۔ جب وہ رقص کرتی تو میں رو پڑتا، جب وہ گاتی تو میں اپنا سر نیوہاڑ کے بیٹھ جاتا، جس وقت وہ حصولِ تعلیم میں مشغول ہوتی تو میں اس کی دلستاں اداؤں میں کھو جاتا، وہ سوتی رہتی میں جاگتا رہتا اور جب جاگتی تو میری قدر کرنے کے بجائے ناانصافی کا سلوک کرتی اور کہتی کہ آپ تو فلاں کو چاہتے ہیں، فلاں سے عشق کرتے ہیں۔ میں رات رات بھر اس کے پاؤں دبایا کرتا۔ تمام دن صرف اسی کو تاکا کرتا۔ اگر وہ کوئی معمولی سی چیز بھی کھاتے کھاتے مجھے دے دیتی تو میں بلا پس و پیش اسے کھا لیتا جس طرف جاتی میں بھی اسی طرف ہو لیتا۔ اگر کہیں وہ بیٹھی رہتی تو میں کھڑا رہتا، غرض کہ اس نے مجھے اپنا عاشق بنالیا تھا۔ دن بھر میں وہ کئی مرتبہ طرح طرح کے لباس تبدیل کرتی تھی۔ ہر وقت عطرِ حنا میں بسی ہوتی۔ دانتوں میں مسّی کی دھڑی ہونٹوں پر پان کی لالی اور ماتھے پر افشاں چنی ہوئی تھی۔ اپنے بال کبھی وہ گھونگروالے اور کبھی سیدھے سیدھے بنائے رکھتی تھی۔ ہاتھوں میں مہندی لگی ہوتی اور انگلیوں میں خوب صورت انگوٹھیاں۔

ایک روز داروغہ نجم النسا بیگم مرحوم، نواب خورد محل عمدہ بیگم صاحبہ اور نواب نشاط محل ننھی بیگم صاحبہ نے آپس میں اتفاق کر کے شہنشاہ منزل کے کمرے میں مجھے الگ بلایا، میں جب ان کے سامنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تینوں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا 'کہو کیا کہنا چاہتی ہو' اس کے بعد وہ تینوں میرے اور سرفراز پری کے تعشق کے سلسلے میں باتیں کرنے لگیں اور ساتھ ساتھ کچھ تاسف آمیز جملے بھی کہتی جاتی تھیں۔ وہ کبھی اپنے زانوں پر ہاتھ مارتیں، کبھی اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتیں۔ بالآخر میں پریشان ہو گیا اور کہا کہ خدا کے لیے تم لوگ کیا کہنا چاہتی ہو جلد کہو تا کہ میرے دل کی بے چینی دور ہو۔ میں جلد سے جلد ان لوگوں کا مقصد معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح پس و پیش کر رہی تھیں۔ آخر میں نے بے زار ہو کر اپنے سر کی قسم دی۔ اس کے بعد داروغہ نجم النسا بیگم مرحومہ نے یوں سلسلۂ کلام جاری کیا کہ 'اے جانِ عالم سرفراز پری پر تو آپ اس قدر جان دیتے ہیں، لیکن سرفراز پری کے متعلق عجیب و غریب افواہیں سنی جاتی ہیں۔' یہ سن کر میں نے کہا

’آ گے کچھ اور بھی تو بیان کرو، اس طرح ادھوری بات کہہ کر کیوں مجھے الجھن میں ڈالتی ہو۔‘ پھر داروغہ نجم النسا بیگم اور وہ دونوں محلات یک زبان ہو کر عرض کرنے لگیں کہ ’اے جانِ عالم ہم آپ پر صدقے جائیں عورت میں فطرتاً کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے، ایسی نابکار جنس میں مروّت نام کو بھی نہیں اگر آپ رنجیدہ نہ ہوں تو عرض کرتی ہوں کہ سرفراز پری ظاہر میں تو آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہے، لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کو آپ کی ذرا سی بھی پرواہ نہیں۔‘ یہ الفاظ جب میں نے سرفراز پری کے بارے میں سنے تو میرا رنگ فق ہو گیا اور دونوں ہاتھوں کو دل میں تھامے ہوئے تڑپنے لگا اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ تم سب شاہد ہو کہ میں نے سرفراز پری کی پرستش میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ایسی صورت میں آخر وہ کیوں مجھ سے بے وفائی پر آمادہ ہے۔ پھر یکایک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ساری محلات چونکہ سرفراز پری سے حسد کرتی ہیں۔ کیا تعجب کہ یہ محض اس پر اتہام ہو، لہٰذا میں نے خود انہیں سے پوچھا کہ ’اچھا یہ بتاؤ کہ مجھے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔‘ ان لوگوں نے کہا ’چند روز آپ تامل فرمائیں۔ ہم انشاء اللہ اس کی ساری بے وفائی کے سلوک آپ کو دکھا دیں گے۔‘

ایک روز میں نے تمام پریوں کو اکٹھا کیا اور دست بستہ ہو کر عرض کیا۔ ’اے میری ہم نشینو! میں نے تم میں سے کسی کو بھی زبردستی اپنے گھر میں نہیں رکھا۔ کوئی میرے عشق میں مبتلا ہو کر آئی ہے، کوئی مجھے خواب میں دیکھ کر فریفتہ ہوئی ہے، کسی نے مجھے بازار سے گذرتے ہوئے دیکھ کر دل پر چوٹ کھائی ہے اور کسی نے خود میرے گھر میں مجھ سے اپنی محبت کا آغاز کیا ہے، کسی نے رقص میں اپنے کو کھو دیا ہے اور کوئی گانے بجانے میں سب کچھ بھول بیٹھی ہے۔ لیکن چند روز سے بڑی پریشان کن خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ خدانخواستہ ایسی صورت نہ پیدا ہو کہ میں تصویرِ حسرت بن کر رہ جاؤں۔‘ بس یہ چند جملے میں نے کہے اور اس کے ساتھ ہی بے اختیار ہو کر رونے لگا اور سرفراز پری کی طرف منہ کر کے کہا ’خدا جانتا ہے کہ میری ہر راحت تمہارے اختیار میں ہے، میں نے تمہیں قید کر کے نہیں رکھا ہے تمہارا جو جی چاہے وہ تم کر سکتی ہو میں تمہاری ہر تمنا پوری کرنے کو تیار ہوں تمہاری جو خواہش ہو بے تامل ظاہر کرو، میں اس کو پورا کر دوں گا۔‘ مختصر یہ کہ میں تم سب محلات کا تابع ہوں، لیکن خدا کے لیے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے نمک حرامی کا داغ تمہارے دامنوں پر نمایاں ہو۔ یہ تقریر سن کر سب عورتیں قسمیں کھانے لگیں اور یوں گویا ہوئیں کہ ’ہماری

آنکھیں پھوٹ جائیں جو ہم نے تمہاری خوشنودیٔ خاطر کے علاوہ کوئی اور کام کیا ہو' خاص کر سرفراز پری اور حور پری سب سے زیادہ قسمیں کھا رہی تھیں۔ میرے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ آخر میرے دل میں سلگتی ہوئی آگ بجھ گئی، لیکن فکرمند رہا۔

مصاحبینِ خاص کا اجتماع

مذکورہ واقعے سے میں بہت متاثر تھا۔ ہر وقت دل پر ایک غبارِ الم چھایا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے اسی پیچ و تاب کے عالم میں شہنشاہ منزل میں تمام مصاحبوں اور محلات کو طلب کیا اور اپنے دل کی کُل کیفیت ان سب کے سامنے بیان کر دی۔ داروغہ نجم النسا بیگم اور دوسری دو محلات کے اس انکشاف کے بعد مجھ سے ضبط نہیں ہوتا تھا۔ میری گفتگو سن کر تمام لوگوں نے گندی گندی قسمیں کھائیں اور کہنے لگیں کہ 'سرکارِ والا تبار! محض سنی سنائی باتوں پر ہمارے متعلق بدگمانی درست نہیں ہے۔ ہم اپنے سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈالنے میں ہرگز دریغ نہ کریں گے۔' میں نے پھر کہا 'عزت و توقیر خدا کی دین ہے ایسی صورت میں یہ نہ ہو کہ تمہاری پیشانیوں سے کوئی داغ عیاں ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ عین نمک حرامی ہوگی۔' جب سب نے پوچھا کہ اس قسم کی آپ کو اطلاع دینے والا کون ہے، تو میں نے نہایت صفائی سے ان محلات کا اور داروغہ نجم النسا بیگم کا نام ظاہر کر دیا۔ اس روز کے بعد سے ان لوگوں میں کافی ٹھنی رہتی ہے اور مرتے دم تک آپس کی یہ چپقلش دور نہ ہوئی۔

ان لوگوں کے انکار کے بعد میں نے سب کا قصور معاف کیا۔ لیکن میرے دل سے اس کی کھٹک نہ گئی۔ افسوس کہ میں نے کچھ دن اور صبر سے کام نہ لیا، ورنہ کیا عجب کہ میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتا۔

میر احمد علی اور میر گوہر علی

اسی زمانے میں میر احمد علی مرثیہ خواں اور اس کا فرزند میر گوہر علی میری سرکار میں آ کر ملازم ہوئے۔ یہ دونوں شخص دُھرپد کا راگ گانے میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ گوہر علی چونکہ موسیقی میں میرا شاگرد بھی تھا اس لیے میری سرکار میں وہ معزز اور بارسوخ ہو گیا تھا، رفتہ رفتہ وہ سب سے زیادہ میری صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں خلوت میں ہوں کہ جلوت میں وہ بے

دھڑک باریاب ہو جاتا۔ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی اور اسے جو کچھ کہنا ہوتا وہ صاف کہہ دیتا تھا اور میں اس کی ہر غرض کو فوراً قبول کر لیتا تھا۔ ایک روز اس نے ایک عرض داشت تحریر کر کے میرے ملاحظہ میں پیش کی۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

'جہاں پناہ! آستاں بوسی کے بعد عرض کرتا ہوں کہ پریوں کے حالات خانہ زاد سے دیکھے نہیں جاتے، میں متوقع ہوں کہ حضور والا دریافت حال میں تاخیر نہ فرمائیں گے۔ اس کے بعد خود اعلیٰ حضرت پر سارے واقعات ظاہر ہو جائیں گے۔'

یہ عرضی پڑھ کر مجھے بڑا غصہ آیا کہ پریاں اس قدر زبردست تردید اور معذرت کے بعد، پھر انہیں حرکتوں پر اتر آئی ہیں۔ غرض کہ میرے دل پر جو پرانا داغ تھا وہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ پریوں اور مصاحبوں کے اجتماع میں جس میں گوہر علی بھی موجود تھا۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے بڑی ملامت کی، لیکن ان لوگوں نے توبہ کی اور سر پیٹنے لگیں۔ سرفراز پری اور حور پری نے عرض کیا۔ 'اگر ایسا کوئی آدمی ہے جو حضور کی نمک حرامی کرتے ہوئے ہمیں دیکھے تو وہیں ہمارا ہاتھ پکڑ کر دکھا دے، تب ہم اپنا قصور تسلیم کریں گے، جب تک کہ حضور خود اپنی آنکھوں سے ہماری کوئی نازیبا حرکت ملاحظہ نہ فرمائیں کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے قصور ثابت کرنے کا مدعی ہو تو اس کو چاہیے کہ اعلیٰ حضرت کو بھی مشاہدہ کرائے۔' یہ تقریر سن کر میں خاموش ہو گیا۔ آخر میں نے گوہر علی کو اسی بنا پر نوکری سے نکال دیا کہ ممکن ہے اس سلسلے میں وہ کوئی چال چل رہا ہو۔ لیکن پھر بھی میری تشفی نہ ہوتی تھی اور طرح طرح کے خیالات اور اندیشے میری جان کھائے جاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں چند روز بعد خفقان کا مریض ہو گیا اور بعض وقت دن دن بھر اختلاج سے میرا دل دھڑکتا رہتا تھا، لیکن چونکہ ابھی عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ پریوں کے ناچ گانے میں طبیعت بہل جاتی تھی اس لیے اس مرض کے اثرات کم ہوئے، پھر بھی دل بڑا اداس اداس سا رہتا تھا۔ اس لیے کہ ایسا کوئی رفیق ہی نہ تھا جس سے میں اپنا حالِ دل کہہ کر دل کا بخار نکالتا، جن مردوں کو میں نے اپنا رفیق سمجھا تھا وہ ایسے نکلے۔ ہمدم و مونس عورتوں کا یہ حال، ماں باپ تو کبھی پوچھتے بھی نہ تھے۔ محلات ایسے کہ ان سے شرم آتی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں اس زمانے میں میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اٹھنا بیٹھنا بھی میرے لے دوبھر تھا۔ بیٹھے بیٹھے نماز ادا کرتا تھا، مسلسل

تین مرتبہ ایسا بیمار پڑا کہ کامل چھ ماہ تک اٹھ نہ سکا۔ اللہ رحم کرے۔

معشوقِ خاص سے عشق

سرفراز پری کی بے وفائی جب انتہا کو پہنچ گئی تو اس سے میرا ولولۂ عشق بھی کم ہونے لگا اور اس کا اتنا زبردست صدمہ تھا کہ میں پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا، کبھی جنگل کی طرف نکل جاتا تو کبھی دریا کی سیر کو چل پڑتا، غرض کہ عجیب عجیب وسوسے میرے دل میں پیدا ہوتے تھے اور میں اسی حزن و ملال کے عالم میں گھر واپس ہوتا، تنہائی میں اس بے وفا کو یاد کر کے کڑھتا اور کبھی اپنی صورت آئینے میں پہروں دیکھا کرتا۔

ایک روز رشک پری نے میری اندرونی حالت کو محسوس کر کے اظہارِ تاسف کیا، اس عورت نے میری بڑی خدمت کی ہے، خدا اس کو اچھا رکھے۔ وہ یوں گویا ہوئی ’جانِ عالم! میں آپ پر تصدق جاؤں، آخر آپ کس بات پر اس درجہ ملول ہیں؟ میں نے جواباً کہا ’اے معشوقۂ باوفا۔ سرفراز پری نے میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ تم کو اگر اس کے اصلی اسباب کا علم ہو تو مجھے بتاؤ تاکہ میرے دل کی خلش دور ہو۔‘ اس نے ایک زور کا قہقہہ لگا کر کہا ’اے میرے نادان! میں اس مکار عورت کے سارے مکر جانتی ہوں، لیکن آپ کو چاہیے کہ اس قدر رنج نہ اٹھائیں۔ اپنی روح کو تازہ گلاب کی طرح شگفتہ و تازہ رکھنا چاہیے۔ خدا نے چاہا تو اس کی ساری فریب کاریاں ایک روز آپ کو دکھا دوں گی۔‘ پھر میں نے کہا ’اے معشوقۂ باوفا جو کچھ جانتی ہو اس وقت بتادو۔‘ اس پر اس نے سرفراز پری کے وہی واقعات سنائے جو اس سے قبل میرے گوش گذار ہو چکے تھے۔ اس بیان سے مجھے اور زیادہ تکلیف ہوئی کہ یا اللہ آخر ماجرا کیا ہے، سامنے تو شیفتگی اور پیچھے ایسی بے وفائی ___ اسی صحبت میں رشک پری سے میں نے ایک ایک پری کے حالات دریافت کیے۔ اس نے ایسے ایسے واقعات سنانا شروع کیے کہ میں دنگ رہ گیا اور اسی وقت سے تمام پریوں سے مجھے نفرت ہونے لگی اور معشوقۂ خاص رشک پری سے دل بستگی پیدا ہوئی، چونکہ اب وہ میری مونس و شفیق پری تھی اس لیے ہر بار میں اس سے صرف اسی موضوع پر گفتگو کرتا تھا۔

اس میں شک نہیں بعض اوقات وہ رشک و حسد کی بنا پر آپے سے باہر ہو کر سرفراز پری اور دیگر پریوں کی شکایتیں کرتی تھی، لیکن پھر بھی اس کی محبت کا جادو مجھ پر چل چکا تھا اور اس کے ایک ایک

جملے پر میں سوسو بار قربان ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میں اس کی بلائیں تک لیتا تھا اور اس سے کہہ رکھا تھا کہ ُاے معشوقۂ خاص یہ راز اگر تم مجھ پر ظاہر کردو تو میں تمہارا بندۂ بے دام ہوکر رہ جاؤں گا۔ٗ چنانچہ اس نے وعدہ کیا کہ میں تمام حالات معلوم کر کے رہوں گی اور اس کے بعد سے ہر ایک کی ٹوہ میں لگی رہی۔

سرفراز پری کے حالات کا انکشاف

ایک رات دلدار پری میری صحبت میں تھی۔ تنہائی پا کر اس نے سرفراز پری کی فریب کاریوں اور کج ادائیوں کا تذکرہ چھیڑا اور کہا ُاے جانِ عالم! آپ بھی بڑے نادان ہیں، عورتیں کچھ کا کچھ کہہ رہی ہیں اور آپ ان کے عشق میں غافل ہوگئے ہیں۔ خدا کے واسطے اب تو آنکھیں کھولیے اور دیکھیے کہ کیا ہو رہا ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ اپنے ہی گھر سے غافل ہیں اور مفت میں لاکھوں روپے برباد کر رہے ہیں، آپ اگر اوروں کی بجائے میری قربت حاصل کرتے تو ہرگز حالات یہ رخ نہ اختیار کرتے۔ آپ اپنی معشوقانہ جفا پیشہ کو ابھی سمجھے نہیں ہیں۔ٗ

یہ حقیقت ہے کہ دلدار پری ایک مریم صفت عورت ہے، فرشتہ خو، کم گفتار، راست گو، خوش نہاد، پاک باطن، صاف دل، پری تمثال، رشکِ شمشاد، سمن بر، رشکِ قمر، خوش خصال، ماہ تمثال، زہرہ جبیں، خجستہ آئین، حور بدن، گل پیرہن، سیم تن، سرو چمن، آئینہ جبیں، جس کے ہر انداز پر میں سو جان سے فدا تھا اور اس کی ہر شوخی میری رگِ جاں پر نشتر زنی کرتی تھی۔ میں نے جب دیکھا کہ ایسی پری پیکر میری طلب گار ہے تو اس کو میں نے فوراً قبول کرلیا، لیکن ساتھ ہی زمانے کی بے وفائی کا اثر بھی مجھ پر غالب تھا، جیسا کہ خود میرا ایک شعر ہے۔

یکا یک عشق کیا نکلے کہ شہر حسن میں گھر ہے ‏ ‏ ‏ ‏ فراق اس روح کو کیونکر گوارا ہوئے قالب کا

سرفراز پری کے غم میں میرا سینہ گویا چونے کی بھٹی کی مثال ہوگیا تھا، اس کی محبت ویسے کم ہوتی جارہی تھی۔ لیکن ایک خلش سی آٹھوں پہر دل میں رہتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور شکایت آمیز انداز میں کہا ُاے جانِ جاں، خواہ مخواہ تو مجھے مبتلائے غم کیے ہوئے ہے، یہ کہاں کا طریقہ ہے کہ کسی کے دل کو اپنے عشق میں مبتلا کرے، لیکن خود بے مروّتی کا سلوک کرے۔ تیری اس نازیبا حرکت کا مجھے بڑا ملال ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا، براہِ خدا راہ راست پر

آ جا۔ لیکن وہ اسی طرح قسمیں کھانے لگی اور اپنی بے گناہی اور مجھ سے بے پناہ محبت کا یقین دلانے لگی۔ اس گفتگو کے دوران میں وہ کبھی ہنس جاتی اور کبھی یکا یک رو پڑتی، کبھی مجھ پر ہی الزام رکھتی کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ تم سزا کو پہنچے، کبھی ہاتھ بڑھا کر کسی پری کو پان کا بیڑا دیتی اور مجھ پر التفات نہ کرتی۔

ایک روز میں نے اس کے ہاتھ کی انگوٹھی اس سے مانگ لی اور دل میں ٹھان لیا کہ اس کو گرم کر کے اپنے جسم کو داغ لوں گا، جس وقت میں صبح کی نماز کے لیے اٹھا تو چاہا کہ حقے کی چلم کی آگ میں انگوٹھی کو گرم کر کے اپنے جسم پر داغ لوں، لیکن چونکہ انگوٹھی اس بے وفا عورت کی نشانی تھی۔ اس لیے یہ گوارا نہ ہوا کہ انگوٹھی کو گرم کروں۔ انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر حقے کی منہال کو خوب گرم کیا اور بائیں ران پر اس سے آٹھ جگہ داغ دیا، لیکن پھر بھی میرے دل میں محبت کی جو آگ سلگی ہوئی تھی وہ بجھ نہ سکی۔ اس کے دو ایک روز بعد اس جفا پیشہ معشوقہ کے پاس جا کر کہا 'اے ستم شعار حسینہ، میں نے دیکھ تیری محبت میں اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔' جب اس نے میری ران پر جلے ہوئے نشان دیکھے تو خوب ٹھٹھہ مار کر ہنسنے لگی اور میری ران کے زخموں کو چومنے لگی، لیکن اس کی لاپروائی اور کج ادائی میں کوئی فرق نہ آیا۔

عشق جفا پیشہ

کچھ زمانہ گذرا تھا کہ ایک روز وہ بے وفا، جفا جو، ظلم نہاد و ستم پیشہ، عورت جس کو اپنے حسن و ناز پر بے حد ناز تھا۔ کہنے لگی 'اے جانِ عالم! و بے خبر انسان، تمہیں کچھ معلوم ہے کہ تمہارے عشق میں، میں نے بھی اپنی ران پر مضراب کا گل کھایا ہے، یہ کیفیت معلوم کر کے میں زار و قطار رونے لگا اور میں نے بہ چشم خود دیکھا کہ اس کی ران واقعی تختۂ گل بنی ہوئی تھی، مجھے اس بات سے تعجب ہوا کہ ایک طرف تو اسکی بے وفائی کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف محبت کا یوں اظہار کرتی ہے، آخر اس کی دو رنگی محبت کا کیا مطلب ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اس کے زخموں کو بوسے دیئے اور ان پر اپنی آنکھیں ملیں اور کہا کہ 'تم نے تو میری پوری نقل اتاری۔' اس پر اس نے کہا کہ 'یہ تمہارے گلوں سے بالکل الگ ہے، فارسی کے اس مصرعے کے مطابق ہیں۔

نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل'

میں یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ بعد میں مجھے دلدار پری اور رشک پری سے معلوم ہوا کہ یہ گل محض دھوکہ دینے کے لیے کھائے گئے ہیں تا کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ اس کو آپ سے بے انتہا محبت ہے۔ ان کوائف سے میں پھر ایک دریائے تفکر میں ڈوب گیا اور اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ لاکھ ضبط کیا، لیکن نہ رہا گیا اور اس کے پاس جا کر کہا 'اے بے مہر و بے وفا تو خواہ مخواہ ڈھونگ رچا کر محبت کا دم بھرتی ہے۔ اے دغاباز تو اپنے مکر وفریب سے ابھی تک باز نہیں آئی۔' وہ ہنس کر کہنے لگی 'کوئی اپنے جسم کو فضول داغ نہیں دیتا۔ یہ جذبۂ عشق ہی تھا جس کی بنا پر میں نے ایسا کیا۔' اس کی یہ تقریر بڑی پُر تاثیر تھی اور اس میں اس کے عشق کے جذبات کارفرما تھے، لہٰذا میرا دل بھر آیا اور اپنا سر دروازے سے ٹکرانے لگا، وہ اگر مجھے پکڑ نہ لیتی تو میرا سر یقیناً پھٹ جاتا۔ غرض رات دن اس کے مکروفریب اور عشق و محبت کے درمیان میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا اور اس ٹوہ میں تھا کہ اس کے در پردہ حالات کا مجھے کسی طرح علم ہو جائے۔

دلدار پری کا اظہارِ عشق

دلدار پری بری طرح میری وارفتہ محبت تھی اور میں نے بھی اس کی ایسی ہی قدردانی کی۔ انتہا یہ کہ اس کے بغیر کھانا پینا بھی حرام ہو گیا۔ اکثر اس کے زانوں پر سر رکھ کر سو جاتا۔ لیکن جب معشوقۂ خاص اور سرفراز پری کے کمند زلف کا اسیر ہوا تو دلدار پری پر التفات کم ہو گیا، لیکن وہ اپنے عشق کی زبردست دعوے دار تھی۔ ایک روز وہ روتی ہوئی مجھ سے کہنے لگی کہ 'تم میرے حال سے بالکل بے خبر ہو۔' میں نے جواب دیا کہ خود میں اپنے حال سے بے خبر ہو رہا ہوں تو بھلا دوسرے کے حالات سے مجھے کیا آگاہی ہو سکتی ہے۔' پھر اس نے یوں کہا کہ 'اے سنگ دل آدمی میں نے تیرے فرطِ عشق میں انگوٹھی کا گل کھایا ہے اور تمہیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ کم از کم تھوڑا مرہم ہی مرحمت کیجیے کہ میں اپنے زخموں پر لگاؤں۔' میں نے مشاہدہ کیا تو واقعی اس کی ران پر انگوٹھی کا جلا ہوا نشان موجود تھا۔ میں نے متاسف ہو کر کہا۔ 'آخر تمہیں کیا ہو گیا تھا، جو ایسی حرکت کر بیٹھیں۔ پھر اس نے کہا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا، آپ کوئی فکر نہ کریں۔' باوجود اس کے نہ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور نہ خود وہ میرا کوئی خاص خیال کرتی تھی۔

معشوقۂ خاص اور سرفراز میں جھگڑا

مخبروں نے جب ان واقعات کی اطلاع سرفراز پری کو دی تو وہ آگ بگولہ ہوگئی اور ان تمام آدمیوں کی دشمنِ جانی ہوگئی جو میرے پاس اطلاعات پہنچاتے تھے۔ اب ہر وقت اور ہر محفل میں وہ افسوں طرازیوں اور دل جلانے والی باتوں سے کام لینے لگی، جب مجھے نواب معشوقۂ خاص پر زیادہ متوجہ دیکھا تو معشوقۂ خاص سے لڑنے جھگڑنے لگی۔ بات یہاں تک بڑھی کہ ایک روز ہاتھا پائی تک ہوگئی، اِس کی چٹیا اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی چٹیا اِس کے ہاتھ میں۔ اس طرح صبح سے دوپہر تک یہ لڑائی ہوتی رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ سرفراز پری کی لاتوں سے معشوقۂ خاص بے قابو ہو رہی ہے، تو میں دوڑا ہوا گیا اور بیچ بچاؤ کیا اور دونوں کو سمجھا بجھا کر الگ کردیا، لیکن معشوقۂ خاص میری گریبان گیر ہوکر کہنے لگی۔ 'اب یہ وقت آ گیا ہے کہ تم اپنی چہیتی عورتوں سے میری بے عزتی کرانے لگے، اب میں ہرگز اس گھر میں نہ رہوں گی۔'

میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ محض اس کی سمجھ کا پھیر ہے، لیکن وہ غصے میں میری کوئی بات سنتی ہی نہ تھی، وہ چونکہ اب جانے پر تُلی ہی بیٹھی تھی اس لیے میں نے اس کے لیے سواری حاضر کرنے کا حکم دیا۔ معشوقۂ خاص کی مفارقت مجھے کسی طرح گوارا نہ تھی، لیکن اس کی ضد کے آگے میں مجبور ہو گیا۔ آخر کار وہ سوار ہو کر چلتی بنی۔

میرا دل بری طرح بھر آیا اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ میں عجیب مصیبت میں تھا کہ ایک طرف ماں باپ کا خوف تھا اور دوسری طرف معشوقۂ خاص سے بے پناہ محبت۔

میں اسی عالم میں تھا کہ ایک ملازم نے آ کر عرض کیا۔ 'معشوقۂ خاص مرغی خانے تک جا کر واپس ہوگئی اور کوٹھے پر اپنی نشست کے کمرے میں چلی گئی ہیں۔' میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پھول کی طرح کھل گیا۔

سرفراز پری کا روٹھ کر جانا

معشوقۂ خاص کا آدھے راستے سے گھر واپس آنے کا معلوم کر کے سرفراز پری کو بڑا تاؤ آیا اور اب وہ گھر سے چلی جانا چاہتی تھی۔ اسی حالتِ غیض و غضب میں وہ خودکشی کے ارادے سے کنوئیں کے قریب چلی گئی، لیکن کچھ لوگوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کے بعد میں نے اس کے قریب

جا کر بہت کچھ سمجھایا۔لیکن وہ کسی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی اور ہر حال میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی، عجیب صورت درپیش تھی۔آخر میں نے تنگ آ کر کہہ دیا 'تم ڈراتی کیا ہو، جانا ہو تو چلی جاؤ'۔ یہ سن کر وہ بے رحم سواری میں بیٹھ کر چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی تصویر اپنے گلے میں آویزاں کر لی اور ایک منزل میں دروازے بند کر کے بیٹھ رہا۔

مجھے پوری طرح یقین تھا کہ سرفراز پری چونکہ بے وفا ہے ہی، اس لیے اب دوبارہ اس کا یہاں آنا ممکن نہیں۔ مجھے بے ساختہ رونا آ رہا تھا۔کبھی اپنے زخموں کے نشان دیکھتا تھا اور کبھی اس کی تصویر کے بوسے لیتا تھا،غرض اسی طرح کامل چار گھنٹے گذر گئے، یکا یک دیکھتا ہوں کہ وہ سامنے سے چلی آتی ہے۔ میں نے بے تابی کے ساتھ دوڑ کر اسے گلے لگا لیا۔وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، ہم کافی دیر تک اسی طرح تنہائی میں بیٹھے رہے۔ میں معذرت کے بعد عشق و محبت کی باتیں کرنے لگا۔

معشوقۂ خاص کو جب یہ تمام باتیں معلوم ہوئیں تو وہ جل کر کباب ہو گئی اور اس کے سینے میں آتشِ رشک بھڑکنے لگی۔

سلطان پری کی کج ادائی

اگر چہ دشمنوں نے جلاپے کے مارے سلطان پری پر بھی بے وفائی کا اتہام لگایا تھا،لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بری طرح میری پرستار ہے اس بہتان کو جب اس نے سنا تو اس کو اس قدر رنج ہوا کہ وہ متواتر دو تین روز تک روتی رہی، جس کی وجہ سے وہ لاغر و ناتواں ہو کر رہ گئی اور اس کو فت میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔آخر اس سے غصہ ضبط نہ ہو سکا تو اس نے میری بے خبری میں میری ولی عہدی کی مہر اٹھا لی اور اس کے نگینے کو گرم کر کے اپنی ران پر تین جگہ داغا، یہاں تک کہ مہر کے تمام حروف ران کے گوشت میں پیوست ہو گئے۔ اس کے بعد میری طرف لنگڑاتی ہوئی آئی۔ جب میں نے لنگڑانے کا سبب پوچھا تو رونے لگی اور میرے ہاتھ میں مہر تھماتے ہوئے کہنے لگی۔'میں آپ کے قربان جاؤں، آپ نے مجھے بے وفا اور نمک حرام لوگوں میں شامل کر لیا ہے،لیکن دیکھو میری ران کی کیا حالت ہو رہی ہے۔' میں اس کی ران میں اپنی مہر کے حروف کو مثالِ آفتاب درخشاں دیکھ کر ششدر رہ گیا اور ساتھ ہی اس سے معافی کا خواستگار ہوا۔پھر وہ میرے گلے سے لپٹ کر خوب

روئی۔ اس کے بعد سے میرا دل اس کی طرف سے مثل آئینہ صاف ہو گیا۔

امراؤ بخش

اسی دوران میں امراؤ بخش نامی ایک عورت امّن کے توسط سے آئی اور میرے گھر بیٹھ رہی۔ یہ عورت کچھ کچھ موسیقی کے فن سے واقف تھی۔ دو تین ماہ بعد اس کے حمل ٹھہرا۔ میں نے اس کا پردہ کرادیا۔

حضور باغ کی آراستگی

شروع سے میں صفائی پسند تھا۔ نیز ایجادات و بنائے عمارات میں بھی یکتا تھا۔ لہٰذا باغ کی آراستگی اور نہروں کی تیاری کا خیال ہوا۔ فی الحال میں نے دو نہریں جاری کرنے کی تجویز سوچی، ان میں سے ایک کا نام چشمۂ شیریں اور دوسری کا نام چشمۂ فیض رکھا اور ان کے انتظام و انصرام کے لیے علی نقی خاں کو مقرر کیا۔ یہ صاحب نہایت منتظم اور اس کام کے اہل ثابت ہوئے۔ تھوڑی ہی مدت میں باغ اور نہروں کو آراستہ کر کے میرا معائنہ کرایا۔ میں نے باغ کا نام 'حضور باغ' رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسا باغ اور ایسی نہریں اس سلطنت کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھی گئیں۔ اس باغ میں ہر موسم کے لحاظ سے الگ الگ مکان ہیں۔ 'شہنشاہ منزل' سردی کے موسم میں نہایت آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا حوض بھی ہے جو کہ گملوں وغیرہ سے آراستہ ہے۔

گرمی گذارنے کے لیے 'خاص مکان' سے زیادہ اچھا کوئی اور مکان نہ ہوگا۔ خدا جانے اس جگہ پر کسی طرح سے ہوا کا کرہ محفوظ ہو گیا ہے، جب دھوپ تیز ہو جاتی ہو اور آدمی مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہوں، اس جگہ آنے کے بعد ایک عجیب ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ اس مکان میں سنگِ مرمر کا فرش ہے۔

برسات کے موسم میں 'فلک سیر' ایک عجیب وغریب مکان ہے۔ یہ مکان حضور باغ کے بیچ میں بنایا گیا ہے اور اس قدر فرحت بخش ہے کہ میں کچھ بیان نہیں کرسکتا۔

اس باغ کی آراستگی اور تعمیر کے سبب سے علی نقی خاں میری عنایتوں کے مستحق ہوئے تو انہوں

نے اپنی طرف سے مسعود علی بیگ نامی ایک شخص کو لا کر باغ کے داروغہ کی خدمت کا خلعت مجھ سے عنایت کروایا۔ باغ میں چشمۂ شیریں نام کی نہر چالیس گز کی ہے اور دوسری نہر چشمۂ فیض دس پندرہ گز کی، جس کے اطراف فوارے ہیں ان فواروں سے جب پانی اچھلتا ہے تو برسات کا سا لطف آنے لگتا ہے۔ جا بجا سفید سنگِ مرمر کی چوکیاں اور تصویریں نہایت سلیقے سے رکھی گئی ہیں، ہر ایک چمن میں الگ الگ ایک ہی قسم کے پھولوں کے تختے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ گلاب کے چمن میں نسترن یا نسترن کے چمن میں کوئی گلاب کا پودا ہو، جگہ جگہ چینی کے مرتبان اور سنگی گلدستے رکھے گئے ہیں جن میں درخت لگائے گئے ہیں اور یہ درخت اتنے گنجان ہیں کہ پانی کا ایک قطرہ بھی نیچے نہیں گر سکتا۔ درختوں کے نیچے آرام کرنے کے لیے سنگِ مرمر کی چوکیاں بچھائی گئی ہیں، باغ کے ہر کونے میں سرو اور چنبیلی کے پودے ہیں، ہر چمن کے کونے پر مہندی کی باڑھ کی حفاظت کے لیے لکڑی کے کٹہرے ہیں، اونچے درختوں میں خاص کر شہتوت کا درخت اتنا بڑا ہے کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس درخت کے نیچے سنگِ مرمر کا چبوترہ بنایا گیا ہے، تاکہ برسات میں اس پر بیٹھ کر لطف اٹھایا جا سکے۔ ہر جمعے کو اس درخت کے نیچے پریوں اور گانے والیوں کی مجلس منعقد ہوتی ہے۔ خوش آواز پرندے اور خوش رنگ طاؤس اسی درخت پر بیٹھتے ہیں۔ اس باغ میں پرندوں کا شکار منع ہے۔ خان مذکور اپنی بہترین کارکردگی کی وجہ سے چونکہ میرے مقربین میں شمار ہونے لگے ہیں اور میری عنایتوں کے مستحق قرار پائے ہیں اس لیے وہ میرے بہت سارے گھریلو معاملات میں دخیل ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر داروغہ میر محمد مہدی جلنے لگے اور خواہ مخواہ ان کے دشمن ہو گئے۔

علی نقی خاں کی چندیا پر بال بہت کم تھے۔ اسلیے ایک روز میں نے محض مذاق میں کہا کہ نواب صاحب سر پر بالوں کا نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آپ وزیر ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ 'حضور کے تصدق سے انشاء اللہ ایسا بھی ہو کر رہے گا۔' ان کی یہ بات میرے دل کو لگی اور دل ہی دل میں کہا یا اللہ میں نے دروغ بیانی سے کام نہیں لیا۔ اگر تیری مرضی شاملِ حال رہی تو وقت آنے پر میری بات سچ ہو کر رہے گی۔

جوگی اور جوگن

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ پریوں کا جمگھٹا، گانے والوں کی بہتات، اور میرے جذبۂ عشق و وفورِ

محبت کا بڑا زور تھا۔ یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ اب رات ہے یا دن، خوش گلو گانے والے، خوش اطوار بجانے والے، ستار کا شور، پکھاوج کی جھنکار اور پھر مسلسل چار پانچ پہر تک طبلہ بجانے کی آواز ایک عجیب سماں ہوتا تھا، معشوقوں کے غم کے علاوہ کوئی اور غم تھا ہی نہیں۔ معشوقوں کا بھی یہی حال تھا۔ عمدہ کھانوں، بیش بہا لباس اور گانے بجانے کے علاوہ وہ کچھ جانتی ہی نہ تھیں۔ خدا کی مہربانی ایسی شاملِ حال تھی کہ کسی قسم کا غم مثل عنقا ناپید تھا۔ میں ہمیشہ کسی نہ کسی شاہد رعنا سے ہم آغوش رہتا۔ فلک کینہ پرور مارے رشک کے حسرت کے آنسو تاروں کی آنکھوں سے زمین پر گراتا۔ حوریں میری محفل وطرب حسرت بھری نظر سے دیکھتیں۔

آسمان پر چاروں طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار کے قطرے درختوں کے تر و تازہ پتوں پر گر گر کر عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ نسیم عنبر فشار حضور باغ کے چاروں طرف نکہت گل پھیلا رہی تھی۔ عندلیبان نغمہ سرا و طائرانِ خوش نوا سیوتی کے پھول کی شاخوں پر عجیب مستانہ ادا سے خوش الحانی کر رہے تھے۔ باغ کے مستعد جفاکش مالی۔ ہاتھوں میں بیلچے لیے روشوں کو آراستہ کر رہے تھے، خاص کر کروندے کے درخت پر عجیب بہار آئی ہوئی تھی۔ جو سرتا پا برگ و بار میں لدے ہوئے تھے۔ گلاب کے تختوں کا بھی بڑا پُر لطف منظر تھا۔ درختوں اور ان کی شاخوں اور ان کے پتوں کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ ہزارہ کے سنگتروں سے تمام باغ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ کمرخ کے درختوں کا سایا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے باغ میں کوئی سبز خیمہ تنا ہوا ہو۔

باغ کے جو نئے چمن تھے ان میں بڑے نایاب قسم کے تقریباً ایک ایک ہزار درخت لگائے گئے تھے، جو ایک ہزار اقسام پر مشتمل تھے۔ اس کے علاوہ ایک چمن صرف ناشپاتیوں کا تھا۔ اسی طرح ایک چمن صرف سیب کا تھا۔ ایک چمن میں صرف شفتالو کے درخت تھے اور ایک چمن محض کروندوں کا تھا۔ ایک چمن امرودوں کا اور ایک ہزارہ کی نارنگیوں کا اور ایک چمن ولایتی نارنگی کا۔

حیرت ہے کہ یہ سارے درخت تاڑ کے مانند تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایک گز سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ مہندی کی روش بھی نہایت سلیقے سے ہر چمن کے گرد لگائی گئی تھی۔ ایک چمن گل ساوَنی اور ایک گل سیوتی کا تھا۔ ایک چمن صرف نسرین کا تھا جس کے سفید سفید پھول ہرے ہرے پتوں میں آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے تھے، ایک تختہ چنبیلی کا بھی تھا، ایک چمن گُلِ داوَدی کا تھا جن کا زرد اور سفید رنگ آفتاب و مہتاب کی طرح روشن رہتا تھا۔

سارے باغ کے گرد یکساں روش تھی جس پر تین بگھیاں ایک دوسرے کے برابر برابر ہو کر گذر سکتی تھیں۔ اس روش کے دونوں رویہ موز کے درخت لگائے گئے تھے جو بے قرار عشاق کی طرح اپنے بڑے بڑے پتوں کے بازو ایک دوسرے کے آغوش میں ڈالے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے اس راستے کا نام 'ٹھنڈی سڑک' مشہور ہو گیا۔ مختصر یہ کہ موز کے پتے آپس میں اس طرح مل گئے تھے کہ اس میں دھوپ مطلق نہ گذر سکتی تھی۔ میں اسی کے سائے میں بیٹھا ہوا اس یار غفلت شعار کی فرقت میں اپنے دل کو رشکِ گلزار بنائے ہوئے تھا اور خود میری ہی تصنیف 'مثنوی افسانۂ عشق' زیرِ مطالعہ تھی۔ اس عالم میں یکا یک جنون کا غلبہ ہوا اور مجنون کی طرح عریانیٔ تن کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اسی عالمِ بے خبری میں دل کے آئینے کو غبار آلودہ اور جگر فگار کو رشک دہ لالۂ پُر بہار بنا کر سب کے سامنے سے گذر گیا۔

جوگیوں کا خاص امتیازی ساز و سامان میرے جسم پر تھا۔ موتیوں کی خاک صبح صادق کی طرح میرے چہرے پر چمک رہی تھی۔ موتیوں کا کنٹھا گلے میں، معشوقۂ خاص اور نواب سکندر محل جوگن بنی تھیں۔ ان کا ہاتھ میں نے اپنے بغل میں دبا لیا تھا۔

ہم تینوں کے جسموں پر بنارسی چادروں کی گاتیاں لپٹی ہوئی تھیں اور چہروں پر جلے ہوئے موتیوں کی خاک ملی ہوئی تھی۔ بال پریشان جن کی خوشبو سے سارا باغ معطر تھا، کانوں میں گوشوارے اور گلے میں موتی کی مالائیں۔ اس محفلِ مدہوشی کے حاضرین میں مصاحب، ملازم، ارباب نشاط وغیرہ موجود تھے اور سب کو سرور کے نشے نے کچھ ایسا متاثر کیا کہ یکا یک سب کے سب بے خود ہو کر اپنے کپڑے پھاڑنے لگے اور اسی عالم میں تمام آلاتِ موسیقی، جیسے ساز، ستار، رباب، سارنگی، مردنگ، طبلہ، جھنجھنا اٹھے، خوش آواز گانے والوں نے ایسی نغمہ سرائی شروع کر دی کہ ان کی آواز آسمان تک جا پہنچی۔ جو لوگ یہ حال دیکھ رہے تھے وہ ششدر اور حیران تھے اور سب کے حواس چھوٹ گئے تھے۔

غرض کہ اس محفل کی حالت نے کسی کے ہوش بجا نہ رکھے، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسو نہ بہا رہی ہو اور کوئی دل ایسا نہ تھا جو مضطرب و بے چین نہ ہو رہا ہو۔ جوگی زرنگار دوپٹہ اپنی کمر میں پہنے ہوئے تھے جس کے نورِ تجمل سے تجلی برس رہی تھی۔ جس وقت دوپٹے کی گرہ لگائی گئی کمر کی باریکی تارِ نظر سے بھی کئی گنا زیادہ باریک تھی۔ چشمِ بد دور سینہ اور شانوں کے ابھار کی شان ہی نرالی تھی،

بھری بھری رانیں، سرو کے پیڑ کی مثال تھے۔ جوگی دونوں جوگنوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس مجمع سے جہاں ایک شور برپا تھا تیزی کے ساتھ گذر گیا اور ہر وہ شخص جو ساتھ تھا آپے سے باہر تھا، جو سامنے آیا وہ بھی اپنے ہوش کھو بیٹھا، تمام عورتوں اور تمام مردوں پر خود رفتگی کا عالم تھا۔ درو دیوار، قصر و بام اور ہر پست و بلند کی نظریں جوگی جوگنوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر گلی، ہر مکان، ہر سمت اور ہر کونا، غرض ہر طرف عورتوں کا ایک ہجوم تھا۔ باغ کیا تھا ایک پرستان معلوم ہوتا تھا۔

جب انیس الدولہ بہادر اور رضی الدولہ بہادر باغ کے دروازے پر آئے تو اس عجیب منظر کو دیکھ کر حیرت زدہ و بے خود ہو گئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیئے، چہرے پر اور جسم پر خاک مل کر اور تہمد باندھے ہوئے وہ بھی جوگیانہ بھیس میں آ گئے۔ ان کی آنکھوں سے اس وقت آنسو جاری تھے، مورچھل ہاتھ میں لیے ہوئے آگے بڑھے اور جوگی کے قریب آ کر دیکھا کہ یہاں راگنیوں کی پھوار پڑ رہی ہے۔ جو بھی اس منظر کو دیکھتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ پرستان کا سحر ہے، ابھی کچھ دن باقی تھا کہ سب کے سب اسی حالت میں باغ کے ایک گوشے کی طرف چل پڑے اور شام کے قریب وہاں پہنچے، جادو نواز مطربوں نے خیال۔

نہ کر سانوریا سے یاری میں جوگن بھئی رے

کا راگ گانا شروع کیا اور خوب خوب دادِ موسیقی دی۔ اس وقت جوگی بیراگن پر تکیہ کر کے دایاں پیر بائیں ران پر رکھ کر دلیروں اور مست شیر کی طرح بیٹھ گیا۔ رانوں اور سینے کے کسرتی آثار، سڈول شانوں اور چمکدار رخساروں کا حال کیسے بیان کیا جائے جو بھی دیکھتا تھا عش عش کرتا تھا۔ دونوں جوگنوں کا عجیب رنگ تھا۔ وہ انگور کی بیلوں کے سائے میں محوِ رقص تھیں۔ ان کے ہوشربا رقص اور دل ربا گانے پر کوئی شخص اپنے ہوش میں نہ تھا اور اب سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

شام کو جب سورج ڈوبا اور چاند نکل آیا، جوگی یکایک اپنی نشست سے اٹھ کر اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ چل پڑا اور نہر کے اوپر رفعت منزل' پر مقام کیا۔ نور مہتابیاں روشن کر دی گئیں اور مختلف قسم کی آتش بازی چھوٹنے لگی۔ اس وقت شادی کی برات کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر آدمی کی یہ خواہش ہوئی کہ جوگی کے جلوے کا نظارہ کرنا چاہیے جو اس تقریب کا دولہا بنا ہوا ہے، تا کہ زیادہ سرور حاصل ہو، مختصر یہ کہ جب آدھی رات ہو گئی، دنیا کا رنگ بھی بدل گیا۔ چنانچہ محفل بھی برخواست ہو گئی۔ اب ......؟ ......؟ باقی نہ رہی، دلوں کی حالت معمول پر آ گئی۔ مہتاب نے اپنی

کارفرمائی شروع کردی اور ستاروں نے اپنی آنکھیں جھپکالیں۔
اب جو آنکھ کھلی تو آسمان دوسرا چکر لگا چکا تھا، حقیقت میں نیرنگیِ دنیا کو کوئی قیام نہیں۔کوئی بھی اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرسکتا۔ چونکہ یہ نوایجاد مشغلہ مجھے دل سے پسند آیا تھا، لہٰذا ہر سال ساون کے مہینے میں یہ محفل منعقد ہوتی رہی اور ہر بار اس کا رنگ نیا ہی ہوتا تھا اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

چھوٹے صاحب

ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں پری خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹے خان اور غلام رضا خان میرے حضور میں باریابی کا شرف رکھتے تھے۔ نجم النسا بیگم مرحومہ اور دیگر پریاں ناچ گانے کی تعلیم حاصل کررہی تھیں۔ اس وقت یکا یک آسمان پر سیاہ بادل نے چھا کر ساری دنیا کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ایسا اندھیرا گھپ ہوگیا کہ شب دیجور کا سا سماں ہوگیا، اس ماحول کے دیکھنے سے مارے ہیبت کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور ہر ایک آدمی پر لرزہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ ایسے میں غلام رضا خاں اور چھوٹے خاں نے باتوں باتوں میں کہا کہ گولہ گنج میں چھوٹے صاحب نامی ایک عورت رہتی ہے جو نہایت درجہ خوب صورت اور پسندیدہ قامت کی واقع ہوئی ہے۔
یہ سن کر میں نے چپکے سے اشارہ کیا اور کہا کہ 'تم دونوں میرے ساتھ اسی وقت چلو تا کہ تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔' ان دونوں مصاحبوں نے عرض کیا کہ 'صاحبِ عالم! رات بڑی بھیانک ہو رہی ہے اور دل خوف سے دھڑک رہا ہے۔ لہٰذا ایسے وقت میں گھر سے نکلنا مناسب نہ ہوگا۔' میں نے یہ سن کر کہا 'معلوم ہوتا ہے تم لوگ بزدل ہو۔' تب انہوں نے عرض کیا 'تو حضور ارادہ فرمائیں، ہم سائے کی طرح آپ کے ساتھ ہیں۔'
میں نے اسی وقت تمام حاضرینِ محفل کو رخصت کی اجازت دی۔ غلام رضا خاں، چھوٹے خان اور نجم النسا بیگم مرحومہ اور دیگر پریاں و بیگمات محفل میں حاضر رہیں۔ میں اندر محل میں گیا اور الگ رستے سے پری خانے میں نزول فرمایا۔ وہاں قدرے رک گیا اور تنگ چوڑی دار پاجامہ اور انگرکھا زیبِ بدن کیا، ایک چادر کی ڈیڑھ گرہ کمر میں کسی، اور دو طپنچہ ساتھ لیے اور چادر کے ایک حصے سے سر اور منہ چھپالیا، سر پر دو پلی ٹوپی سادہ کامدانی کی کڑھی ہوئی اس طرح پہنی کہ بھوؤں ک

کچھ حصہ اس میں چھپ گیا، تلوار بغل میں دبالی پھر داروغہ نجم النسا بیگم مرحومہ سے کہا 'میں باہر جارہا ہوں، لیکن کسی کو اس کی اطلاع نہ ہو۔'

غرض یہ کہ پری خانے کے راستے اس اندھیری رات میں کھڑکی سے کود کر گلی میں جا پہنچا اور میرے ہمراہ دونوں مصاحب یعنی غلام رضا خاں اور چھوٹے خان بھی تھے چونکہ گلی بڑی خطرناک معلوم ہوتی تھی اس لیے ہمراہیوں نے کہا 'گلی کی پر ہیبت فضا دیکھنے کے قابل ہے اور عجیب بے سروسامانی کے عالم میں ہماری روانگی عمل میں آئی ہے۔' غرض کہ اسی قسم کی باتوں میں راستہ کٹ گیا اور ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اس جگہ کا نام چھوٹے صاحب کا کوٹھا ہے۔ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کوٹھے پر چڑھنے لگا، ابھی دو چار ہی زینے چڑھے ہوں گے کہ اوپر میری آمد کی اطلاع ہوگئی۔ اوپر جانے کے بعد دیکھا کہ ایک مجمع عام تھا۔ کئی ایک نوعمر جوان جو بڑے شوخ و شریر معلوم ہوتے تھے وہاں موجود تھے، لیکن میری ظاہری شان و شوکت اور وجاہت و اقبال مندی سے وہ مرعوب ہوگئے۔ جیسے ہی ہم لوگ اس جگہ پہنچ کر کرسیوں پر بیٹھے، میرے ہمراہیوں نے اس عورت سے کہا۔ 'ہم نے دہلی کے جن رسالدار صاحب کا تذکرہ کیا تھا یہ وہی ہیں۔' اس آفت زمانہ نے جونہی میرا حسنِ جہاں افروز دیکھا مجھ پر ہزار جان سے فدا ہوگئی۔ عطردان کھولا، میرے کپڑوں پر عطر لگایا اور پان کے بیڑے بنا کر میری طرف بڑھائے۔

میں نے ایک عیار و بازاری آدمی کی طرح اس کی نظر بچا کر اس کا میرے منہ میں دبا ہوا پان نکال کر چھوٹے خان کو دے دیا۔ اس نے دوسرا پان اپنے خاصدان سے نکال کر مجھے دیا اور جس کو میں نے منہ میں دبا لیا۔ اس کارروائی کے بعد میں نے اس سے بایاں مانگ لیا اور بجانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی موزوں کی ہوئی غزل جھنجھوٹی کے راگ میں الاپنے لگا۔ اس معشوقۂ طناز پر میری موسیقی سے جو وجد طاری ہوا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ بالآخر میرا ہاتھ پکڑ کر عشق کا اظہار کرنے لگی۔ لیکن میں نے لاپرواہی سے کام لیا۔ اس کے گھر میں موتی نام کی ایک بلی تھی اس سے کھیلنے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے انتہائی لاپرواہی برتی اور وہ خوشامد سے پیش آرہی تھی۔

اسی طرح ایک پہر سے زیادہ رات گذر گئی۔ اس لیے میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ 'اب جلدی سے یہاں سے روانہ ہونے کی کوئی صورت نکالو۔' یہ سن کر ان دونوں نے دونوں ہاتھ پکڑ کر

مجھے اٹھایا۔ جس وقت ہم جانے کو تیار ہوئے تو وہ دلبر ناز بھی آبدیدہ ہوکر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی اور اپنا زرتار دوپٹہ اپنے سر سے اتار کر میری کمر کے گرد لپیٹ دیا اور ایک انگوٹھی اپنے ہاتھ سے اتار کر مجھے دی اور کہا کہ 'خیر اس وقت تو آپ میرا دل کو دکھ پہنچا کر جا رہے ہیں، لیکن آپ کو چاہیے کہ دوبارہ اپنا جلوہ دکھائیں۔'

میں ابھی بالا خانے ہی پر تھا کہ تھانے دار عمر خاں نے بازار میں کھڑے ہوکر قرنے کی آواز میں اپنے آوارد اہونے کی اطلاع دی۔ لیکن اس عورت نے بہانہ کر کے ٹال دیا اور کہا کہ 'میں نے اپنا دروازہ بند کرلیا ہے، اب میرے پاس کوئی غیر آدمی نہیں ہے، تم یہاں سے جاؤ۔' جیسے ہی میں زینے سے نیچے اترا، سامنے بخش علی خاں کی سواری دکھائی دی، میں پھرتی سے کام لے کر ایک دوکان میں چھپ گیا، میرے ہمراہی بڑے پریشان تھے، جب بخش علی خاں دور نکل گیا، میں دوکان سے نکل آیا اور چلنے لگا، جب گولہ گنج کی چورنگی پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص نئے اور قرنے کی آواز کرتا ہوا میرے قریب آ گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عام طور پر کمر سے تلوار باندھ کر نکلنے کی ممانعت تھی، لیکن راؤند کے آدمی ایک جوان رعنا کو تلوار ہاتھ میں لیے چلتے دیکھ کر بھی خاموش ہو رہے صرف یہی نہیں کہ وہ خاموش ہو رہے، بلکہ انہوں نے راستہ بھی دے دیا، اور میں ان کے درمیان سے ہوکر گذر گیا، مختصر یہ کہ ان واقعات کے رونما ہونے کے باوجود میں خیریت سے پری خانے میں داخل ہوگیا، چونکہ رات اندھیری تھی، اور مجھے تقریباً ساری رات کو چہ گردی کرنی پڑی تھی، اس لیے آتے ہی پلنگ پر لیٹ گیا اور سفید لحاف اوڑھ کر بے سدھ سو گیا۔

معمولی ملازمائیں حسب قاعدہ پائنتی کی جانب بیٹھ کر پاؤں دبانے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والد ماجد کی سختی کے باوجود اتنی جوانمردی کا کام کرنا بڑا مشکل تھا۔

مقابلۂ حسن

مصاحبوں کی نشست و برخاست کے لیے جو عمارت مخصوص کی گئی تھی اس کی مناسبت سے اس کا نام 'وزیر منزل' رکھا گیا تھا، جو کہ 'شہنشاہ منزل' کے عین عقب میں واقع تھی۔

وزیر منزل کے بالکل روبرو شہیدی کی قبر واقع ہے۔ یہ منزل بطور خاص آراستہ کی گئی تھی۔

ایک روز میں 'وزیر منزل' میں تھا، میرے اور چھوٹے خاں کے مابین شرط ہوئی کہ ہم دونوں کی

خوبصورتی کا امتحان ایک نئی عورت کو بلا کر لینا چاہیے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مصاحب خاص چھوٹے خان بھی کسی بت طناز و معشوق دل نواز کے مانند تھا، اور وہ اپنی صورت و شکل پر بڑا نازاں تھا۔

مذکورہ شب والی گفتگو کے دوران میں اس نے کہا 'صاحبِ عالم! مجھ پر بھی بے شمار عورتیں جان چھڑکتی ہیں، لہٰذا آپ مجھ سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہ فرمائیں اس لیے کہ اپنی ابرو کے ایک اشارے سے میں اس کو اپنا گرویدہ بنالوں گا، آپ نے فضول مقابلے کی ٹھانی ہے۔' لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی اپنی بات پر مجھے اصرار رہا آخر یہ طے ہوا کہ ایک ایسی عورت کو بلانا چاہیے جو ہم دونوں سے قطعاً ناواقف ہو، اور کسی وقت کسی عام جلسے یا خاص محفل میں دیکھا بھی نہ ہو۔ یہ طے ہونے کے بعد ایک نہایت حسین و جمیل عورت کو بلایا گیا، چھوٹے خاں دولہا کی طرح سج دھج بنا کر بیٹھا، دوپلّی ٹوپی زیب سر تھی، زرکار و مصالحہ دار انگرکھا زردوزی کا پاجامہ پہن رکھا تھا، اس پر 'عطر مجموعہ' لگایا، بالوں میں خوشبودار تیل اور پان سے منہ لال کیے ہوئے تھا۔

اس عورت کو چھوٹے خاں نے صاحب خانہ کی حیثیت سے بلایا تھا، جس وقت وہ آئی میں پوشیدہ رہا، اور میرے برآمد ہونے سے قبل طے شدہ فیصلے کے مطابق چھوٹے خاں نے اس عورت سے ربط محبت و اختلاط بڑھالیا۔ میں نے پہلے ہی سے کہہ رکھا تھا کہ تم اس کو اپنی محبت کی گرہ میں خوب باندھ لو۔ جب وہ پورے طور پر تمہاری عاشق و شیدا ہو جائے گی، تب میں تم دونوں کے دوران اختلاط آموجود ہوں گا۔

لہٰذا اس شرط کے مطابق چھوٹے خاں نے ناز و اغماض سے کام لینا شروع کیا، لیکن وہ عورت اس پر بری طرح سے مائل تھی اور اس قدر فریفتہ ہو رہی تھی کہ چھوٹے خاں کو اپنی شرط جیتنے کا یقین ہو چلا تھا۔

عین اسی وقت میں صرف ایک سفید چادر اوڑھے اور سر پر معمولی سی دوپلّی ٹوپی رکھے ان کے سامنے آ گیا، رات کا وقت تھا اور میں نے دیکھا کہ بڑے انہاک کے ساتھ چھوٹے خاں اس عورت کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہے، جب میں وہاں گیا تو اپنے کو چھوٹے خاں کی حیثیت سے ظاہر کیا اور جاتے ہی السلام علیکم کہا۔ چھوٹے خاں نے وعلیکم السلام کہا اور بالکل ایک بے تکلف دوست کی طرح پُر تپاک انداز میں مجھ سے ملا اور خاطر تواضع کرنے لگا اور سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا کہ 'جنابِ عالی اتنے دنوں کہاں رہے؟ آیئے یہاں ہمارے قریب بیٹھیے۔'

میں نے جواباً کہا۔ 'کئی روز سے میں آپ سے ملنے کا خواہش مند تھا، لیکن فرصت ہی نہ ملتی تھی، شکر ہے کہ آج ملاقات ہوگئی، دو تین روز اس شہر میں رہوں گا اس کے بعد شاہجہاں آباد چلا جاؤں گا، صرف آپ سے ملنے کو حاضر ہوا ہوں۔'

چھوٹے خاں نے کہا۔ 'بہت اچھا کیا جو آپ آ گئے۔'

اسی دوران میں میں نے دیکھا کہ وہ عورت جو کہ چھوٹے خاں پر اس قدر جان دے رہی تھی، اب میرے جانے کے بعد اپنے سامنے رکھے ہوئے چراغ کی بتی بڑھانے لگی اور کچھ کچھ مجھ سے چشمک زنی بھی کرتی جاتی تھی، ساتھ ہی پاندان کھول کر مصالحہ کے دو پان لگائے، ان میں سے ایک پان چھوٹے خاں کو دیا اور اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دوسرا پان میری طرف بڑھایا، میں نے اس کے اس خفیہ تلطف کو پوشیدہ نہ رکھا اور چھوٹے خاں کو دکھاتے ہوئے پان لے لیا۔ جب میں نے ایسی حرکت کی تو اس عورت کو ناگوار ہوا، اس کے بعد اس نے چھوٹے خاں کی پشت کی طرف سے میرے پاؤں میں اپنے ناخن چبھونے شروع کیے، میں نے شکایت آمیز انداز میں چھوٹے خان سے کہا۔ 'بھئی دیکھیے آپ کی عورت ہمیں رسوا کر کے رہے گی، آپ اس کو تاکید کیجیے۔'

یہ سن کر چھوٹے خاں کے پہلو سے اٹھ کر وہ میرے پہلو میں آ بیٹھی، چھوٹے خاں نے بناوٹ سے کام لے کر برہمی کا اظہار کیا اور کہا۔ 'اے بدتمیز تو میرے بلاوے پر میرے پاس آئی ہے، دوسرے آدمی سے تجھے کیا غرض۔'

اس عرصے میں وہاں پڑا ہوا ستار اٹھا کر بجانے لگا، اس عورت نے داد دینی شروع کر دی، نوبت بایں جا رسید کہ اس نے چھوٹے خاں سے جتنا روپیہ لیا تھا زمین پر دے مارا، اور کہنے لگی، مجھے رات بھر تمہارے ساتھ بسر کرنا منظور نہیں۔ اس حرکت پر چھوٹے خاں کو بڑا تاؤ آیا، غلام رضا خاں اور دیگر مصاحبین خاص اسی جگہ چھپے ہوئے بیٹھے تھے، ان کا بیان ہے کہ انہوں نے اس عورت اور چھوٹے خاں کی بک بک جھک جھک سنی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اسے اس کے گھر جانے کی اجازت دے دی جائے اور چھوٹے خاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، آخر وہ بڑی مشکل سے رات یہاں گذارنے پر راضی ہوئی۔ ادھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، مجھے پتہ دو، انشاءاللہ میں کل تمہارے مکان پر آؤں گی۔ میں نے جواب دیا، میں تو کل شاہجہاں آباد جا رہا ہوں، اتنا کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور اپنی خواب گاہ میں آ کر سو گیا۔

دوسرے دن سنا گیا کہ اس نے بڑی مشکل سے رات گذاری اور چھوٹے خاں سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں تم سے راضی نہیں ہوں۔

داروغہ امراؤ بیگم

داروغہ نجم النسا بیگم صاحبہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اندر کے معاملات کی اجرائی کے لیے ذمہ داری کومحسوس کرنے والی کسی معتمد عورت کی ضرورت تھی، چنانچہ اس بنا پر داروغہ میر محمد مہدی نے سفارش کر کے امراؤ بیگم کو خلعت داروغگی عنایت کروایا میں نے میر محمد مہدی کی خاطر اسے نوکر رکھا، لیکن کبھی بھی وہ میری طبیعت کے موافق نہ ہوئی۔

داروغہ امراؤ بیگم نصیر الدین حیدر کی محل، نواب قدسیہ محل اور محل موصوفہ کے بھائی حسین بیگ اور وفا بیگ کی ہمشیرہ تھیں، انہوں نے اپنے دامِ محبت میں گرفتار کرنے کی لاکھ کوشش کی، لیکن میں نے ان کو کامیاب ہونے کا موقع ہی نہ دیا، روزانہ وہ پہروں پروانے کی طرح میرے ارد گرد رہتی تھیں، اور کسی نہ کسی فریب سے مجھے اپنا پرستار بنانا چاہتی تھیں، لیکن میں ہر دفعہ اپنا دامن صاف بچا لیتا تھا، ایک وقت تو ایسا بھی ہوا کہ ان کے اور میرے درمیان متعہ کا بھی تذکرہ چھڑا، لیکن متعہ بھی نہ ہوسکا۔

ہنوز امراؤ بیگم کو اپنی خدمت پر مامور ہیں، ان کے زیادہ تر کام جاں نثار سرکار حضور ولی عہد بہادر حاجی محمد شریف علی خاں انجام دیتے ہیں، وہ ایک موٹی تازی سرخ وسپید رنگ والی اور چوڑی صورت اور لمبے ہاتھ پاؤں کی پینتیس سال عمر کے سن کی عورت ہیں، اس لیے میں نے کبھی ان کی طرف التفات کی نظر بھی نہ کی۔

میر محمد مہدی اور خطاب

رفتہ رفتہ میر محمد مہدی کو خلعت سرفراز کیا گیا اور ساتھ ہی انہیں امیر الامراء میر محمد مہدی صاحب کا خطاب بھی عنایت ہوا، انہوں ں ے منشی جعفر علی کو اپنی نیابت کا اعزاز دلوایا اور کول خانے کی داروغگی کے لیے چھوٹے خاں کو خلعت دیا گیا۔ شیخ محمد بخش ان کی پیش دستی کے لیے مامور ہوا، خلعت عمارت غلام رضا خاں کو مرحمت کیا گیا اور ان کی پیش دستی کے لیے کاشی رام کو رکھا گیا۔

محمد معتمد علی خاں کو قرا نہ والی عہدی کی داروغگی کا خلعت ملا اور حسین علی بیگ کو محمد معتمد علی خاں کے توسط سے 'شہنشاہ باغ'، 'قصر الخاقان'، 'جہاں نما' کی داروغگی مرحمت ہوئی۔ مسعود علی بیگ کو علی نقی خان کے وسیلے سے حضور باغ اور مبارک باغ کی داروغگی عطا ہوئی، چھوٹے خان کو بھی خاص مکان کا داروغہ بنایا گیا۔ ثابت علی خاں کو مکانات موسومہ 'راس منزل'، 'مکان عاشقان پسند'، 'مکان معشوق پسند'، 'مکان محبوبان پسند'، 'قصر السلطان' وغیرہ کی داروغگی کا خلعت دیا گیا۔ علاوہ بریں ثابت علی خاں، غلام رضا خاں اور محمد معتمد علی خاں کو سکندر باغ کی تیاری پر مامور کیا گیا۔ حقیقت میں باغ مذکور رشک جنت ہے۔ اس کے تیار ہونے کے بعد اس میں نواب سکندر بیگم صاحبہ فروکش تھیں، جو کہ ان کی زندگی تک انہیں کے قبضے میں تھا، ان کا چونکہ کوئی وارث نہیں تھا، اس لیے ان کے مرنے کے بعد سرکاری قبضے میں آ گیا۔ غلام رضا خاں، محمد معتمد علی خاں، ثابت علی خاں اور کاشی رام کو سکندر باغ کی تیاری کا جب خلعت دیا گیا تھا اسی وقت مکان کے ایک ایک حصے کی تیاری پر ان میں سے ایک ایک شخص متعین ہوا، جس کی وجہ سے ایک سال کے عرصے میں پورا مکان تعمیر ہو گیا، ورنہ سات آٹھ سال کی مدت میں بھی اس کا پایۂ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہ تھا، اس کی تیاری پر پانچ لاکھ روپے کی لاگت آئی تھی۔ لیکن یہ ایک عدیم النظیر وتحفۂ روزگار عمارت تعمیر ہوگئی۔ اس مکان کے بیچوں بیچ ایک عالی شان مسجد بھی بنائی گئی ہے جس کے مینار باہر سے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سبحان اللہ مکان کا صدر دروازہ ایسا عالی شان ہے کہ شاید کبھی چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ مکان سے دریا کے دہانے تک ایک نئی سڑک ہے، کوئی آدمی اگر مکان کے بالا خانے سے سیر کرنا چاہے تو دریا کا نظارہ دور سے بخوبی ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پھل دار درخت لگائے گئے ہیں۔ سڑک کی چوڑائی اتنی ہے کہ اگر تین بگھیاں ایک دوسرے کے برابر ہو کر گذریں تو کوئی دقت نہ ہوگی، بلکہ سڑک کے اِدھر اُدھر پھر بھی ایک ایک گز کی جگہ باقی رہتی ہے۔

رہس دھاری

ایک روز باغبان قدرت نے زمین پر گل لالہ کا فرش بچھایا تھا اور خلق اللہ کے دل فرحت خیزی سے رشک لالہ زار بنے ہوئے تھے، وہ دن ایسا تھا کہ اس کا جواب شبِ عروسی بھی پیش نہیں کر سکتی تھی۔ نکہت گل سے سارا حضور باغ مہکا ہوا تھا، میں ناچ گانے کے ساز و سامان کے ساتھ فلک سیر میں

رونق افروز تھا۔ اس وقت میں نے پریوں کو رہس دھاری کا حکم دیا، رہس دھاری ناچ کا ایک سوانگ ہے جس کی ہندو مذہب میں عبادت کی جاتی ہے۔ ہندو لوگ اس عبادت کے سامان پر بے شمار روپیہ صرف کرتے ہیں، اس میں کنھیا اوران کی گوپیوں کا روپ دھارا جاتا ہے، یہ مبالغہ نہیں کہ جیسا کہ رہس میں نے تیار کروایا ہے ویسا کہیں اور نہ ہوگا۔ تمام پریوں کو ہوشیار استادوں نے بڑی محنت سے تعلیم دے کر تیار کیا ہے۔ دراصل اس کو فنی حیثیت دینے والے سات آدمی ہیں، جو میری سرکار میں ملازم ہیں۔ انہوں نے کنھیا اوران کی گوپیوں کے روپ تیار کیے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

سلطان پری: رادھا کے روپ میں جو کنھیا کی خاص گوپی ہے۔

ماہ رخ پری: کنھیا کے روپ میں۔

یاسمن پری، عزت پری، دلربا پری، حور پری، کنھیا کی دوسری گوپیوں کے بھیس میں۔

اس کھیل کی تیاری پر کئی لاکھ روپے خرچ ہوئے، تمام لوازمات موجود ہونے کے باوجود صرف درستی کے سلسلے میں پانچ سو روپے کھل گئے، پرستش کے لوازمات اور لباس وغیرہ کی آرائش کے لیے جو اشیا خرید کی گئیں ان کی تفصیل بیان کرنا تضیع اوقات کا باعث ہوگا۔

کنھیا کی جو معشوق بنی تھیں انہیں زبان سنسکرت میں گوپیاں کہا جاتا ہے، ان کے ناچ سنگیت کچھی اور برم سے مماثلت رکھتے ہیں اور یہ نام ہندی تالوں کے ہیں۔ اس ناچ میں کنھیا اور رادھا کے مکالمے کا تاثر ہوتا ہے جو مفارقت اور وصل کے ہنگام رونما ہوتا ہے، یہ مکالمہ ہندی دوہروں میں لکھا جاتا ہے، جیسے:

دوہرہ: مور مکٹ کا چھنی کر مورلی اور مال
یہ مانک موہ من بسے سدا بہاری لال

دوسرا دوہرہ رادھا: آپیارے موہنا پلک ڈھانپ تو ہے لیوں
نا میں دیکھوں اور کا نہ تو ہے دیکھن دیوں

جلسہ مذکور صرف شام کے وقت ہوتا ہے، جب اس کا اہتمام وانتظام مکمل ہو چکا تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر حشمت بہادر کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی انہوں نے نہایت شوق اور خوشی سے میری دعوت قبول کرلی، اور 'فلک سیر' آکر جلسے میں شریک ہوئے۔

اس موقع پر تمام پریوں نے اپنے کپڑوں میں عطرِ حنا لگایا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسّی اور عجیب ناز و انداز کے ساتھ میرے تخت کے اطراف کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں، ناچ گانے کی یہ محفل اس قدر عمدہ تھی کہ ہر شخص کی زبان پر سوائے واہ واہ کے کچھ اور نہ تھا۔ میرے بھائی پھول کی طرح کھلے ہوئے میرے پہلو میں بیٹھے تھے، شیشے کے کنول اور مختلف رنگوں کی مردنگیں جگہ جگہ لگائی گئی تھیں، تخت کے اطراف پھول کی چادریں تھیں۔ محلات پردہ نشین کے لیے چلمنیں چھوڑ رکھی تھیں اور وہ چلمنوں کے ادھر سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

یہ حیات آفریں صحبت آدھی رات کے بعد موقوف ہوئی اور جملہ حاضرین اپنے اپنے مقام کو چل دیئے اور میں بھی سو گیا۔

ایک میلہ

پریوں کی بے حد خواہش تھی کہ مینا بازار اور میلے کا اہتمام ہو، چنانچہ میں نے ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے مینا بازار اور میلے کا حکم نافذ کیا، حکم کے نفاذ کے فوراً بعد ہی صناعوں اور پیشہ وروں نے اپنا سامان حاضر کیا، نہایت قرینے اور سلیقے سے دوکانیں سجائیں، جس کسی نے بھی یہ مٹھائی کھائی دنیا بھر کی لذت سے اس کا دل پھر گیا۔ ایک جانب سبزی بیچنے والوں نے ہر قسم و ہر رنگ کی سبزی ٹوکریوں میں ترتیب کے ساتھ رکھی تھی۔ ولایتی میوہ فروش سیب، بہی، ناشپاتی، پستہ، بادام نہایت عمدہ طریقے پر جمائے ہوئے تھے۔ سیب اور بہی کے دیکھنے سے معشوقوں کے سیب ذقن بے ساختہ یاد آجاتے تھے۔ انار اور ناشپاتی گلعذار معشوقوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے، پستہ اور بادام کسی کے لب و چشم کے مماثل تھے۔ ایک جانب بھنگ فروش نازنینیں عجیب ناز نخرے سے عاشقوں کا نشہ دوبالا کر رہی تھیں، چرس اور تمباکو ان کے پینے والوں کے دلوں کا دھواں نکال کر فضا میں اڑا رہے تھے، کباب کی دوکانیں دل جلے لوگوں کے لیے تسکین کا باعث تھیں۔ زخمی دلوں پر نمک پاشی ہو رہی تھی۔ ہر کباب مرغ و ماہی کے دلوں کو جلا رہا تھا، اس پر ادرک اور لیموں کی ترشی الگ اپنا کام کر رہی تھی۔

پنواڑی اپنے پانوں سے ماہ پاروں کے منہ ارغوانی کر رہے تھے، کسی طرف نانبائی نے خوشگوار طریقے پر شیرمال اور کباب چن رکھے تھے، جن کی بوئے جان پرور سے دماغ معطر ہو رہا تھا، ان

کے بعد گل فروشوں کی دو کانوں کی قطار شروع ہوتی تھی۔ ہر دوکان طرح طرح کے پھولوں کا مخزن تھی، ان گل فروشوں کی مستانہ صدائیں نغمہ ہائے بلبل کی طرح نازنینان جہاں کے گوش گذار ہو رہی تھیں۔

ابرک اور مٹی کے قسم قسم کے کھلونے ارژنگ چین کی کاری گری پر طعنہ زنی کر رہے تھے۔

کھیل تماشے دکھانے والے مختلف قسم کے کرتب نہایت پھرتی سے دکھا رہے تھے۔ ایک مقام پر نیولے اور سانپ کی لڑائی کا منظر تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے خوف تھے، جیسے عشق پیچاں درخت سے لپٹا ہے۔ غالب مغلوب کا سر زمین پر رگڑتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مغلوب غالب سے عاجز ہو رہا ہے، دیکھنے والے اس بھیانک تماشے سے گھبرا اٹھتے تھے، لیکن ایک مجمع کثیر ان کے دیکھنے میں مشغول تھا۔ ان دونوں جانوروں کی حفاظت خدا کرنے والا ہے۔

ایک جگہ پر ایک صندوق اور اس کے قالب میں تہہ در تہہ کئی صندوق تھے، جس میں بظاہر تھوڑے سے پر رکھے تھے لیکن تماشہ دکھانے والا حاضرین کو انہیں پروں سے کبوتر بنا کر دکھاتا تھا، اس شعبدے کی وجہ سے بازار میں بڑی بھیڑ تھی۔

ایک طرف نٹوں کا کرتب جاننے والے تھے، یہ لوگ ایران میں رسن باز اور نیرنج ساز کے نام سے شہرت رکھتے ہیں اور وہاں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں نچلی ذات کے ہونے کی وجہ سے ان بازی گروں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کھیل کو پیش کرنے والے متعدد آدمی ہوتے ہیں، ایک آدمی ڈھول پیٹتا جاتا ہے اور دوسرے آدمی مختلف طریقوں سے تماشائیوں کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں، عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے ڈھول کی آواز میں جادو ہوتا ہے، جس کی وجہ سے متحیر کن حرکتیں دکھائی دیتی ہیں۔

ایک شخص زمین میں نیزہ گاڑ دیتا ہے اور اس پر رسی باندھ کر رسی پر چڑھتا ہے پھر اپنے سر پر کوئی بھاری بوجھ لے کر دوڑتا ہے، اسی طرح وہ شخص ننگی تلوار پر کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے بعد تلوار پر چل کر اور قلابازیاں کھا کر اسی رسی پر لوٹ آتا ہے، اس کھیل میں اپنے جسم کو یہ لوگ تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور پھر ان ٹکڑوں کو ملا کر جوڑتے ہیں تو پہلے کی طرح زندہ آدمی ہو جاتا ہے۔
غرض اس قسم کے جادو کے کھیل دکھانے والے سحر سامری کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کا قول ہے، ہم بوڑھے کو جوان، انسان کو حیوان اور مردے کو زندہ کر سکتے ہیں اور خشک بیج بوتے ہیں، اسی

لمحے درخت اُگ آتا ہے اور اس میں پھل پھول بھی نکل آتے ہیں۔ اس گروہ کے کچھ آدمی باتوں میں لگے ہوئے تھے اور ان کی عورتیں اپنے حسن و جمال کی نمائش کر رہی تھیں۔

ایک جگہ پر داستان گو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے مشتاقانِ دستان جمع تھے۔ یہ لوگ عشق و محبت کی داستانیں، طلسماتی حکایات اور جھوٹ موٹ واقعات سے سننے والوں کو حیرت کے دریا میں غوطے دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک قصہ بھی ایسا نہیں جو قرین قیاس ہو، لیکن ان باتوں سے بوالہوسوں کے متبذل جذبات کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔

ایک مقام پر جواری اپنے کاروبار پھیلائے بیٹھے تھے، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی جیب پر ڈاکہ ڈالا جائے، جو بھی لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے، حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے، البتہ اس فن کے جو ماہر ہیں، وہ اپنے ساتھیوں سے کانا پھوسی کر رہے تھے۔

کچھ آدمی چوسر اور شطرنج بچھائے بیٹھے تھے، ایک شخص نو، تیرہ، فرش سے لے رہا تھا، بعض آدمی اپنے کو وزیر یا افسر بتا کر کھیل کو لڑائی اور لڑائی کو کھیل بنا رہے تھے۔ یہ بھی عجیب طرح کا لین دین تھا، ایک غریب آدمی پلک جھپکتے میں تونگر اور دولت مند آدمی دیکھتے دیکھتے کنگال ہو جاتا تھا، اس ناہنجار کھیل کی وجہ سے غریب آدمی امیر آدمیوں پر بڑا ظلم کرتے تھے اور فعل بد کے خیال کو ذہن سے نکال کر حرص کے شکار ہوتے تھے اور فتنہ و دغا و فریب کی وجہ سے قعر مذلت میں گرے ہوئے تھے۔ لیکن رشوت خور محتسب اپنے حصولِ زر کی خاطر ان سے چشم پوشی کرتے تھے اور ہر بدکار آدمی سے ملے ہوئے تھے۔

اگرچہ امور خلافِ شریعت کو بادشاہ دین پناہ کی شرع پروری روکنے کے لیے کافی تھی، لیکن خودسر و آبرو دشمن رعایائے زشت اعمال اور تیرہ باطن عوام محتسب و قاضی شہر کی سختی کے باوجود حرکت ناشائستہ و افعال ناجائز کے مرتکب ہوتے تھے، یہ لوگ گناہ اور حیوانی خصلتوں کے بانی تھے اور اپنی زندگی کو شیطان پرستی، بھنگ نوشی اور شراب خواری کی نذر کیے ہوئے تھے۔ یہ مدہوش و مے پرست، سرشار و بدمست اپنے لہو و لعب سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوتے۔ ایک جام کے لیے جان دینے کو تیار تھے۔

یہی حال مدک نوشوں اور افیونیوں کا تھا، جب یہ لوگ اپنے ساتھیوں میں آ کر شامل ہوتے تو جزا و سزا کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہ رکھتے اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے، ایک شخص چلم پی کر

اونگھ رہا تھا، دوسرا خود رفتگی کے عالم میں بالکل برہنہ ہو کر مجذوبوں کے سے حرکات ظاہر کرتا تھا، یا کبھی کبھی قلقل جام کی طرح کھل کھلا کر ہنستا، یا مینا کی طرح رو دیتا۔ غرض کہ ہر آدمی خشک و تر نشہ آور چیزوں سے اپنی خواہش کے مطابق شغل کر رہا تھا، ان میں کوئی چیز پکی ہوئی تھی، کوئی ٹپکی ہوئی، کوئی پسی ہوئی اور کوئی کشید کی ہوئی، بدمستوں کے آگے پارسائی کوئی چیز ہی نہیں اور زہد و تقویٰ ایک خشک و بدذائقہ دوا کے مانند ہے جو حد درجہ کڑوی ہے۔

اس میلے میں ایک شیر لایا گیا تھا جو بکری کے تھنوں کو منہ لگا کر دودھ پیتا تھا، میلے میں شریک ہونے والے تمام آدمی اس ناممکن عمل کے امکان پر حیران تھے۔

اس میلے کے لیے میں نے اپنی حور تمثال و پری پیکر کہاریوں کو زربفت کے جوڑے اور میلے کے خرچ کے لیے بہت سا روپیہ عنایت فرمایا تھا، میلے کے ہنگامۂ ہوش ربا میں وہ مشتری خصال و زہرہ جبین ناز و انداز دکھاتی ہوئی اور نخرے کرتی ہوئی برق کی مانند میلے میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ حاضرینِ میلہ ان عشوہ سازوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران تھے اور ان کی زباں پر الامان الامان کا ورد جاری تھا۔ مابدولت و اقبال مرکب حشمت اجلال ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے اور دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹاتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے، اور میلے کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر اپنا سایۂ عاطفت ڈالتے ہوئے میلے کی دلچسپیوں کو دیکھ رہے تھے۔ فقیروں اور محتاجوں کو بے نیاز کر دیا گیا اور سرکاری آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ میلے کا جملہ سامان اور وہ تمام برتن جن میں یہ سامان رکھا ہوا ہے دس گنا دام دے کر خرید لیا جائے تاکہ تمام دوکاندار مالدار ہو جائیں اور یہ بخشش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے اور خریدا ہوا مینا بازار کا یہ سامان اعلیٰ حضرت قدرِ منزلت سلطان ابن السلطان خاقان ابن الخاقان حضرت محمد امجد علی شاہ نوراللہ مرقدہٗ کی خدمت بابرکت میں ہدیتہً بھیج دیا گیا۔ انہوں نے ازراہِ شفقت پدری ان چیزوں کو قبول فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ تم نے تمام مینا بزار خرید لیا، لیکن ہمیں اطلاع نہ کی، خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا، لیکن آئندہ اطلاع دینا لازمی ہے۔

جشن ماہتابی

قدیم روایت کے مطابق ہر بادشاہ نے اپنے منظورِ نظر لوگوں کے لیے ہر فن کی تعلیم کا انتظام کیا اور کمال کے درجے تک پہنچانے کا پورا بندوبست کیا اور ایسے ہی بادشاہوں میں بادشاہ دہلی محمد شاہ اور

سلطان بیجاپور اور ابراہیم عادل شاہ اور دیگر سلاطین سلف حسین و جمیل عورتوں کو فنِ موسیقی کی تعلیم دلوا کر انہیں 'گاین' کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ مابدولت نے بھی اس رسم پر کاربند ہو کر کئی ایک زہرہ جبینوں اور پری پیکروں کے لیے فنِ موسیقی کا انتظام کیا۔ جن کی نظر ایک اشارہ جان عاشق کے لیے تیر کی مثال ہے، جن کی چوٹیوں کی موباف مار سیاہ ہے، ابروز ہر یلے بچھو ہیں جو ڈنک مارنے کو تیار ہیں۔ جب یہ گانے لگتی ہیں تو لحن داوٴدی کا معجزہ پیش نظر ہو جاتا ہے اور روح تن سے نکلنے کو بے تاب ہو جاتی ہے۔ اگر ناچ کے لباس سے آراستہ ہو جائیں تو آتش پرست سجدے میں گر پڑیں۔ ان کے بھڑکیلے لباس اور خوبصورت زیور دیکھ کر لوگ حیران ہوتے ہیں۔ جب یہ ناچتی ہیں تو ناہید دائرہ اٹھا کر پھینک دیتی ہے اور یہ افسوں طرازی کا کمال سیکھنے کے لیے خوشامد پر اُتر آتی ہے، جب یہ اپنا دامن اٹھاتی ہیں تو مور تابعداری کو آتا ہے۔

ترکانہ اداؤں سے جان لینے والی اور سخن عیسوی سے روح کو تازہ کرنے والی، بارہ گھنٹوں میں بارہ مقامات پر نئی دھنوں، نئی آوازوں اور نئے انداز سے کام لیتی ہیں، جس سے لیل و نہار کی نیرنگیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ رقص کے دوران جب ہاتھ اوپر کو اٹھاتی ہیں تو مچھلی کی طرح ہوا میں تھرکتی ہیں۔

میں نے جب اس فن کی تکمیل کا حکم دیا تو تھوڑے ہی دنوں میں ان پری پیکروں نے ایسی مہارت حاصل کر لی، کہ اگر اس فن کے استاد جیسے تان سین اور بیجو بھی ہوتے تو ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر تصور کرتے۔

قمری مہینے کی چودھویں تاریخ تھی، چاند اپنی آب و تاب میں درجۂ کمال تک پہنچا ہوا تھا، اس فن کے جاننے والوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور کہا تمہیں ہر قسم کے کھانوں اور لذیذ چیزوں میں سے جس چیز کی بھی ضرورت ہو تیار کروالو۔ میرے حکم کی بنا پر تمام مشاق فنکار حاضرِ درِ دولت ہو گئے، جب تمام آدمی جمع ہو گئے اور محفل آراستہ ہوئی تو ان سیم بروں میں سے ہر ایک نے باری باری اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اپنے ناچ گانے سے کائنات کو سرشار کر دیا۔ اس وقت کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ ماہ وشوں کی کسی بات پر حرف زنی کرے یا کوئی مین میخ نکالے۔ ان سب میں خاص کر سلطان پری نے اپنے کمالات کا ایسا مظاہرہ کیا کہ مجھے ان سے عشق ہو گیا۔ سارے کاملینِ فن نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ موسیقی نہیں سحر سامری ہے۔

کریم بخش امیر بخش والی

ایک روز کا ذکر ہے، جب کہ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں رقص و سرود سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اس وقت مسماۃ مینڈو محل والی (جو نصیرالدین حیدر مرحوم کے محل کی گانے وایوں میں تھی اور ان کے انتقال کے بعد کسبی کا پیشہ کرتی تھی) اس محفل میں آ کر شریک ہوئی، یہ کوئی پینتیس برس کی عورت ہے۔

پہلے اس نے اُمّن سے تعلقات پیدا کیے، اس کے بعد غلام رضا خاں اور چھوٹے خاں کو ساتھ لے کر عین برسات کے موسم اور اندھیری رات میں بڑی تکلیفیں برداشت کر کے مجھ تک پہنچی، میں نے اس کو شرفِ باریابی بخشا اور وہ چھ ماہ تک بڑی شان و شوکت سے آتی رہی۔ لیکن زیادہ عمر والی ہونے کی وجہ سے میں نے اس کے ساتھ تعلقات منقطع کر دیئے۔ میں نے کچھ سامان اور دو ہزار روپے کے کپڑے اس کے ساتھ کر دیئے۔

اگر چہ جی نہ چاہتا تھا کہ اس کو الگ کروں، لیکن اس ہندی مثل کے مطابق جدائی اختیار کرنی پڑی۔

'دونوں ہاتھ سے تالی بجتی ہے'۔

اس کے چند دن بعد عمدہ خانم والی پیاری سے ربطِ محبت بڑھایا، یہ عورت ترچھا دیکھتی تھی اور پیاری عمدہ خانم والی کے نام ہی سے مخاطب کی جاتی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے کئی ہزار روپے برباد کیے لیکن ترچھی ہونے کی وجہ سے بعد کو علیحدہ کر دیا۔

اس کے بعد بانو فرخندہ والی سے محبت کی، یہ عورت بھی کسی زمانے میں نصیرالدین حیدر مرحوم کے ہاں گانے والیوں میں نوکر تھی، وہ خود بھی مجھ پر بری طرح شیدا تھی۔ کامل ایک سال تک وہ میرا گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ نہیں گئی، لیکن سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑنا پڑا۔ مجھ سے چھوٹنے کا اس کو بڑا ملال تھا اور میری مفارقت میں روتی رہتی تھی، آخر اس نے مجبور ہو کر محمد رضا خاں سے متعہ کر لیا، لیکن اس وقت تک بھی میرے ایک محل کے ہاں مصاحب کی حیثیت سے ملازم ہے اور جب کبھی موقع ملتا ہے میرے گھر پڑنے کا پیغام بھیجتی ہے، لیکن میں انجان ہو جاتا ہوں۔

اسی کی طرح چھوٹی گوہر نامی ایک عورت مجھ پر عاشق ہوئی اور ایک سال تک وہ آرزوئے وصال لیے رہی، اکثر غلام رضا خاں کے ذریعے دونوں کے مابین سلسلۂ پیغام جاری رہا۔ لیکن معلوم نہیں کس سبب سے وہ گھر نہیں پڑی، جس کی وجہ سے اس کی ملاقات کو بھی ترک کرنا پڑا۔

اس سے پہلے حسین آباد کی ایک مسماۃ ولایتی بھی مجھ پر عاشق ہوئی اور اب بھی وہ مجھ پر فریفتہ ہے، لیکن موسیقی کے فن سے ناواقف ہونے کی وجہ سے میں نے اس کی خواہش کی تکمیل نہ کی۔

امراؤ چھوٹی خانم والی بھی میرے حضور میں آئی تھی، لیکن چونکہ اس وقت میں بسترِ علالت پر تھا اس لیے اس سے محبت نہ کی جا سکی۔

کنہیا کاماوالی بھی عرصے تک مجھ پر مرتی رہی، لیکن میں نے اسے بھی قبول نہ کیا، مجبوراً وہ مسمّی احمد علی داروغہ عمارتِ حسین آباد کے گھر پڑ گئی، اور اب تک اسی کے پاس ہے۔

ایک کسبی مسماۃ بخشی جو نہایت بھدی اور سیاہ فام تھی، دو ایک مرتبہ میرے حضور میں آئی، یہ عورت گاتی بہت عمدہ تھی، لیکن بوڑھی اور بدہیئت ہونے کی وجہ سے وہ میرے گھر نہ پڑ سکی۔

چپلہ بی بادانی صرف ایک رات میرے حضور میں پیش ہوئی، اس کے بعد بندی حبشن والی جو حیدر حسین خاں پیش دست داروغہ دیوان خانۂ سلطانی کی عاشق تھی، ایک دن بھولے سے میرے سامنے آ گئی، لیکن میں نے اس کو بھی رخصت کر دیا، یقین ہے کہ اب بھی وہ حیدر حسین خاں سے رسم وراہ رکھتی ہوگی۔

اچھی گلزاری مل والی مدت تک میری محبت کا دم بھرتی رہی، لیکن میں نے نامنظور کر دیا، آخر مایوس ہو کر کسی اور کے گھر بیٹھ گئی ہے۔

اس کے بعد علی جان نامی عورت نے مجھ سے محبت کی ابتدا کی۔ وہ بھری مجلس میں ناچ گانے کے وقت مجھے اشارے کیا کرتی تھی، کبھی سب کے سامنے میرا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور کبھی میری موزوں کی ہوئی غزلیں اور ٹھمریاں تعویذ بنا کر گلے میں پہنتی تھی، کبھی گریہ وزاری کرتی اور کبھی میرے گھر پڑنے کے پیغام بھجواتی تھی اور عرض کرتی تھی کہ مجھے بھی پریوں کے زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کا کچھ کچھ لحاظ تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی اسباب ایسے پیدا ہو جائیں کہ اسے گھر بٹھا لیا جائے۔

انہیں دنوں میں نے کرم بخش امیر بخش والی کے عاشق ہوئے اور اس کی ماں کے ناخوش ہو کر

محکمہ شرعیہ میں مقدمہ دائر کرنے کا حال سنا تھا، اسی زمانے میں داروغہ میر محمد مہدی کے پیش دست کی حیثیت سے میر علی حسین میرا ملازم تھا، اور داروغہ مذکور کے جملہ کاروبار اسی شخص کے ہاتھوں تکمیل پاتے تھے، آغا حسن اسی میر علی حسین کا عینی بھائی ہے۔

محمد معتمد علی خاں کو گانے بجانے والی عورتیں فراہم کر کے میرے حضور میں پیش کرنے کی بہت فکر رہتی تھی، لہٰذا ان کی تمنا تھی کہ کریم بخش امیر بخش والی کا مقدمہ رفع دفع ہو جائے اور آغا حسن کے عشق کے سلسلے کو کسی طرح قطع کروا کر اس کو میرے گھر میں بٹھا لیا جائے۔ ثابت علی خاں بھی دوسرے معاملے میں کچھ ایسا ہی منصوبہ باندھ رہے تھے۔ یعنی وہ علی جان منگی والی کو میرے حضور میں حاضر کرنے کی دھن میں تھے۔ میں نے دونوں کو حکم دے رکھا تھا کہ تم دونوں آدمی ان عورتوں کے مقدمے کو کچھ اِدھر اُدھر کر کے میرے حضور میں پیش کرو۔

علی جان چونکہ ایک سپاہی سے محبت کرتی تھی، اس لیے میرے ہاں آنے پر راضی نہ ہوئی، لیکن مجھے تعجب تھا کہ وہی عورت میرے سامنے مجھ سے اظہارِ عشق کرتی تھی، اپنے گھر بٹھانے کے لیے مجھے قسمیں دیا کرتی تھی، یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے لیکن پھر میں نے اپنے دل میں کہا، جب وہ میرے سامنے آئے گی تو سارا بھید کھل جائے گا۔

چونکہ وہ مرافعہ کے سلسلے میں قید تھی اس لیے اس کے آنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ انشاء اللہ اس کا منفصل حال اپنے تخت موروثی پر جلوس فرمانے کے بعد قارئین کی خدمت میں بیان کروں گا۔

میں نے کرم بخش امیر بخش والی کو شیخ حسین علی، نجف علی شاعر، اور چھوٹے خان کی معرفت خفیہ طور پر زندان مرافعہ میں مکتوب محبت بھیج کر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اِدھر آغا حسن کو بلایا اور اسے بہت کچھ سمجھایا، لیکن اس فریبی نے میرے سامنے تو میری بات مان لی، لیکن یہاں سے جانے کے بعد ایک عرض داشت حضرت جنت مکان کے حضور میں پیش کی۔ جس میں مجھ پر جبر و تشدد کا الزام لگایا تھا، اس عرض داشت کی بنا پر ارباب مرافعہ کو اس مضمون کا ایک تاکیدی حکم بھیجا گیا۔

'شاید مرزا ولی عہد بہادر کے متوسلین میں سے کوئی آ کر مقدمے میں سفارش کی کوشش کریں، ایسی صورت میں کسی کی نہ سنی جائے اور کریم بخش کو امیر بخش کے حوالے کر دیا جائے۔'

چنانچہ اسی کے مطابق عمل کیا گیا، کریم بخش کو اس کی ماں امیر بخش کے پاس بھیج دیا گیا۔

میں کامل ایک ماہ تک اسی کی دلجوئی کرتا رہا اور سمجھایا کہ تیری ماں امیر بخش اب تیرے قابل

نہیں ہے اور وہ تیری جان کی دشمن ہو رہی ہے، بڑی کوششوں کے بعد وہ میرے گھر پڑنے پر راضی ہوئی اور آغا حسن کا دعویٰ باطل ہو گیا، لیکن وہ بے عقل امیر بخش کسی صورت بھی راضی نہ ہوئی اور میرے دل کو زبردست دھکا پہنچایا۔

جب کرم بخش مرافعہ سے چھوٹ کر اپنی ماں امیر بخش کے گھر آ گئی تو آغا حسن سے نہ ملی، معلوم ہوا کہ آغا حسن نے ندامت کے مارے چار پانچ تولے افیم کھالی، لیکن وہ شاید سخت جان تھا جو اب تک زندہ ہے۔

میں نے علی جان اور کرم بخش کے معاملے میں بعض ارا کین سلطنت کے ہاں بھی ثابت علی خان اور محمد معتمد علی خان کے ذریعے بڑی با اثر سفارشیں پہنچا ئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، ارباب مرافعہ میں سے ایک شخص آغا محمد کو پانچ سو روپے بھیجے، اس نے روپیہ قبول کر لیا، لیکن میری منشا کے مطابق کام نہ کیا، کیا بتاؤں مجھے ارباب مرافعہ نے کس قدر تنگ کیا ہے، میں نے محبت و اخلاص کے اپنے ہاتھ سے لکھ کر چند خطوط بھی لوگوں کو بھیجے، ایک خط بھی مفید ثابت نہ ہوا، جس کا میرے دل پر زبردست داغ ہے، کئی ہزار روپے مرافعہ اور محکمۂ شرعیہ میں خرچ کیے، لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ میں والد ماجد کے ڈر سے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کوئی ایسے اسباب مہیا کرے کہ یہ مفارقت کا پردہ درمیان سے ہٹ جائے۔

بندی عمدہ والی

رمضان المبارک کا مہینہ تھا، میں سحری کھا کر ابھی سویا ہی تھا کہ محمد معتمد علی خاں نے بے وقت آ کر میری کمر کو دبایا۔ میں نے بیدار ہو کر کہا 'ایسے وقت تو نے مجھے کس لیے زحمت دی۔' اس نے عرض کیا، بندی عمدہ والی نامی ایک عورت حضور کے عشق میں دیوانی ہو کر آئی ہے اور اس وقت وہ جہاں نما میں بیٹھی ہوئی ہے۔

اس عورت پر چونکہ پہلے ہی سے میری نظر تھی لہٰذا اسی وقت جہاں نما گیا، وہ واقعی وہاں بیٹھی ہوئی ملی، مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ کو گلے سے لگالیا۔ میں نے اس کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مجرے کے حیلے سے یہاں تک آئی ہوں، اگر میری ماں کو یہاں آنے کی اطلاع ہو گئی تو وہ سخت برہم ہو گی، میں نے پوچھا۔ آئندہ ملاقات کس

طرح ممکن ہے۔اس نے جواب دیا 'ایام ماتم ختم ہونے دیجیے،اس کے بعد میں خود چلی آؤں گی۔'

اسی دن کے بعد سے میرے دل میں اس کی محبت کا تیر پیوست ہو گیا۔ خدا کرے فراق کی مدت ختم ہو جائے،اس دوران میں اس سے دو چار مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا،لیکن چند وجوہات ایسی تھیں کہ اسے گھر بٹھانے کا موقع نہ ملا۔

امیر بخش کسبیہ

میری مصاحبوں میں سے ایک مصاحب کے توسط سے آ کر امیر بخش نامی ایک کسبیہ میرے ہاں ملازم ہوئی اور ساتھ ہی مجھ پر عاشق ہوئی۔ یہ عورت حضور باغ کے ایک کمرے میں اتاری گئی۔ چھوٹے خاں کے ذریعے میں نے اس کے آرام و آسائش اور دیگر ضروری اسباب کا انتظام کروا دیا۔ میں اکثر اس کے کمرے میں جا کر بیٹھا کرتا تھا،اکثر رقص و سرود کی محفلیں بھی ہوتی تھیں، پریوں نے یہ دیکھ کر بڑا شور مچایا اور معشوقہ خاص کی طرف سے تو ایک اچھا خاصا فساد ہی برپا ہو گیا۔

اس کے علاوہ اس عورت کو ایک عارضہ بھی تھا۔اس لیے اس سے ملنا جلنا ترک کیا۔الحمد اللہ والمنہ۔

محفل کی آراستگی

ایک روز میں نے ایک ایسی جگہ محفل سجائی جہاں برگ و بار سے لدے ہوئے درخت خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے رقص کناں تھے اور مستی میں جھومتے ہوئے طاؤس ان کا جواب پیش کر رہے تھے۔حضور باغ اور شہنشاہ باغ میں ہر طرف فانوس ولایتی روشن تھے۔قصر خاقان کے چبوترے پر فرش کا انتظام کیا گیا تھا، پریاں بینچوں پر جلوہ افروز تھیں،خوش نوا مطب اور آتش نفس مغنّی مصروفِ نغمہ سرائی تھے۔میں نے اس موقعہ پر:

رشک پری کو ملکہ ماہ عالم معشوقہ خاص نواب شہزادی بیگم صاحبہ کا خطاب عنایت فرمایا۔

شہنشاہ پری کو مشفقہ جہانی حسن آرا نواب شہنشاہ بیگم صاحبہ۔

سردار پری کو شقیقتہ الزمانی مہ لقا سردار بیگم صاحبہ۔

سرفراز پری کو عاشقہ خاص انجمن افروز سرفراز بیگم صاحبہ۔
سکندر بیگم صاحبہ کو حبیبۃ السلطان مکرمۃ الزمانی سکندر بیگم صاحبہ،
دلدار پری کو محبوبہ خاص عاشق نما دلدار بیگم صاحبہ،
دلربا پری کو بزم اور افروز دلربا پری۔
امیر پری کو خورشید لقا امیر پری۔
حور پری کو جان جہاں حور بیگم۔
کے خطاب مرحمت فرمائے، باقی پریاں اپنے اپنے خطاب پر قائم رکھی گئیں۔

اسی دوران میں سب پریوں کو باہر کے مکانوں میں سے ایک ایک مکان رہائش کے لیے دیا گیا اور ہر ایک بیگم کی خدمت کے لیے چار چار مرد نوکر مقرر فرمائے گئے اور زرّیں چھتریاں ان کی زیبائش کے لیے دی گئیں۔

میں چونکہ معشوقہ خاص کا عاشق تھا اور ہمیشہ روپیہ پیسہ اسی کی تحویل میں رہتا تھا اس لیے وہ عمدہ عمدہ قسم کے لباس تیار کروا کر مجھے پہناتی تھی، اس لیے میں معشوقہ خاص کا ہمیشہ مشکور رہتا تھا۔ اس خدمت کے صلے میں ماہانہ کئی ہزار کی آمدنی کے قطعات زمین جو والد ماجد کے زمانے میں میرے نام معاف تھے، سب میں نے اسی کے نام منتقل کر دیئے، اس کے علاوہ زر و جواہر سے بھی اسے سرفراز فرمایا جس کی تفصیل بیان کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔

اسی زمانے میں مرزا حسن نامی ایک مولوی کو میں نے مقرر کیا اور مکان کا ایک حصہ 'مکتب خانہ' کے لیے مخصوص کیا، اس کے بعد ہر ایک بیگم نے اپنی بساط کے مطابق شرعی علوم کی تکمیل کی اور میرے آبائی تخت پر جلوس فرمانے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی زمانے میں سرفراز و پارے والی ماہانہ پانچ سو روپے پر میرے ہاں ملازم ہوئی، یہ وہی سرفراز پارے والی ہے جس کا تذکرہ نواب نشاط محل ننھی بیگم صاحبہ کے بیان میں کر چکا ہوں۔ یہ عورت حضرت جنت مکان کے رحلت فرمانے اور میرے تخت نشین ہونے تک ملازم رہی۔

تیسرا باب

حضرت جنت مکان کا انتقال

جس وقت میرے والد حضرت جنت مکان راہیٔ ملکِ بقا ہوئے اس جانکاہ غم سے دنیا اندھیر ہوگئی۔ دستِ الم سے تمام ملازمین نے دامن صبر وشکیب پھاڑ ڈالے۔ گلزار لکھنؤ جو درحقیقت باغ ارم کو بھی شرماتا ہے گلزار خزاں رسیدہ معلوم ہونے لگا۔ طیور راحت آشیانۂ دل سے رخصت ہوگیا۔ آہوان آرام انسانوں کے حرمِ جان سے رَم کر گئے۔ صدف چشم اشکوں کے موتیوں سے پُر ہوگئے۔ ہر سینے پر دستِ ماتم کی ضربیں پڑنے لگیں۔ دودِ آہ سے زیرِ آسمان ایک اور نیا آسمان استادہ ہوگیا، اشکوں کا سیلاب طوفانِ نوح کی یاد تازہ کر رہا تھا، خاص کر یہ بندہ جو جنت مکان سے بے حد محبت رکھتا تھا، ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

یکا یک ہمائے اقبال اوج پر آیا اور ستارۂ فرخندگی اپنا جلوہ دکھانے لگا۔ باغبانِ گلشن ایجاد کو منظور تھا کہ گلشن لکھنؤ کے برگ وبار پھر سے تر وتازہ ہوں اور دوبارہ تخت وتاج کو زینت بخشی جائے۔

اس وقت والد ماجد کی مفارقت میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے تھا اور ان کی اندوہناک ہجرت سے دردِ جگر افزوں تھا۔ چار گھڑی رات اپنا سفر ختم کر رہی تھی کہ انگریزی چپراسی جس کو بڑے صاحب نے بھیجا تھا، آیا اور کہنے لگا ’بڑے صاحب نے کہلوایا ہے کہ چھوٹے صاحب حاضر نہیں ہیں اس لیے ہالک صاحب بندگانِ عالی کی ہم رکابی کے واسطے حاضر ہیں ان کے ساتھ آپ تشریف لائیں‘۔ چنانچہ میں اسی عالم رنج وملال میں نقرئی بوچہ پر سوار ہوکر روانہ ہوگیا، وہ بھی ایک عجیب وقت تھا، تمام جان نثاران در دولت بوچہ کو گھیرے ہوئے تھے، جس وقت میں ’گلستانِ ارم‘ میں داخل ہوا، بڑے صاحب سے بات چیت ہوئی اور یہ سوال درپیش ہوا کہ والد ماجد کے انتقال کے بعد کس لقب سے یاد کیا جائے، میں نے کہا میرے جد امجد کا لقب ’فردوس منزل‘ ہے، اسی مناسبت سے انہیں ’جنت مکان‘ کہنا مناسب ہوگا۔

تخت نشینی

اس ملاقات کے بعد میں مکان کی بالائی منزل پر آیا اور نماز دوگانہ ادا کی اور مجتہد العصر والزماں نے

میرے سر پر تاج رکھا۔ اس کے بعد میں نے تخت پر جلوس فرمایا اور جس قدر اراکین و عمائدین سلطنت موجود تھے انہوں نے نذریں پیش کیں۔ ساتھ ہی سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں، میں چند لمحہ تخت پر بیٹھا رہا۔

چونکہ میں پیکرِ غم واندہ بنا ہوا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی میرے آنسو نہ تھمتے تھے، اس لیے بارہ دری کے پیچھے والے مکان میں جا کر آرام کیا، اس رات کو چونکہ معشوقوں اور پریوں کی معیت نہیں تھی، لہٰذا محمد معتمد علی خاں کے ذریعے ایک ایک انگوٹھی ہر ایک پری اور ہر ایک بیگم کی بطور نشانی منگوالی اور ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

اس کے دوسرے روز مصاحبانِ خاص اور دیگر اشخاص کو تلوار، خلعت اور معقول خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اس زمانے میں میرے استاد امین الدولہ بہادر مدارالمہام تھے اور یہ عہدہ میں علی نقی خاں کو دینا چاہتا تھا، اس وجہ سے انہیں خطاب عنایت فرمایا گیا کہ آئندہ دیکھا جائے گا۔

اس وقت میں نے جو خطابات دیئے وہ حسبِ ذیل ہیں:

غلام رضا خاں۔ رضی الدولہ، مرضی الملک، غلام رضا خاں بہادر ہزبر جنگ۔

چھوٹے خان۔ انیس الدولہ مونس الملک خانہ زاد خان بہادر۔

ثابت علی خان۔ ثابت الدولہ بہادر۔

غلام یداللہ خاں۔ قطب الدولہ مفتاح الملک مونسِ دل پذیر۔

محمد قطب علی خاں بہادر۔ قائم جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملک وسلطنتہ۔

دیگر مصاحبوں کے خطاب وہی باقی رہے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر خطاب کے آخر میں مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا لفظ لازمی تھا۔ اسی طرح شیخ غلام علی، بہارالدولہ میر اکبر علی جو اس وقت مصلح السلطان کے پیش دست ہیں اکبرالدولہ کے خطاب سے ممتاز ہوئے اور آدمیوں کو حسبِ مراتب و اہلیت خطاب دیئے گئے، خواجہ سراؤں کو بھی حسبِ تفصیلِ ذیل خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

محمد معتمد علی خان۔ دیانت الدولہ متدین الملک (دوامی)

محمد بشیر علی خان۔ بشیر الدولہ مبشر الملک (دوامی)

محمد ریحان علی خان، گلبن الدولہ بہادر الملک محمد ریحان علی خاں سرسبز جنگ۔

میرے زمانۂ ولی عہدی میں دیانت الدولہ کے توسط سے ایک اور خواجہ سرا جو حبشی نژاد تھا ملازم ہوا تھا۔ اس کو احسن الدولہ محسن الملک کا دوامی خطاب دیا گیا۔ یہ شخص بڑا لائق، فہمیدہ، علوم عربی و فاسی سے بہرہ ور اور بڑا نیک آدمی ہے۔

حاجی محمد ہلال علی خاں کو زائرالدولہ کا خطاب دیا گیا، میرے ایامِ ولی عہدی میں ایک اور حبشی نژاد خواجہ سرا نواب سلیمان محل صاحبہ کے ہاں سے آیا تھا، اس کو بھی مبارک الدولہ خورد کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

مرض الدولہ بہادر کو گھنگھور نامی پلٹن کی افسری دی گئی۔ اس پلٹن میں چار سو انگریزی سوار ہیں جن کو ترک سوار کہا جاتا ہے اور یہ پلٹن رسالہ باڈی گارڈ سے موسوم ہے۔

افسرالدولہ بہادر کو توپ خانہ نگریا اور بالک گنج کی خدمت دی گئی۔

رضی الدولہ بہادر کے برادرِ نسبتی غلام حسن خاں کو وحیدالدولہ کے خطاب دائمی سے ممتاز کیا گیا اور دو آب خانہ سلطانی کی داروغگی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

وہاج الدولہ بہادر کو سلطانی میگزین اور ثابت الدولہ بہادر کو تمامی گنجیات کی خدمت سے مفتخر کیا گیا۔

قطب الدولہ بہادر کو دفتر سلطانی کی خدمت دی گئی۔

فیروز خواجہ سرا کو فیروز الدولہ بہادر کا خطاب دے کر محلات و وثیقہ دار کی نظارت پر فائز کیا گیا۔

محلات حضور کی نظارت پر بشیر الدولہ بہادر۔

بہارالدولہ بہادر کو بھرمار پلٹن کی کمیدانی کی خدمت عطا ہوئی۔

ایک قدیم مصاحب مسمّی بھورا کو اعزاز الدولہ کا دوامی خطاب دیا گیا۔

محمد معتمد علی خاں کی خدمات از سرِ نو مقرر ہوئیں۔

گلبن الدولہ بہادر کو نجف اشرف اور مقبرۂ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم و مغفور کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

دس لاکھ روپے جنت مکان کے مقبرے کی تعمیر کے لیے خزانہ عامرہ سے غلام علی خان ابن غلام رضا خان کو جو نجیب الدولہ بہادر کے خطاب سے ممتاز ہے اور سکندری پلٹن کی کمیدانی پر مامور تھا

عنایت کیے گئے اور اس کی مددگاری کے لیے بشیر الدولہ بہادر کو بھی حکم دیا گیا۔

شیخ محمد بخش کو جو ولی عہدی کے زمانے میں داروغہ کول خانہ اور پیش دست انیس الدولہ بہادر تھا حسبِ سابق داروغگی کول خانہ کا خلعت دیا گیا اور آخر میں جدید انگریزی پلٹن کی کمیدانی پر ممتاز کیا گیا۔

جان نثار سرکار حضور ولی عہد بہادر کرنیل حاجی محمد شریف علی خاں کو مشرف الدولہ شریف الدولہ جان نثار سرکار حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ و سلطنت کرنل حاجی محمد شریف شرافت جنگ کا خطاب اور ترک سواروں کی افسری جس کا نام باڈی گارڈ ہے کا اعزاز بخشا گیا۔ ولی عہدی کے زمانے میں تمام عملہ امور داخلی انہیں کے متعلق تھا وہ بدستور رہا۔

کچھ دنوں بعد امین الدولہ زخمی ہو کر اپنی خدمت سے علیحدہ ہو گئے ان کی جگہ علی نقی خاں نے مدار الدولہ بہادر کے خطاب سے فیضیاب ہو کر وزارت کی کرسی سنبھال لی۔

بیگموں اور پریوں کا محل قرار پانا

زمانہ ولی عہدی میں تمام بیگموں، پریوں اور معشوقوں کی عادات وخصائل، ان کی وفاداری اور ان کی بے وفائی کا مجھ پر اظہار ہو چکا تھا، اب تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد ان کو بے پردہ رکھنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا میں نے یہ تجویز سوچی کہ سب کو روپے پیسے کا لالچ دے کر پردے میں بٹھایا جائے، لیکن ان میں کچھ عورتیں جو بے وفا تھیں بھاگنے کی فکر کرنے لگیں، لیکن انہیں اس کا موقع نہ ملا۔

آخر ایک روز میں نے تمام پریوں کو پردے میں بٹھا کر خطابات سے سرفراز فرمایا جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

معشوقہ خاص کو ملکہ ماہ عالم معشوقہ خاص حضرت سلطان عالم نواب سلطنت محل صاحبہ۔

شہنشاہ بیگم کو مشفقۂ جہانی حسن آرا تر چھی جان نواب شہنشاہ محل صاحبہ۔

سرفراز بیگم کو عاشقۂ خاص انجمن افروز نواب سرفراز محل صاحبہ۔

دلدار بیگم کو محبوبۂ خاص جان عاشق نما نواب دلدار محل صاحبہ۔

سردار بیگم کو شفیقۃ الزمانی بانکی جان مہ لقا نواب سردار محل صاحبہ۔

بزم افروز دلربا بیگم کو بزم افروز نواب دلربا محل صاحبہ۔

خورشید لقا امیر بیگم کو خورشید لقا نواب امیر محل صاحبہ۔

جان جہاں حور بیگم کو نواب حور محل صاحبہ۔

سلطان پری کو نواب سلطانِ جہاں محل صاحبہ۔

یاسمن پری کو نواب یاسمن محل صاحبہ۔

سکندر بیگم کو حبیبتہ السلطان مکرمتہ الزمانی نواب اسکندر محل صاحبہ۔

وزیر پری کو نواب خورشید محل صاحبہ۔

نواب معشوق محل صاحبہ کو ملکۂ ملک تاج النساء نواب معشوق محل صاحبہ۔

نواب نشاط محل صاحبہ کو مہرتن افسر النساء نواب نشاط محل، ننھی بیگم صاحبہ۔

نواب عزت محل صاحبہ کو ملکۂ پری وش نواب سلیمان محل صاحبہ۔

افتخار النساء خانم صاحبہ کو نواب حضرت محل صاحبہ۔

امراؤ خانم کو نواب امراؤ محل صاحبہ۔

فرخندہ خانم کو مبارک النساء فرخندہ خانم صاحبہ۔

عجائب پری کو عجائب خانم صاحبہ۔

بادشاہ بخش کو راحت السلطان۔

شیریں حبشن کو آرام السطان۔

ماہ رخ پری کو ماہ رخ بیگم صاحبہ۔

لیلیٰ حبشن کو مطیع السلطان۔

عنبر افشاں حبشن کو حاضر السطان۔

حیدری بیگم مرثیہ خوان جو میری ولی عہدی کے زمانے میں شیشہ پیس کر کھانے کے جرم میں محل سے نکال دی گئی تھی اور یہاں سے نکلنے کے کچھ دن بعد ہی قطب الدولہ بہادر کے ذریعے پھر میری سرکار کے آسامیوں کے زمرے میں شامل ہوئی تھی۔ سیدۃ النسا حیدری بیگم صاحبہ کے خطاب سے ممتاز ہوئی۔

شہنشاہ محل صاحبہ، دلدار محل صاحبہ، سکندر محل صاحبہ، سرفراز محل صاحبہ، سردار محل صاحبہ کو ماہانہ تین

تین ہزار روپے کی منظوری سے مشرف کیا گیا اور دوسری محلات و بیگمات کے دو دو ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئے۔ نواب خاص محل صاحبہ کو ملکۂ محذرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ کا خطاب دے کر پانچ ہزار روپے ماہانہ جاری کیے گئے، اسی طرح شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی خطاب اور ماہانہ تنخواہ سے سرفراز کیا گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد جملہ صاحبان محل اور مصاحبوں اور خواجہ سراؤں کو نوٹ کے کاغذ اور کئی کئی لاکھ روپے دے کر مفتخر کیا گیا۔

حبیتبہ السطان کو خاص کھلانے کی خدمت بخشی گئی، تھوڑا زمانہ گذرا تھا کہ مرزا فلک قدر بہادر مرتبۂ ولی عہدی پر اور مرزا کیوان قدر بہادر جرنیلی کے عہدے پر ممتاز کیے گئے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دونوں آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔

علی جان منگی والی

میری تخت نشینی کے بعد جب دو ماہ گذر گئے تو بیگموں اور پریوں کی جدائی میں جو محل کے مرتبے کو پہنچی تھیں، میں زاروقطار روتا تھا، ایک لمحے کے لیے بھی چین نصیب نہ تھا، لیکن مجبوری تھی میں کر بھی کیا سکتا تھا، بالآخر ایک ترکیب ذہن میں آئی، جس کے مطابق میں نے عمل کیا۔

دو عورتوں کا مقدمہ محکمۂ مرافعہ میں پیش تھا، ایک مدعی علیہ کا نام کرم بخش ہے جو کہ مجھ سے والہانہ عشق رکھتی ہے، یہ اس وقت سے میری کمندِ زلف میں اسیر ہے جب کہ میں ولی عہد تھا، دوسری عورت علی جان ہے، یہ عورت مجھ سے ناراض ہے لیکن جب وہ حاضر ہوگی اصل وجہ معلوم ہوگی، غرض کہ ایک روز میں نے حکم نافذ کیا کہ وہ دونوں حاضر کی جائیں، کرم بخش کی ماں امیر بخش کو بلایا اور اس کی رضامندی حاصل کر کے کرم بخش کو اپنے گھر بٹھا لیا، بہادر السلطان گلزار بیگم صاحبہ کے خطاب سے اسے ممتاز فرمایا۔ علی جان کو جب بلایا گیا تو اس مکار عورت نے دھائیں دھائیں رو کر زمین و آسمان کو دہلا دیا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے جو تو یوں روتی ہے۔ اس نے عرض کیا 'میں اسی سپاہی پر ابھی تک مرتی ہوں۔' آخر میں نے صبح دربار میں اس سپاہی کو بلایا اور اس عورت کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ دعائے خیر دیتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

مصاحبوں کو خطابات

اسی زمانے میں مصاحبان خورد یعنی نچلے درجے کے مصاحبوں کو بھی میں نے خطابات اور عہدہائے جلیلہ عنایت فرمائے۔

گھسیٹے خان کو مصاحب الدولہ بہادر کے خطاب اور عرض بیگی کی خدمت پر ممتاز فرمایا۔

محمد حسن کو مطیع الدولہ محمد حسن خاں بہادر۔

خواجہ بخش خان برادر قطب الدولہ بہادر کو رضی الدولہ بہادر۔

غلام نبی خاں رضی الدولہ بہادر کے چچا غلام نبی خان کو تحسین الدولہ غلام نبی خان بہادر کا خطاب اور کمیدانی اور رسالداری کی خدمات عطا کی گئیں۔

رضی الدولہ کے خالو کو نشاط الدولہ غلام حیدر خان بہادر کا خطاب اور اربابِ نشاط کی داروغگی کی خدمت عنایت ہوئی۔

الہیا خان کو مستقیم الدولہ بہادر کا خطاب اور پیش خانہ سلطانی خدمت مرحمت فرمائی گئی۔

نثار علی خاں اور حیدر علی خاں چونکہ خدمت سے محروم تھے، اس لیے انہیں کوئی خطاب نہیں ملا۔ لیکن میں ان کی فکر میں تھا۔

سولہ طوائفیں

اس دوران میں مجھے خفقان ہو گیا۔ محلات و بیگمات کی مفارقت جواب پردے میں بٹھادی گئی تھیں ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی، اسی لیے رفع خفقان کے خیال سے ناچنے والی چند عورتوں کو ملازم رکھا، ان سب میں بندی عمدہ والی بہت اچھی تھی۔ یہ عورت زمانۂ ولی عہدی میں دیانت الدولہ بہادر کے ذریعے جہاں نما کے مکان میں آ کر ایک دفعہ مجھ سے ملی تھی۔

وہ حسن باندی حسینی والی اور چھٹن بنّی کی بہن تھی اس طرح کل سولہ عورتیں ملازم ہوئیں، لیکن صاحبات محل جس طرح اپنے زمانۂ بیگمی میں میری دلجوئی اور دلچسپی کا خیال رکھتی تھیں وہ ان سے کہاں ممکن تھا۔

زمانۂ ولی عہدی سے میں بندی سے چونکہ تعلق خاطر رکھتا تھا، اس لیے اس کی تفریح کے لیے حضور باغ، سواری کے لیے بگھی اور پہننے کے لیے جواہرات سے اسے نوازا گیا، اگرچہ مجھے حسن

باندی اور چھٹن سے بھی دلچسپی تھی لیکن بندی سے ربط و اختلاط زیادہ تھا، اس بنا پر چھٹن اور حسن باندی بھی رہنے لگیں۔ جب ان دونوں سے ربط ضبط زیادہ پیدا کیا تو بندی حسد کی آگ میں جلنے لگی، جب میں نے محسوس کیا کہ یہ تینوں عورتیں آپس کے جلاپے کی وجہ سے مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی، تو کافی غور و تامل کے بعد چھٹن اور حسن باندی کی جانب محبت کا ہاتھ بڑھایا، مجھے معلوم تھا کہ وہ سب عورتیں آہوئے رم خوردہ کی طرح تھیں لیکن ان کی دلجوئی اور اطاعت سے میں نے انہیں زیر کرلیا۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں عورتیں میرے گھر پڑ گئیں۔ ان میں سے ایک معشوق السلطان خسرو بیگم صاحبہ اور دوسری کو ممتاز عالم عاشق السلطان نواب قیصر بیگم صاحبہ کے خطاب سے ملقب کیا اور ہر ایک کو ماہانہ دو ہزار روپے مقرر ہوئے۔

عمدہ بندی والی

خسرو بیگم اور قیصر بیگم کو گھر بٹھانے سے جب میں فارغ ہوا تو بندی کی طرف سے محبت کے پیام موصول ہونے لگے، لیکن اس کا جذبۂ رشک و حسد انتہا کو پہنچ گیا تھا، غرض کہ مصاحبوں کی سعی و سفارش کے بعد بخوشی میں نے اس کو گھر بٹھالیا اور وہ مطلوب السلطان حضرت بیگم صاحبہ کے خطاب سے ملقب ہوئی اور دو ہزار پانچ سو روپے میری سرکار سے ماہانہ تنخواہ قرار پائی۔

امراؤ بیگم

اسی زمانے میں رضی الدولہ بہادر کے ذریعے ایک زنِ کسبیہ ماہ رمضان المبارک میں پسند طبع ہمایوں ہوئی، اور اپنی ماں سمیت میرے گھر آ کر پڑی۔ حضور السلطان امراؤ بیگم صاحبہ کے خطاب سے ممتاز کیا اور ساتھ ہی دو ہزار روپے ماہانہ مقرر ہوئے، حقیقت ہے کہ یہ عورت ناچ گانے میں بے مثل تھی۔

بادشاہ بیگم

اسی زمانے میں ایک اور عورت میرے پسند طبع ہوئی اور رضی الدولہ بہادر کے حسن توسط سے آ کر میرے گھر بیٹھ گئی، محبوب السلطان بادشاہ بیگم صاحبہ کا خطاب عنایت کیا گیا۔

امتیاز بیگم

امتیاز و نامی ایک عورت مجھ پر عاشق ہوئی اور رضی الدولہ بہادر کے توسط سے میرے گھر پڑی اس کو امتیاز بیگم کا خطاب دیا گیا۔

سرفراز محل کی لاپروائیاں

سرفراز محل کو محل کا اعزاز دیئے ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ ان کے باہر آنے جانے کے راستے بند ہو گئے اور پھر میں بھی اب نئی بیگموں کی طرف راغب ہو گیا، اس اثنا میں سنا گیا کہ وہ پردے کے معاملے میں کچھ احتیاط نہیں کرتیں۔ چھتر منزل سے دریائے گومتی کا نظارہ کرتی رہتی ہیں، نواب خورد محل عمدہ محل صاحبہ نے بھی بتایا کہ سرفراز محل پردہ ہو جانے کی وجہ سے روتی دھوتی ہیں۔

جب سرفراز محل کی مجھ سے ملاقات ہوتی تو کہتی 'تمہاری جدائی میں میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمیشہ روتی ہوں' یہ سن کر میں دل میں کہتا۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں، پردے میں بٹھانے کے بعد ان کا یہ حال ہے۔ دو ایک مرتبہ تو خود میں نے اپنی آنکھ سے ان کی ناشائستہ حرکتیں ملاحظہ کیں، جب ان سے پوچھا تو صاف انکار کر دیا اور طرح طرح کی قسمیں کھائیں، وہ چاہتی تھیں کہ یا تو میں ان کے پاس ہی رہوں اور یا پھر انہیں بھی باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ مختلف طرح سے میں نے انہیں سمجھایا کہ محل میں بیٹھنے کے بعد باہر آنے میں بڑی خرابی ہے لیکن وہ میری بات مانتی ہی نہ تھیں، صرف روتی رہتی تھیں، کبھی تو کئی کئی روز کے فاقے کرتی تھیں، کبھی مجھے محل سے باہر جانے نہ دیتی تھیں اور کہتی تھیں اگر تم مجھے باہر نہ لے جاؤ گے تو میں خودکشی کر لوں گی۔ دوسری طرف نواب سلطنت محل صاحبہ نے بھی میرے سر کی قسم کھا کر کہا کہ اگر سرفراز محل کو باہر نکالا تو میں بھی بے دھڑک محل سے باہر نکل آؤں گی، اس لیے کہ وہ تو تمہارے پاس رہے اور میں نہ رہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب سلطنت محل صاحبہ کی میرے فراق کے صدمے سے ایسی بری حالت ہو گئی تھی کہ ایک سال چند ماہ کے عرصے میں کئی برس کی مریض معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں اب وہ چستی تھی نہ وہ چالاکی، نہ وہ رعنائی شباب تھی نہ وہ زیبائشِ جمال، میں اکثر ان کا حال دریافت کرتا، لیکن ان کی زبان پر جیسے تالا لگ گیا تھا، کچھ نہیں کہتی تھیں، البتہ میری مفارقت کے تاثرات ان کی صورت سے عیاں تھے۔ بہرحال مختلف بہانوں اور عذر و حیلہ سے انہیں باہر آنے کے خیال سے

دور رکھا۔

ماہ رخ کی رحلت

یہ خبر وحشت ناک میرے گوش گذار ہوئی کہ ماہ رخ بیگم کا انتقال ہوگیا، اس خبر سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ میں نے اس صدمہ جانکاہ اور دلی رنج سے بے تاب ہوکر اپنے کو بسترِ غم پر گرادیا اور آہیں بھرنے لگا، لیکن صبر کے سوائے کوئی صورت بھی نہ تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زین النسا کا سانحۂ ارتحال

ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ شہزادی جہاں آرا بیگم صاحبہ کی والدہ زین النسا خانم صاحبہ کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی۔ اس وقت شہزادی جہاں آرا بیگم صاحبہ صرف چھ ماہ کی تھیں۔ مرحومہ کو تپِ دق کا عارضہ ہوگیا تھا، مجھے بڑا رنج ہوا اور اس شیر خوار لڑکی کو میں نے اپنی والدہ صاحبہ یعنی اس کی دادی کے سپرد کیا۔ ماشاءاللہ اب تک وہ اپنی دادی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پارہی ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔

بادشاہ باغ اور سرفراز محل

ایک روز ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مطربان خوش نوا نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ اس وقت یکا یک مجھے بادشاہ باغ جانے کا خیال دامن گیر ہوا۔ بے تاب ہوکر میں نے سب محلوں کو سوار ہونے کا حکم سنایا، لیکن نواب سرفراز محل کو جانے سے منع کردیا۔ صاحبانِ محل، وزرا، امرا اور دیگر اشخاص بادشاہ باغ تک ہمرکاب ہوکر گئے اور چند روز وہاں قیام کیا۔ معلوم ہوا کہ اسی رات نواب سرفراز محل میرے فراق میں انگوٹھی سے ہیرے کا نگ نکال کر کھا گئیں، اس خبر سے میں بے چین و مضطرب ہوکر گر پڑا اور بشیر الدولہ بہادر کو بلا کر کہا 'آہ اب میرا دل اس قدر ناتوان ہوگیا ہے کہ ایسی وحشت ناک خبر سننے کا متحمل ہی نہیں۔' تمام لوگ مجھے صبر کی تلقین کرتے تھے، کبھی والدہ صاحبہ کے پاس جاکر گریہ وزاری کرتا تھا۔ بادشاہ باغ سے چھتر منزل تک چپراسیوں کی ڈاک متعین کردی تھی کہ پل پل کی خبر سے مجھے آگاہی ہوتی رہے۔ وہ تمام جلسہ عیش و مسرت صحرائی ذرّوں اور خزاں زدہ

پتوں کی طرح منتشر ہوگیا۔ آخر کار اسی رات بہ عجلت ممکنہ بادشاہ باغ سے روانہ ہوکر بادشاہ منزل پہنچا، شکر ہے کہ کوئی نامسعود واقعہ نہیں ہوا، خدا کے فضل سے سرفراز محل کو شفا ہوئی۔

وہ مجھے ہر روز اپنے ساتھ رکھنے کو مجبور کرتی تھیں، اس اثنا میں قاصد فرخندہ فال نے نواب سرفراز محل صاحبہ کے حمل قرار پانے کی خبر سنائی، میں بے حد خوش ہوا اور خدا کا شکر ادا کیا اور ان سے پہلے سے زیادہ عشق ہوگیا۔

اس روز کے بعد سے میں روزانہ ان کو ساتھ لے کر سواری میں سیر کو نکلتا تھا۔ شاید خدا کی مرضی نہ تھی، صرف پانچ ماہ بعد معلوم ہوا کہ نواب سرفراز محل صاحبہ کا حمل گر گیا ہے۔ میں نے بہت افسوس کیا اور ان کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ آخر میری دعا قبول ہوئی۔ انہوں نے بفضلِ خدا غسلِ صحت کر کے مجھ سے ملاقات کی، لیکن ہر روز نواب سلطنت محل صاحبہ اور نواب سرفراز محل صاحبہ باہر آنے پر اصرار کرتی تھیں اور پہلے کی طرح کی پریشان کن خبریں مسلسل میرے گوش گذار ہوتی تھیں، لہٰذا میں نے اپنے دل سے کہا۔ اے نادان جس بات کے لیے تو نے ان کا پردہ کروایا تھا، جب وہ ہی بات پوری نہ ہو رہی ہو تو پھر اب محل میں بٹھا کر کیا کرے گا۔ چنانچہ ایک روز میں نے ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور سمجھایا کہ 'خدا نے تم لوگوں کو یہ عزت بخشی کہ محل کے مرتبے تک پہنچی ہو، اور اب باہر جلسہ میں قیصر بیگم اور خسرو بیگم کے ساتھ جانا چاہتی ہو۔ وہ سب عورتیں میری محبت کے تیر کی گھائل ہیں جس وقت تم بھی وہاں جاؤ گی اور سب ایک جگہ ہوں گی تو آتش رشک سلگ اٹھے گی، ایسی صورت میں تمہارا کیا حال ہوگا۔'

لیکن میری اس تقریر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ کہنے لگیں کہ ہمیں سب کچھ گوارا ہے، اگر باہر عورتیں جمع ہیں تو کیا ہرج ہے اس لیے کہ ہمارے مقابلے میں دوسری معشوقائیں آپ کی منظورِ نظر نہیں ہوسکتیں۔

ظاہر میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نواب سلطنت محل صاحبہ صرف یہ دیکھنے کے لیے باہر آنا چاہتی تھیں کہ باہر اس جھمگٹے میں نئی عورتوں پر متوجہ رہتا ہوں یا پرانی عورتوں پر۔

میں دونوں کی خواہش کے مطابق ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا اور وہ اس نئے جلسہ میں شامل ہوئیں۔ اس طرح وہ محل کے رتبے سے مذلت کے گڑھے میں آ گریں۔ ملبوس حیا چاک کر دیئے۔ شرم کی نقاب الٹ دی اور زنان بازاری کے ساتھ آ کر مل گئیں، لیکن میں نے یہ سب کچھ محض ان

لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے کے خیال سے کیا۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انہیں پردے میں بٹھانے کے بعد پھر باہر لا بٹھاتا۔

جب یہ دونوں باہر آ کر جلسہ میں شریک ہوئیں تو کچھ ناز و اغماض سے کام لینا شروع کیا، جیسا کہ وہ پردے میں بیٹھنے سے قبل کرتی تھی، لیکن ان کا چراغ جلنا مشکل تھا اس لیے کہ یہاں تو بڑا بڑا عیار موجود تھا۔ بھلا نواب سرفراز محل صاحبہ ان کے مقام کو کہاں پہنچ سکتی تھیں، وہ تو بے وفائی کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ وفاداری کے تمام معزز خلعت سے ممتاز تھیں، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان لوگوں میں اب لڑائی جھگڑے کا آغاز ہو گیا اور قیصر بیگم، خسرو بیگم اور دوسری بیگموں کے غم و غصے کی آگ تیز ہو گئی۔ اس طرف سات آٹھ بیگمات تھیں اور اس طرف صرف دو تھیں، لہٰذا مقابلہ برابر کا نہ رہا، البتہ نواب سلطنت محل صاحبہ نے باہر آنے کے بعد بھی اپنی وفاداری و محبت کا ثبوت دیا، لیکن ان کی محبت میں پہلے کی طرح کشش نہ رہی اور میں محسوس کرنے لگا کہ ان میں اور مجھ میں ہزاروں میل کی دوری حائل ہو گئی ہے، آخر کار ان دونوں کو اسی حالت میں رہنے دیا اور ان کے اچھے برے کام پر کبھی کوئی اعتراض نہ کیا۔

نواب سرفراز محل صاحبہ کی حد کو پہنچی ہوئی بے وفائی دیکھ کر ایک روز میں نے کہہ دیا کہ اب میرا تمہارا نباہ ممکن نہیں، اس لیے کہ تمہاری بے پرواہیوں سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے، مناسب یہی ہے کہ تم اپنی ناشائستہ حرکتوں سے باز آؤ۔ یہ سن کر وہ رونے پیٹنے لگیں، اس کے سوائے کوئی جواب ہی نہ تھا۔ لیکن اسی صدمے سے میرا کھانا پینا حرام تھا۔ نتیجے کے طور پر ایک روز انہیں ان کی ماں کے گھر بھیج دیا اور اپنے دل میں کہا، اب اس بے وفا سے ہرگز نہ مل، لیکن دو چار دن کے بعد میں پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا، جو عورت ایک پہر بھی میری نظروں سے اوجھل نہ رہتی تھی، اب اس کا دیدار بالکل ہی نصیب نہیں تھا، آخر اپنے نازیبا عمل پر شرمندہ ہوا اور قطب الدولہ بہادر کی معرفت اسے پھر سے اپنے گھر بلانے کی کوشش کی۔

اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اب میں کسی قیمت پر بھی آنے کو تیار نہیں ہوں، اس لیے کہ میری زبردست توہین ہوئی ہے۔ اب میں عتبات عالیات کی زیارت کو جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

یہ جواب سن کر میں بے چین ہو گیا اور کہا قطب الدولہ بہادر جس طرح بن پڑے تم اسے حاضر کرو۔ میرا یہ حکم سن کر غریب قطب الدولہ بہادر دوبارہ اس کے گھر گئے اور مختلف باتیں بنا کر اس کو

میرے گھر لے آئے، لیکن میں نے اسی روز سے ترکِ ملاقات کا بھی فیصلہ کیا اور کبھی اس سے آنکھ ملا کر بات بھی نہ کی، کبھی کبھار بات چیت کا بھی موقع آتا تو طعن وطنز کے علاوہ سیدھی بات نہ کی، صرف میں ہی نہیں بلکہ اس نے بھی کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا۔

مرزا سلطان قدر کی پیدائش

اسی زمانے میں نواب محل صاحبہ کے بطن سے فرزند دل بند کے پیدا ہونے کی خبر مسرت افزا میرے گوش گذار ہوئی، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سلامی کی گیارہ ضرب توپ سر کرائی اور مجھے اس سے بڑی خوشی حاصل ہوئی، لیکن اس لڑکے کی تقدیر بری تھی اس لیے کہ اس نے صرف ایک سال کی عمر میں عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ میں اس زمانے میں بیمار تھا۔ یہ خبر سن کر کرنل رجمنڈ صاحب مع بڑے صاحب پُرسے کی رسم ادا کرنے کے لیے لکھنؤ آئے اور ازراہِ دوستی واتحاد قلبی تسلی ودلاسہ دیا، میں خود اپنی بیماری کے باعث افسردہ تھا۔ اب سلطان قدر کے انتقال کے غم نے الگ آ گھیرا، مجھے رات رات اور دن دن نہ معلوم ہوتا تھا۔

شاہزادیوں کی نسبتیں

ایک روز میں بہت اداس تھا لہٰذا اس کیفیت کو مٹانے کے لیے میں نے سوچا کہ لڑکیوں کے کارِ خیر سے فراغت پانا چاہیے۔ خدا جانے کل کو کیا واقعات رونما ہونے والے ہیں، چنانچہ حضرت والدہ صاحبہ کی رائے سے ہر ایک کی نسبت کا پیغام بھیجا۔

نواب محسن الدولہ بہادر نے اپنے پھوپا کے فرزند مرزا عالی قدر طال اللہ عمرہ سے نواب عزت محل صاحبہ کی دختر مہر آرا صغرا بیگم کی نسبت مقرر کی، اب خدا کے فضل سے اس کی عمر پانچ برس کی ہے۔

مرزا ابوالقاسم خان نے اپنے ماموں زاد بھائی سے سپہر آرا بیگم صاحبہ کی نسبت ٹھہرائی، سپہر آرا بیگم صاحبہ نواب سلیمان محل کے بطن سے ہیں۔

رکن الدولہ بہادر خلف سعادت علی خاں مرحوم کے نواسے کی نسبت جہاں آرا بیگم صاحبہ سے قرار دی گئی۔ جہاں آرا بیگم کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کی پرورش اس کی دادی

جناب عالیہ کررہی ہیں۔

مرزا فلک قدر بہادر کی نسبت اپنی بہن کی بیٹی سے قرار دی۔

یہ ساری نسبتیں 'شاہ منزل' کے مکان میں جو دریا کے کنارے واقع ہے قرار پائیں، اس کارِ خیر سے فارغ ہوکر میں بارگاہ رب العزت میں شکر بجالایا۔ اس روز سے گانے بجانے کی محفلیں، مشاعرے اور جلسے میں نے اس اہتمام سے منعقد کروائے کہ ان مجالس میں شریک ہونے والوں نے کئی سال تک اس کا لطف محسوس کیا۔

تین محلات کا امید سے ہونا

ایک وقت سنا گیا کہ نواب نشاط محل ننھی بیگم صاحبہ، نواب سکندر محل صاحب اور نئے جلسے والی امراؤ بیگم کو حمل قرار پائے ہیں، لیکن بعد میں یہ بات غلط نکلی، محض شبہ کی بنا پر ایسا سمجھا گیا تھا، اسی دوران میں میرے حکم سے نواب خورشید محل صاحبہ، نواب امیر محل صاحبہ اور عجائب خانم صاحبہ اندرونِ محل سے میرے ساتھ باہر مردانے میں آ گئیں، لیکن شرم وحجاب کو دور کرنے کے بعد خدا جانے کیا منہ میں آئی کہ دوبارہ پردے میں جا بیٹھیں، توبہ توبہ۔ اگر پردے میں جا بیٹھنا ہی تھا تو باہر نہ آنا چاہیے تھا، اگر باہر آ گئیں تو پھر پردے میں جا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عصمت وعفت کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا تھا۔

ایک روز لڑائی جھگڑے کے سلسلے میں حضرت بیگم اور نواب سلطنت محل صاحبہ نے اپنے آدمی نالش کرنے کو بڑے صاحب کی کوٹھی پر بھیجے۔ لیکن وہ عین راستے میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ کتنی نامعقول حرکت تھی کہ ایک غیر جگہ نالش ہو، سبحان اللہ دنیا کی عجیب حالت ہے۔

انہیں دنوں میں معشوقۂ خاص نے میری انگوٹھی کا گل کھانے کی خواہش کی، جب میں نے یہ بات منظور کر لی تو انجان ہوگئیں۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل انہوں نے دنیا داری سے کام لیا تھا، سلطنت کے زمانے میں کئی ایک آدمیوں کی انہوں نے سفارش کی تھی، ایک روز ایک عورت کو نذر دینے کے لیے بھی پیش کیا تھا، لیکن چونکہ وہ بدصورت تھی اس لیے میں نے اسے ناپسند کیا۔

ان بیگمات ومحلات کی بے وفائیوں کے اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں اور میرے اس درجہ

اقتدار، دولت وثروت اور صورت وسیرت اور متعدد خوبیوں کے باوجود ان لوگوں نے ایسا سلوک کیا، حالانکہ میری تعریف سے کئی کتابیں پُر ہیں۔

اسی دوران میں میں نے رعایا کہ دادخواہی کے لیے لکڑی پر چاندی کے صندوق نصب کروا کر اپنے سواروں کو دے رکھے تھے کہ جو شخص بھی اپنی درخواستیں اور عرض داشتیں ان میں ڈالے وہ سب جمع کر کے ہر روز میرے ملاحظہ میں پیش کی جائیں۔ انہیں میں ایک بند لفافہ دستیاب ہوا، جب اسے کھولا گیا تو نواب امراؤ صاحبہ اور دوسرے محلات کے متعلق عجیب عجیب واقعات تحریر تھے، چونکہ ہر روز میرا غم تازہ ہو جاتا تھا، اس لیے شاہی مشغلے میں عرضداشتیں وصول کرنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

سکندر محل سے عقد

خدا عالم الغیب ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نواب سکندر محل صاحبہ بڑی بے مثال عورت تھیں ایسی نیک عورتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔

ایک روز انہوں نے بڑے پیار سے عرض کی کہ 'جانِ عالم! خدا کی عنایت سے میری تمام آرزوئیں پوری ہوگئیں، اب صرف تم سے نکاح کرنے کی شدید آرزو ہے۔' میں گریبان میں منہ ڈال کر بیٹھ گیا اور کہا کہ کیا میں اب اس قابل ہوں کہ نکاح کروں محل کی تمام بیگمات اور بازاری لوگ کیا میرا مذاق نہ اڑائیں گے، اور کہیں گے کہ نصیرالدین حیدر بادشاہ مرحوم کی طرح میں بھی پاگل ہو رہا ہوں، لیکن وہ بضد تھیں میری بات ماننے کو تیار نہ تھیں، میں نے مجبور ہو کر یہ واقعہ جناب والدہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کیا۔ موصوفہ نے ارشاد کیا کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔

بالآخر نواب سکندر محل صاحبہ کو ایک کمرے میں بٹھا کر نکاح پڑھوایا، انہوں نے جشنِ شادی کی تیاری اور آراستگی کا معقول انتظام کیا۔ خوش آواز گانے والے گا رہے تھے، معشوقانِ سیم بر ناچ رہی تھیں، صرف یہی نہیں انہوں نے چوتھی کی تقریب کا بھی کافی اہتمام اپنے حسبِ منشا کیا تھا۔

محبوبہ عالم اور دارا بیگم

ایک عورت مغل نامی اسی زمانے میں میرے ہاں ناچنے والیوں میں آ کر نوکر ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس

سے مجھے غیر معمولی عشق ہو گیا، انتہا یہ کہ میں دیوانے کی طرح اس کے اطراف رہتا تھا، وہ چونکہ ابھی نوجوان تھی اور سرد و گرم زمانے کا اس پر ابھی کچھ اثر نہ ہوا تھا، اس لیے وہ بھی میرے کمند عشق میں گرفتار ہو کر میرے گھر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے محبوبہ عالم نواب مغل صاحبہ کے خطاب سے سرفراز کیا، میری سرکار سے میوہ خوری کے لیے ماہانہ دو ہزار روپے مقرر ہوئے۔

چند ہی روز بعد ایک کسبی عورت بھی میرے گھر بیٹھ گئی اور دارا بیگم صاحبہ کا خطاب پایا، لیکن قیصر بیگم اور خسرو بیگم کے اختلاف اور رشک و حسد کی بنا پر نکال دی گئی۔

دولت خانۂ قدیم میں اجتماع

پھر ایک بار میرا دل 'پری خانہ' کی ترتیب اور اس کی از سرِ نو تنظیم کا خواہشمند ہوا۔ پری خانہ کا وہ پرانا جلسہ برباد ہو چکا تھا، چنانچہ قدیم خواصوں کو دولت خانۂ آصفی اور پنج محلّہ میں بلایا۔ چند کو آزاد کیا اور چند ایک کا نکاح کر دیا، بعض کو کربلائے معلّیٰ جانے کی تمنا تھی، میں نے اجازت دے دی، ان میں سے دس پندرہ عورتیں جو نہایت خوبصورت اور کم عمر تھیں منتخب کر کے میں نے رکھ چھوڑیں اور انہیں رقص و سرود کی تعلیم میں مصروف کر دیا، وہ حسبِ ذیل عورتیں تھیں۔

پسند السلطان عالیہ بیگم، جو اس سے قبل مرزا نصیر الدین حیدر کی لونڈی تھی اور میں اسے پسند کر کے لایا تھا اور اسے سرفراز کر کے میں نے دوبارہ موتی محل بھیج دیا تھا، لیکن اس کے رونے دھونے سے پھر واپس بلا لیا تھا۔

حضرت والد ماجد حضرت جنت مکان کی تین لونڈیاں نیاز السلطان ناز بیگم، عشرت پری اور گوہر پری اور بادشاہ بیگم کی خواصوں کے منجملہ ایک گلزار السلطان عباسی بیگم، دوسری مصاحب پری، تیسری صاحب پری۔

ایک خواص میرے دادا حضرت فردوس منزل کی بھی تھی، جس کا فرخ بیگم خطاب تھا۔

ایک عورت جو دارا بیگم جستہ عالم نواب ہمایوں بیگم صاحبہ کے خطاب سے مخاطب تھیں۔ یہی ایک ایسی تھیں جو سب سے زیادہ عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، لیکن میں ان کی توقیر اپنے دل سے نہیں بلکہ قیصر بیگم اور خسرو بیگم اور دیگر بیگمات کی آتشِ رشک کو بھڑکانے کے لیے کرتا تھا۔

میرے دادا کی ایک خواص بھی تھی جس کا خطاب مرغوب السلطان عظیمہ بیگم صاحبہ تھا، لیکن یہ

دق میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔

شاہ بخش اور الطاف بخش جو میرے زمانہ ولی عہدی کی یادگار ہیں، ان میں سے ایک کو مطبوع السطان شاہ بیگم اور دوسری کو عنایت السلطان الطاف بیگم کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ دونوں بیگموں اور پریوں کے زمرے میں شامل ہوئیں اور ناچ گانے کی تعلیم بھی حاصل کی۔

ان کی ماہانہ تنخواہ، کسی کو ہزار روپے، کسی کو ڈیڑھ ہزار اور کسی کو پانچ سو روپے مقرر کی گئی۔

انہیں میں سے ایک مرزا نصیرالدین حیدر کی والدۂ مرحومہ نواب بادشاہ بیگم کی خواصوں میں سے پارو نام کی تھی، میرے پاس ارغوان پری کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔

شوکت بخش اور نزہت بخش میرے خواصوں میں شامل ہوئیں ہر ایک کی تعلیم موسیقی کے لیے گانے بجانے والے سات سات استاد ملازم رکھے گئے۔

ذرا غور کرنا چاہیے کہ فنِ موسیقی کے جس قدر ماہرین میری سرکار میں ملازم رہے وہ تمام کے تمام سارے شہر میں شہرت تامّہ رکھتے تھے، دن رات حصولِ فن میں مشغول رہتے تھے۔

اس فن کی تعلیم پر جن عورتوں کو لگایا گیا تھا، وہ پہلے سے تربیت یافتہ نہیں تھیں لیکن تعلیم کے بعد بعض نے تھوڑا بہت علم حاصل کیا، بعض ماہرِ فن ہوگئیں اور بعض تو موسیقی کی الف بے سے بھی واقف نہ ہوسکیں۔

ان میں مصاحب پری کو میں نے خود اپنا شاگرد بنا لیا تھا، حقیقت میں اس کی تعلیمِ موسیقی میں میں نے اسی قدر سعی و جانفشانی سے کام لیا کہ چند ہی روز میں وہ اور عورتوں کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہوگئی۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جلسہ جذبۂ عشق و ہوس کی تسکین کے لیے ترتیب نہیں دیا گیا تھا، بلکہ ایک معمولی سی دلچسپی اور ان عورتوں کی پرورش کرنا منظور تھا۔

بیگمات کا سلوک ناروا

اگرچہ قیصر بیگم اور خسرو بیگم ایک ساتھ بیگم کے درجے کو پہنچی تھیں، لیکن میری زیادہ توجہ قیصر بیگم پر تھی۔ رات دن میں پاگلوں کی طرح اس کے اطراف پھرتا تھا۔ جس جگہ وہ سوتی تھی میں بھی وہیں استراحت فرماتا تھا، وہ کھانا جہاں کھاتی میں بھی وہیں کھاتا۔ قیصر بیگم سے میری اس والہانہ محبت کو

دیکھ کر خسرو بیگم اور حضرت بیگم بہت جلتی تھیں، لیکن میں کسی کی کچھ پروانہ کرتا، اسی طرح رسمِ محبت کی ادائیگی میں ہمہ تن مشغول رہتا تھا، اس طرح قیصر بیگم کا ستارۂ اقبال مندی فلک چہارم پر ایک سال تک چمکتا رہا۔ میں نے ان کو ہزاروں روپے نقدی کے کاغذ دیئے، نیز رہنے کے لیے جلال الدولہ مرحوم کا مکان بھی ان کی نذر کیا۔ عزت و توقیر کے جملہ لوازم سے انہیں سرفراز کیا گیا، اس طرح آئے دن ان کی محبت بڑھتی ہی جاتی تھی، انہیں بیگم سے مجھے سوزاک کا مرض لاحق ہوا۔

جب تک یہ مرض خفیف سا تھا، میں ان کی اطاعت پر ہر وقت کمر بستہ رہتا تھا، لیکن ان کی عادات و خصائل معشوقۂ خاص سے ملتی جلتی تھیں۔ اوصاف میں خسرو بیگم صاحبہ کی ہم خصلت تھیں۔ وہ کبھی ہنستی تھیں تو کبھی روتی تھیں، کبھی بے اعتنائی سے کام لیتیں، کبھی بے وفائی پر آمادہ ہو جاتیں۔

حضرت بیگم نے جو پہلے سے مجھ پر جان دیتی تھیں، اس قسم کی حرکتیں دیکھیں تو ایک روز مجھ سے کہنے لگیں۔ 'اب میں تمہارے گھر میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔' میں بہتیرا سمجھایا، بہت کچھ اطمینان دلایا، لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہیں اور سواری منگوا کر اپنے مکان کی راہ لی۔ میں غم کھانے اور عالمِ حسرت و یاس میں آہیں بھرنے کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکا۔

نشاط الدولہ غلام حیدر خاں داروغہ ارباب نشاط سے میں نے تاکید کی کہ دور دور سے حضرت بیگم کی خبر رکھی جائے، اس نے میرے حکم کے مطابق عمل کیا۔

جب حضرت بیگم اپنے گھر چلی گئیں تو میرا دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی ماں کے لیے بھی ایک مصیبت تھی، اس لیے کہ میرے خاطر و لحاظ کے لیے ان کی نگرانی کرنی پڑتی تھی، چند ماہ گذرنے کے بعد میں نے دیانت الدولہ بہادر کے ذریعے انہیں مجبور کر کے اپنے گھر بلوایا۔ میں چونکہ حضرت بیگم کا عاشق تھا، اس لیے انہیں چھوڑنے کو جی نہ چاہا، ورنہ ان کی طرح کی بے شمار عورتیں موجود تھیں۔ انہیں بلوا کر چند روز تک گانے والیوں کی زمرے میں شامل رکھا، لیکن چونکہ ان کا دل میری طرف سے صاف نہیں تھا اس لیے میں بھی ان سے مکدر ہو گیا۔ پھر قیصر بیگم کی شکایت پر چند روز بعد حضرت بیگم صاحبہ کا قصور معاف فرمایا اور ان کو رتبۂ عالی پر پہنچایا۔

اسی زمانے میں مجھے لارڈ صاحب کی ملاقات کے لیے کانپور کا بھی سفر کرنا پڑا تھا۔ تمام محلات روزانہ میری مزاج پرسی کروایا کرتی تھیں، لیکن نئی بیگمات میں سے ایک بھی میری پُرسانِ حال نہ ہوئی، ان کی خاطر سے دل پھر جانے کا ایک یہ بھی سبب تھا۔ دوسرا سبب یہ کہ باوجود میری اطاعت

اور دلجوئی کے قیصر بیگم صاحبہ نے اپنی ماں کو بلا کر رکھا۔ میں نے ان کی اس خواہش کی تکمیل محض ان کی خوشنودی کے لیے کی تھی۔ لیکن ان کو میری اتنی خاطر داری کافی نہ ہوئی۔ اسی طرح کا سلوک خسرو بیگم صاحبہ بھی کرتی تھیں۔

ایک روز سرِ شام محبوبہ عالم اور حضرت بیگم کے ساتھ میں بگھی میں بیٹھا حصرت باغ کی سیر کر رہا تھا اور اس وقت حضرت بیگم میرے آغوش میں تھیں اور ان سے میں پیار و محبت کی باتیں کر رہا تھا، یہ منظر محبوبہ عالم کو سخت گراں گذرا۔ اور وہ مضطرب ہو کر بگھی کے نیچے گر گئیں۔ اگر اس روز خدا کا فضل شامل نہ ہوتا تو ان کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔

زہرہ بیگم سے عشق

ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے اور میں تمام عورتوں کو آزمانے کی جستجو میں لگا ہوا تھا اور مختلف تدابیر اختیار کر رہا تھا کہ کسی ذریعے سے بھی قیصر بیگم، خسرو بیگم اور دوسری بیگموں کی محبت و نفرت کے حالات کا انکشاف ہو، اگر چہ میں حضرت بیگم کے واقعات سے باخبر ہو چکا تھا لیکن کچھ انجان بنا رہتا تھا۔

ایک روز میں نے محض مذاق میں کہا کہ 'تم لوگ اگر اپنے اپنے گھر چلی جاؤ تو میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔' یہ کلمات سنتے ہی حضرت بیگم اور دوسری عورتیں چلی جانے پر راضی ہو گئیں۔ البتہ امراؤ بیگم جانا نہ چاہتی تھیں اس لیے کہ اس وقت وہ حاملہ تھیں، میں نے فی الفور سواریوں کا انتظام کروایا، تمام مصاحبوں وغیرہ نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن میں نے کسی کی بات نہ مانی اور تمام بیگمات جن میں محبوبہ عالم بھی تھیں جنھوں نے میری محبت میں بگھی کے نیچے آ کر خودکشی کی کوشش کی تھی اور جن کے لیے میں نے پچاس روپے تصدق کے لیے مطیع الدولہ بہادر کے ذریعے بھیجے تھے چلی گئیں اور جاتے وقت اقرار کیا تھا کہ 'تمہاری خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے ہم اپنی کہاریوں اور ملازموں کو بھیجا کریں گے۔' مختصر یہ کہ مطیع الدولہ بہادر اور مصاحب الدولہ بہادر کے ساتھ کل بیگمات اپنے گھروں کو روانہ ہوئیں اور مجھ سے اقرار کرایا کہ 'ہمارے جانے کے بعد ہماری مزاحمت کے لیے تمہارا کوئی کارندہ ہمارے گھر نہ آئے گا۔' میں نے ان کی یہ بات منظور کر لی۔

میں سمجھتا تھا کہ فی الواقع قیصر بیگم مجھ پر جان دیتی ہے اس لیے کہ اس زمانے میں اس نے طریقہ ہی کچھ ایسا اختیار کر رکھا تھا، لیکن یہ سب کچھ دھوکا تھا، ان لوگوں نے اپنے اپنے گھر جا کر جھوٹے منہ بھی مجھے نہ پوچھا۔ لیکن جب حضرت بیگم نے دیکھا کہ فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے ایک روز صبح سویرے وہ اور ان کے ساتھ گلزار بیگم اور بادشاہ بیگم روتی دھوتی رضی الدولہ کے گھر پہنچیں اور مجھ سے لپٹ کر خوب روئیں اور کہنے لگیں 'اب خواہ تم ہمارا سر ہی قلم کر دو، ہم تو تمہارا گھر چھوڑ کر نہ جائیں گے۔ میں نے انہیں گلے سے لگا لیا، لیکن مجھے اس کا ملال ضرور تھا کہ یہ اس سے قبل بھی اسی طرح اپنے گھر جا کر واپس آ گئی تھیں، اب پھر اسی فعل کا اعادہ کیا ہے لہٰذا ان کے رونے کا مجھے زیادہ بھروسہ نہ تھا۔

قیصر بیگم کے متعلق میرے خیالات متزلزل ہو گئے، اگرچہ وہ اسی روز شام کے قریب آئیں لیکن میں نے ان پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔ میں تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ وہ قیصر بیگم جو ہر روز میرے ساتھ کھانا کھاتی تھی وہ اپنے گھر میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی، لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط تھا۔

خسرو بیگم کے متعلق مطیع الدولہ بہادر نے بتایا کہ خدا جانے ان کی دادی کا پیام پہلے ہی سے ان کے پاس آیا ہوا تھا یا خود خسرو بیگم نے انہیں اپنے آنے کی اطلاع دے رکھی تھی، حالات تو بتاتے ہیں کہ خسرو بیگم ہی نے اپنے آنے کی خوش خبری کسی آدمی کے ذریعے پہنچائی تھی، چنانچہ ان کی دادی روانگی کے دو چار گھنٹے پہلے ہی سے درِ دولت پر منتظر کھڑی تھی، جب خسرو بیگم سوار ہو گئیں تو فرطِ خوشی سے میں راستہ بھر فقیروں اور شہیدوں کو کوڑیاں لگاتا رہا۔ گھر جا کر جناب مشکل کُشا کا دسترخوان کیا اور جناب عباس علیہ السلام کی نیاز کی اور اسی قسم کے چند اور رسوم خسرو بیگم کے گھر آنے کی خوشی میں ادا کیے گئے اور خسرو بیگم خود پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں کبھی کسی کے گلے سے چمٹ جاتی تھیں، کبھی بے ساختہ ہنستی تھیں۔

محبوبہ عالم کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر جا کر خوش نہ ہوئیں۔ خدا بہتر جانتا ہے، اسی قسم کی بات امتیاز بیگم کے متعلق بھی معلوم ہوئی۔

مجھے اس بات کا بے حد ملال ہے کہ ان سات آٹھ بیگمات میں سے ایک نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کر یہ نہ کہا کہ میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں گی، یہی وجہ ہے کہ اس روز سے تمام بیگمات کی طرف سے میرا دل پھر گیا اور میں نے کان پکڑے کہ آئندہ کسی کی محبت کا دم نہ بھروں گا ___ عورتوں سے میں

اس قدر بیزار ہو گیا تھا کہ اگر کوئی عورت مر جاتی تو میں یہی کہتا کہ شاید قبر میں بھی کوئی فریب کرنے گئی ہو گی۔ جب تک اس مرنے والی عورت کا چہلم نہ ہو جاتا، مجھے اس کے مرنے کا یقین نہ آتا۔

مختصر یہ کہ یہ سب بیگمات دوبارہ میرے گھر آئیں، لیکن اصولاً جنہیں پہلے آنا چاہیے تھا وہ بعد میں آئیں اور جنہیں بعد میں آنا چاہیے تھا وہ پہلے آ گئیں۔ حضرت بیگم، گلزار بیگم اور بادشاہ بیگم سب سے پہلے آئیں، حالانکہ قیصر بیگم، خسرو بیگم، امتیاز بیگم اور محبوبہ عالم کو ان سے پہلے آنا چاہیے تھا۔

اگر چہ حضرت بیگم نے عیاری سے کام لیا تھا، یعنی وہ قیصر بیگم اور خسرو بیگم سے پہلے آئیں، اس لیے میں نے ان سے تھوڑی سی محبت کا اظہار کیا اور باقی کو ظاہر داری کے تحت اور قیصر بیگم کو جلانے کے خیال سے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جس وقت قیصر بیگم، خسرو بیگم اور محبوبہ عالم آئی تھیں میں ان کی طرف ملتفت نہ ہوا، یہاں تک کہ ان کو گلے سے بھی نہ لگایا، خاموش بیٹھا رہا، خاموش بیٹھنے کا یہ مطلب تھا کہ دیکھوں حضرت بیگم، بادشاہ بیگم اور گلزار بیگم کے یہ کہنے کے بعد کہ 'اب ہم تمہارے گھر سے جانا نہیں چاہتے۔' یہ سن کر یہ کیا کہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ خسرو بیگم دوبارہ اپنے گھر جانے کی اجازت چاہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میں کسی کے گھر نہیں پڑوں گی البتہ طوائفوں کے زمرے میں ملازم ہو سکتی ہوں، اسی طرح محبوبہ عالم نے بھی کہا۔ کمال یہ ہے کہ وہ گلزار بیگم جس نے دوبارہ میرے گھر آنے میں پہل کی تھی، وہ بھی خسرو بیگم اور محبوبہ عالم کی ہم خیال تھی، البتہ حضرت بیگم اپنے وعدے پر قائم رہی۔

میں نے خود ان تینوں بیگمات کی زبان سے ان کی گفتگو سنی تھی اس لیے مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور دل سے کہا 'اے نالائق جو واقعات پیش آئے ہیں دراصل تو اس کا مستحق تھا۔' غرض ان کی بے وفائی اور کج ادائی سے زمین اور آسمان میری نظر میں تاریک ہو گئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑ کے کہا 'اچھی بات ہے تمہاری جو مرضی ہو وہی کرو۔' لیکن جب محسوس کیا کہ اب امتحان کی کسوٹی میرے ہاتھ میں ہے اور ان کو ان کی مرضی پر چھوڑ دینا دانش مندی کے خلاف ہے۔ ویسے میں نے اجازت تو دے دی، لیکن چپکے سے مصاحبوں سے کہہ دیا کہ تم انہیں سمجھا کر دیکھو، اگر کوئی عورت فقیر کے گھر پڑے یا سپاہی کے گھر، وہ بھی گھر پڑنے کے بعد گھر سے باہر نہیں جاتی، تم لوگ تو ایک بادشاہ کے گھر پڑی ہو۔

اس طرح جب انہوں نے دیکھا کہ اب اطاعت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے تو اپنا قصور معاف کرانے کے لیے میرے قدموں میں گر گئیں، چونکہ میں دوبارہ ان سے محبت کرنا بھی چاہتا تھا اس لیے راضی ہو گیا اور ان کا قصور معاف کیا۔ میری خواہش تھی کہ قیصر بیگم کو معشوقۂ خاص کی مدِ مقابل بناؤں اور ان کو ایسا مرتبہ بخشوں کہ تمام بیگمات اور محلات اور محبوباؤں کے مقابلہ یہ سبقت لے جائیں، چنانچہ میں نے محفل کی شرکت اور محلات کے جلسے میں شرکت سے بھی منع کر دیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ خود یہ اپنے دل سے ان باتوں کی پابندی کریں، لیکن انہوں نے اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا، کبھی کسی محل سے ربط وضبط بڑھاتیں، کبھی کسی سے خاص کر نواب سرفراز محل صاحبہ سے سلسلۂ ملاقات رکھتیں، وہ بھی ان دنوں باہر بیگمات میں شامل تھی' ایک روز میں نے قیصر بیگم سے کہا کہ نواب سرفراز محل صاحبہ سے جو کئی سال سے بے وفائی میں شہرت رکھتی ہیں تم نے ملاقات بڑھائی۔ جو انتہائی غلط ہے، اس سے تمہاری طرف سے بھی بدگمانی پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ دراصل نواب سرفراز محل صاحبہ جو بلا کی حاسد تھی' اس جستجو میں تھیں کہ ان کی طرح دوسری بیگمات بھی خراب و بدنام ہو جائیں، لہٰذا بڑی محبت سے انہیں اپنے پاس بٹھا کر خاطر ومدارات کرتی تھیں۔

قیصر بیگم، سرفراز بیگم کی صحبت میں بڑی دلچسپی لینے لگیں، لیکن یہ بات میرے خلافِ طبع تھی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہزادیوں کی نسبت کی تقریب میں سب محلات کے ساتھ بیگمات بھی 'شاہ منزل' میں گئی تھیں، لیکن انہیں بڑا ذلیل ہونا پڑا تھا، اس سے مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی۔ جس وقت میں کسی صاحبہ محل کے پاس جاتا تو یہ بھی میرے ساتھ ہو جاتی تھیں، میں مختلف طریقوں سے انہیں سمجھاتا اور منع کرتا۔ لیکن وہ باز نہ آئیں، میں یہ بھی کہتا رہا کہ اب میرا دل صاحبات محل کی طرف سے سیر ہو چکا ہے، صرف دنیاداری اور مصلحت ہے جو ان سے ملتا ہوں، تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں، بلکہ کیا عجب کہ تمہا ُ ٭ ٭ توہین ہو۔ اس لیے کہ میں جس محل کے پاس جاؤں گا اس کی خاطر بھی کروں گا، اس وقت تمہارا مجھے کوئی خیال نہ ہوگا، اگر یہ بات تمہیں قبول ہو تو بے شک تم میرے ساتھ چلو۔

وہ تو سب کچھ قبول کر کے جاتی تھیں، لیکن ایسی باتوں کی وجہ سے میرا دل نئے جلسے کی طرف سے بھر گیا۔

انہیں دنوں ایک اور عورت میرے گھر پڑی، جن کو زہرہ بیگم کے خطاب سے ممتاز کیا گیا، اسی

زمانے میں میں نے اپنے کان پکڑے کہ آئندہ سے ہرگز کسی عورت سے عشق نہ کروں گا۔

شدید علالت

اسی زمانے میں قیصر بیگم کے طفیل میں سوزاک کے مرض میں گرفتار ہوگیا اور آئے دن یہ مرض ترقی پر ہی رہا۔ سارے زخموں میں آگ کی سی جلن ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ محبوبوں اور گُل رخوں کے دل کو بھی ملال رہتا تھا اور پھر میں نے دل سے کہا جبکہ مجھ میں کوئی عیب ہی نہ تھا اور صحت مند و توانا تھا تو تیرا کون پُرسانِ حال تھا، جو اب پیدا ہوگا___ عجیب اتفاق ہے کہ بالکل ایسی ہی صورت پیش آئی، یعنی ایک روز محبوبہ عالم نواب مغل صاحبہ نے جب مجھے ہاتھ لگایا تو خدا کی قسم میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انہوں نے آٹے اور بیسن سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے رونا آ گیا، صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے پھر میرے قریب آ کر کہا 'خدا تم کو شفا دے، بڑا موذی مرض ہے۔ اس کے مریضوں کو لکڑی میں باندھ کر روٹی دی جاتی ہے اور اس کے جسم کو چھونا بھی بڑے نقصان کا باعث ہے، چنانچہ اسی لیے میں نے اپنے ہاتھ دھو لیے۔' یہ سن کر میں چپکا ہو رہا اور ایک الگ جگہ جا کر خوب سا رویا۔ اس دن کے بعد سے میں نے شہنشاہ منزل بند کر دی اور کسی کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔ دوسری بیگمات نے حاضر ہونے کے لیے بہت تنگ کیا، لیکن محبوبہ عالم کی حرکت کا ایسا اثر تھا کہ اب میں کسی کو سامنے نہ آنے دیتا تھا، اس بات کا میں نے کسی سے ذکر بھی نہ کیا، اس لیے کہ میں واقعی ایسے ہی خطرناک مرض کا شکار تھا۔ مرض کم ہونا تو کجا روز بروز ترقی پر تھا، رات رات بھر زخموں سے بے تاب ہو کر میں جاگتا رہتا تھا، بے چینی کے سبب سے پلک نہ لگتی تھی، کئی مرتبہ مسہل حب سلاطین کھائی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، کئی بار باسلیق کی فصد لی، پھر بھی صحت نہ ہوئی۔

یہ واقعہ ۱۲۶۵ھ کا ہے اگرچہ زخم اور دُنبل سوکھ گئے تھے اور پرہیز بھی باقاعدہ جاری تھا، لیکن تکلیف میں کوئی کمی نہ تھی، آخر خود اپنی رائے سے حضرت سید الشہداء کے چہلم کے دنوں میں نے مجلس سے فارغ ہو کر کٹی ہوئی ہڑ کھالی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے خفقان بھی ہونے لگا، آگے کیا بیان کروں عجیب حال ہو گیا تھا میرا۔ جسم کے تمام کپڑے پھاڑ ڈالے، اس کے دوسرے روز غش بھی آ گیا، میری آنکھیں بند رہیں، میرے سارے متعلقین اور وہ محلات جو نیک اور شریف تھے

رونے پیٹنے لگے۔ میں اور وہ سب رات بھر اپنے ہاتھوں پر رکھے رہتے تھے لیکن میں بالکل غافل تھا، کیا کیا مجھ پر گزری کچھ خبر نہیں۔

اس دن سے آج کے دن تک دو ماہ کا عرصہ ہوگیا، اسی طرح دُنبل نکل آتے ہیں پھر سوکھ جاتے ہیں، اسی بلا میں گرفتار ہوں، مجھے دنیا کی کچھ خبر نہیں، کبھی ہوش میں آتا ہوں تو شعروشاعری کا شغل کرتا ہوں، لیکن کچھ دیر بعد پھر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور تمام اعضائے جسم یہاں تک کہ آنکھ اور منہ بھی بید کی طرح لرزتے ہیں، اتنا بھی قرار نہیں کہ نماز پڑھ سکوں، خدا رحم کرنے والا ہے۔

واللہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ میری اسی شدید علالت کے زمانے میں اکثر محلات تماشائیوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتی تھیں اور نئے نئے کپڑے زیبِ بدن کر کے دن بھر رقص وسرود میں مشغول رہتی تھیں، اب کس کس طرح بتاؤں؟ میں نے جب لوگوں کی یہ بے مروّتی دیکھی تو باوجود اتنے شدید مرض کے رضی الدولہ کے مکان چلا گیا، تاکہ ہم مجلسوں اور معشوقوں کی چشمک زنی سے نجات ملے۔ میں بیماری کی حالت میں ہوں اور وہ انتہائی صحت مندی کے عالم میں، پھر بھی جب کبھی میں ہوش میں آتا ہوں تو سب محلات کو اپنے پاس بلا لیتا ہوں یا کبھی خود ہی زنان خانے میں چلا جاتا ہوں۔

اسی دوران میں قیصر بیگم صاحبہ کو بھی اسی مرض نے آگھیرا، ان کا جسم بھی زخموں میں بھر گیا (اصل میں انہیں کا مرض مجھے لگ گیا تھا) لیکن دو تین ماہ بعد وہ اچھی ہوگئیں، لیکن میں ہنوز بیمار ہوں۔

پھر معلوم ہوا کہ امتیاز بیگم کو بھی یہی عارضہ ہوگیا ہے، چنانچہ وہ تادمِ تحریر اس مرض کی تکلیف میں مبتلا ہیں، وہ کبھی ہوش میں آتی ہیں، کبھی ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔

حضرت بیگم صاحبہ اور محبوبہ عالم صاحبہ نے اس بیماری میں بھی اپنا ظالمانہ برتاؤ جاری رکھا اور طرح طرح کے صدمے دیتی رہتی تھیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت بیگم صاحبہ نے میرے عین شدت مرض میں مجھ سے جھگڑا کیا اور اپنے گھر چلی گئیں، اور وہاں ایک تولہ افیم کھالی۔ یہ دوسرا صدمہ تھا جو مجھے سہنا پڑا، میں مجبور ہو کر آدمیوں کے سہارے ان کے گھر گیا اور بڑی خوشامد کے بعد قے کروائی، آخر فضل الٰہی ہوا۔

زمانۂ علالت کا ایک واقعہ اور ہے کہ محبوبہ عالم اور خسرو بیگم صاحبہ تیسری مرتبہ مجھ سے چھپ کر سیر وتفریح کے لیے گاڑی میں سوار ہوگئیں، اور مجھے اطبا کے حوالے کر دیا، ایک وہ دن تھا کہ میں ان

کے بغیر کبھی سیر تماشے کا خیال بھی نہ کرتا تھا، ایک یہ دن ہے کہ مجھے علیل چھوڑ کر وہ مجھے بتائے بغیر لطف اٹھانے کے لیے چلی جاتی ہیں اور میں ہوں کہ مرض کی شدت کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

اسی دوران میں محبوبہ عالم صاحبہ نے اس شرمندی کے باعث جو مجھ سے چھپ کر سیر کو گئی تھیں اور میری ساری محبت کو یک لخت بھول گئی تھیں 'گل معرکہ' یعنی میرا 'تغمہ' اپنی بائیں ران پر کھایا، اگر چہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لیکن اس سے نفسِ معاملہ میں کیا فرق پڑتا ہے۔

ابھی تک حضرت بیگم اور محبوبہ عالم میرے ساتھ دھوکہ بازی کیے جاتی ہیں، کبھی لڑتی ہیں، کبھی سمجھوتہ کر لیتی ہیں، ایک روز نواب خاص محل صاحبہ کی موجودگی میں مجھے بڑا سخت سست کہا، لیکن میں خاموش ہو گیا، جب وہ تین روز میرے پاس رہتی تھیں تو تین روز کسی دوسری جگہ رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کُل مومنین و مومنات مسلمین و مسلمات کو دغاباز عورتوں سے محفوظ رکھے، اسی زمانے میں میں نے موسیقی کے کُل ساز و سامان سے بیزاری کا اظہار کیا، اور اب تک کبھی گانے کی آواز میرے کانوں میں نہیں پہنچی، اس بیزاری کی وجہ سے میرا سارا پری خانہ برباد ہو گیا۔ اس سے متعلق ملازمین بھی موقوف کر دیئے گئے، سارا شاہی اسباب ضائع ہو گیا 'فاعتبرو یااولی الابصار۔'

ہم ہیں اور گوشہ ہے اور عارضہ قلبی ہے

خداوندِ تعالیٰ جلد سے جلد صحت عطا فرمائے۔

مرزا فلک قدر کی رحلت

عین میری علالت کی حالت میں مرزا فلک قدر کے انتقال کی خبر وحشت اثر سنی۔ یہ فرزند میرا ولی عہد تھا اور مرضِ دق میں مبتلا تھا، آخر اسی مرض میں جہان فانی سے رخصت کی۔

میں کیا بتاؤں، مرض کی شدت سے میری کمر جھک گئی، اس حالت میں غم کا آسمان مجھ پر پھٹ کر گرا، لیکن اب صبر و شکر کے سوائے کیا بھی کیا جائے۔

نواب سکندر محل صاحبہ کی موت

تھوڑے ہی دن گذرے تھے ایک اور وحشت افزا خبر سنی گئی کہ معشوقہ باوفا نواب سکندر محل صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے، یہ میر محل تھیں اور عارضۂ دق میں مبتلا تھیں، جس وقت یہ خبر میرے گوش گذار ہوئی

اس وقت میرا دل خون بن کر آنکھوں کی راہ سے نکل آیا۔ اس وفادار دوست کا غم بھی عجیب تھا کہ بیان کرنا بھی مشکل ہے۔

آرام السطان کا سانحہ

چند روز بعد ایک اور حادثہ پیش آیا، ہر لحظہ مجھے راحت پہنچانے والی آرام السلطان اسم بامسمّٰی مرض سِل میں مبتلا ہوئی اور تین ماہ بعد انتقال کر گئی۔ اس سانحے سے میری عجیب حالت ہے، کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہوں، کبھی استغفار کرتا ہوں، خدا اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

وفادار اور بے وفا معشوق

معشوقۂ خاص ملکۂ ماہ عالم نواب سلطنت محل صاحبہ، محبوبۂ خاص جانِ جاناں، عاشق نما، نواب دلدار محل صاحبہ، حبیبۃ السلطان مکرمتہ الزمانی نواب سکندر محل صاحبہ، خورشید لقا نواب امیر محل صاحبہ، ملکہ ملک تاج النسا، نواب معشوق محل صاحبہ، نشاط محل نواب ننھی بیگم صاحبہ، خورد محل نواب عمدہ بیگم صاحبہ، نگار محل صاحبہ، سیدۃ النساء، حیدری بیگم صاحبہ، یہ سب درمیانی درجے کی وفادار عورتیں ہیں، ان کے علاوہ جو باقی رہتی ہیں وہ سب بے وفا ہیں، واللہ عالم بالصواب۔

آٹھ نئی بیگمات میں بھی کسی کو میں وفادار نہیں کہہ سکتا، میں متوقع ہوں کہ جو کوئی بھی یہ 'بے وفائی نامہ' ملاحظہ کرے گا وہ عورتوں کی محبت سے گریز کرے گا، اپنا روپیہ ان پر برباد نہ کرے گا، کیونکہ اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ ان عورتوں کو اگر حضرت یوسف بھی مل جائیں تو اپنی بے وفائی کو نہ چھوڑیں، اس لیے ان سے دور رہنا ہی مناسب ہے۔

مجھ جیسے بادشاہ صورت و سیرت میں یکتا، جس کی تعریف میں کتابیں لکھی گئی ہیں، باوجود ناز برداریوں کے کچھ خوف نہ کریں تو دوسروں کے ساتھ کیا نہ کریں گی۔

ولی عہدی کا خلعت

مرزا فلک قدر بہادر جنت آشیاں نے جب خلعت ولی عہدی کو چھوڑ کر آٹھ سال کی عمر میں بقا کی راہ لی اور مسندِ ولی عہدی خالی رہی تو ماتم داری کے بعد میں نے ان کے چھوٹے بھائی مرزا کیوان

قدر بہادر کو ولی عہدی کا خلعت اور نورِ چشم مرزا فریدوں قدر بہادر کو جو ملکہ تاج النساء، نواب معشوق محل صاحبہ کے بطن سے ہیں جرنیلی کا خلعت عنایت کیا، جس دن یہ خلعت دیئے گئے تھے وہ پندرہ ماہ شعبان یعنی امام ہمام کی پیدائش کا دن تھا، خدا مددگار رہے۔

چند عجیب واقعات

محبوبہ عالم نواب مغل صاحبہ اور مطلوب السلطان حضرت محل صاحبہ بلا وجہ رضی الدولہ کے مکان میں میرے ساتھ سکونت رکھتی تھیں اور دوسری بیگمات کی آمد و رفت بالکل موقوف تھی۔

ایک روز سب بیگمات نے اتفاق کیا اور لکڑی کا ایک زینہ لگا کر کوٹھے پر چڑھ آئیں اور دروازے اور تالے توڑ تاڑ کر بڑی مشکلوں سے میرے پاس آ گئیں، جب میں نے دیکھا کہ ان کی دل جوئی میں حضرت بیگم صاحبہ بھی میرے ہاتھ سے نکلی جاتی ہیں تو مجبوراً حضرت بیگم صاحبہ کی تواضع و مدارات کو ضروری سمجھا اور حالات سے مجبور ہو کر ان پانچوں عورتوں سے یعنی معشوق السلطان امراؤ بیگم صاحبہ، انجمن السلطان زہرہ بیگم صاحبہ اور محبوب السلطان بادشاہ بیگم صاحبہ جو تالے توڑ کر آئی تھیں، نفرت کرنی پڑی، اس لیے اب ان کی صورت بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

عاشق السلطان ممتاز عالم نواب قیصر بیگم صاحبہ میری اس شدید علالت کے باوجود ناچ گانے کی اجازت طلب کرنے لگیں۔ اسی طرح معشوقۂ خاص ملکہ ماہ عالم نواب سلطنت محل صاحبہ نے ان کے ساتھ بیٹھ کر گانا سننے کی خواہش کی، میری تندرستی کے زمانے میں ان چیزوں کی کوئی ممانعت نہ تھی، اور ان میں سے جس عورت کا بھی جی چاہتا تھا سازندوں کی سنگت میں گانے بجانے کی اجازت تھی لیکن اب جو عین بیماری کی حالت میں اس قسم کی خواہش کی تو میں نے انکار کر دیا، لیکن ان کم بختوں نے میرے انکار کے باوجود اپنا گانا بجانا جاری کر دیا۔

یہ حرکت وزیر الممالک نواب صاحب بہادر علی نقی خاں کو بہت بری لگی کہ آقا تو تکلیف میں مبتلا ہے اور یہ لوگ خوشیاں منا رہے ہیں، لہٰذا انہوں نے سخت پابندی لگا دی کہ کوئی شخص گانے بجانے والوں اور سازندوں میں سے حضور کی اجازت کے بغیر محلات اور بیگمات کے ہاں حاضر نہ ہو۔ جب اس پابندی پر سختی سے عمل کیا جانے لگا تو کئی قسم کی مشکلات آ پڑیں، یہاں تک نوبت پہنچی کہ مجھ سے ناچ گانے کی اجازت طلب کرنے لگیں، مجھے یہ بات بھی سخت ناگوار گذری، اس لیے

کہ دنیا کا قاعدہ ہے اگر عورت ہندو کے گھر پڑتی ہے تو ہندو مذہب ہی اختیار کرتی ہے اگر مسلمان کے گھر پڑتی ہے تو دینِ اسلام ہی اختیار کرتی ہے پھر کیا سبب ہے کہ میں جن امور سے روکتا ہوں اور بیمار ہوں، لیکن یہ لوگ اپنی سی کرتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عورتیں کینہ پرور ہیں، غالباً خدا سے دعا مانگ رکھی تھی کہ اگر میں بیمار پڑوں تو یہ اسی قسم کے اشغال میں مصروف ہوں۔

یہاں تک کہ قیصر بیگم صاحبہ کہنے لگیں 'مجھے تمہارے پاس رہنا منظور نہیں ہے، یا تو ہمیں رقص و سرود کی اجازت دو یا پھر اپنے گھر سے جانے کی منظوری دو۔' آخر میں نے مجبور ہو کر چلے جانے کی اجازت دے دی، لیکن خدا جانے پھر کیا سوچا کہ وہ نہیں گئیں۔

جب اس غرض کو لے کر یہ پانچوں بیگمات میری رہائش گاہ جو رضی الدولہ کے مکان کے نام سے مشہور ہے آئی تھیں، میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی، اس پر وہ کہنے لگیں 'ہم لوگوں کی خاطر و تواضع کرو، اس لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔' لیکن حضرت بیگم صاحبہ کی خواہش تھی کہ صرف ان کی خاطر داری ہو اور ان کے پاس کوئی آئے جائے نہیں، جب اس جھگڑے نے طول پکڑا اور تمام بیگمات مذکورہ مکان میں رہ پڑیں تو برابر پانچ روز تک دن رات لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں محبوبہ عالم نواب مغل صاحبہ نے کئی مرتبہ برا سا منہ بنا کر اور میرے روبرو کھڑے ہو کر کہا 'مجھے تمہاری بیماری کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔' میں نے صرف آسمان کی طرف دیکھا اور چپ ہو گیا، ایک روز دیکھا کہ میرے منع کرنے کے باوجود محبوبہ عالم تاش کھیل رہی تھیں۔ یہ فعل بھی میرے دل کو دکھانے کا باعث ہوا۔

ان لوگوں کی طرف سے فی الواقع جب جی بھر گیا تو ایک روز زبردستی تمام بیگمات کو اپنے گھر سے نکال دیا اور محل میں بھیج دیا، البتہ حضرت محل میرے ساتھ رضی الدولہ کے مکان میں رہ گئیں، جب وہ سب اس طرح نکالی گئیں تو کالے سانپ کی طرح بل کھانے لگیں، ادھر حضرت محل کہنے لگیں 'تم نے اگر مجھ سے ملنا چھوڑ دیا تو خدا کی قسم میں اپنی جان کھو بیٹھوں گی۔' بالآخر ان کے اور میرے مابین یہ طے ہوا کہ جو میری مرضی ہو وہ میں کروں اور جو ان کی مرضی ہو وہ کریں۔

ایک روز عیدالضحیٰ کے موقع پر جناب والدہ صاحبہ کے مجرے اور نذر کے لیے میں 'بادشاہ منزل' گیا، اس وقت حضرت بیگم میرے ساتھ تھیں، وہاں تمام بیگمات اور محلات کے ساتھ محفل رہی، آخر میں رات کے وقت تمام بیگمات معہ اپنے عمال کے جن کی تعداد تین چار ہزار تھی جمع ہوئیں،

اس کا مقصد یہ تھا کہ آج رات حضرت بیگم کو سب کے سامنے ذلیل کیا جائے، چنانچہ تمام راستوں ور دروازوں پر اپنے آدمیوں کو بٹھا دیا کہ آمد و رفت بند کر دی جائے۔ جب حضرت بیگم کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے خودکشی کے خیال سے ایک چھری مجھ سے چھپا کر ساتھ رکھ لی، میں پہر رات گذرنے کے بعد والدہ صاحبہ سے اجازت لے کر تانجان پر سوار ہوا، جب تانجان کو کہاریاں اٹھانے ہی والی تھیں کہ حضرت بیگم نے کہا 'اے جانِ عالم! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔' میں چونکہ حالات سے لاعلم تھا، اس لیے کہا 'بسم اللہ آ جاؤ۔' بیگم مذکور تانجان پر سوار ہو کر میرے داہنی جانب بیٹھ گئیں۔ کہاریوں نے ابھی تانجان اٹھایا ہی تھا کہ معشوق السلطان اور محبوبہ عالم جھپٹ کر آئیں اور چاہا کہ حضرت بیگم کو کوڑے مار کر تانجان سے نیچے گرا دیں، دفعتاً دو چار عورتوں نے تانجان کو اپنے گھیرے میں لے لیا، پھر محبوبہ عالم چاہتی تھیں کہ کوڑے کا تسمہ حضرت بیگم کے گلے میں ڈال کر انہیں نیچے گرائیں۔ عین اس وقت حضرت بیگم نے میان سے خنجر نکالا اور چاہا کہ اپنے سینے میں گھونپ لیں، میں نے خنجر اور ان کے سینے کے درمیان اپنا ہاتھ رکھ دیا، یہ عجیب مشکل کا وقت تھا جس کا لکھنا محال ہے۔

آخر کار ہزاروں کوششوں کے بعد جناب والدہ صاحبہ درمیان میں پڑیں اور کافی بحث و تمحیص اور سعی و کوشش کے بعد اس بات پر فیصلہ ہوا کہ میں روزانہ سات گھنٹے حضرت بیگم صاحبہ کے پاس رہوں گا اور ایک گھنٹہ ان سب بیگمات کے ساتھ گذاروں گا، چنانچہ اس وقت سے اب تک یہی عمل جاری رہا ہے، جناب والدہ صاحب کی طرف سے ایک ملازم آتا ہے میں اس کے ساتھ ان پانچوں بیگمات کے پاس جا کر ایک گھنٹہ گذار کر واپس آتا ہوں۔ لیکن حضرت بیگم صاحب کو یہ بھی گوارا نہیں اور میرا دل بھی ان بے وفاؤں سے ملنا نہیں چاہتا، لیکن آئندہ دیکھا جائے گا کیا صورت ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ حضور السلطان امراؤ بیگم صاحبہ نے ایک امام باڑہ میری بیوری سے خریدا ہے، لیکن چونکہ اس میں کچھ جھگڑا پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے مجھے اس کی خبر ہو سکی، بعد میں میں اس بات پر ان سے ناراض ہو گیا۔

جہاں آرا بیگم کا سانحہ

اسی زمانے میں ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ کو ایک غم تازہ نصیب ہوا، یعنی اس آیۂ کریمہ کے بمصداق

کل نفس ذائقتہ الموت و یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۔لختِ جگر جہاں آرا بیگم صاحبہ جو نفضہ حبشن کے بطن سے تھیں اور وہ میرے جلوس میمنت میں پیدا ہوئی تھیں تین سال کی عمر پا کر انتقال کر گئیں۔اس غم سے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور اس تیر ماتم سے دل و جگر پارہ پارہ ہو گئے۔خداوندِ تعالیٰ اس مرحومہ کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔

قطعہ تاریخ

چوں کتاب عشق نامہ شد تمام
گردشِ تصنیف خود بادولتے
گفتم اختر مصرع تاریخ آں
کردم از احوالِ نسواں فرصتے

۱۲۶۵ ہجری

پاکستان ٹیلی ویژن کی ایک اہم پیشکش

تاریخ اور آج کی دنیا

جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات اور مسائل کے بارے میں

ڈاکٹر مبارک علی

اظہارِ خیال کرتے ہیں

میزبان: ندیم عمر

ہر اتوار کو شام چھ بج کر پانچ منٹ پر ملاحظہ کریں